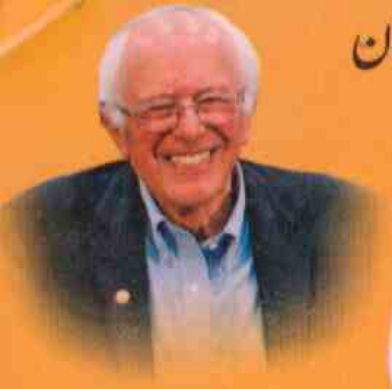

ایک قلاش... امریکا کا ہردلعزیز لیڈر کیسے بنا؟ حیرت انگیز داستان

مئی ۲۰۲۰ء

اردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

وائرسی بم سے عالمی معیشت کا دھڑن تختہ

کورونا وائرس کو خوفناک وبا بنانے کی سازش

بھارتی مسلمانوں کی بے مثال دریا دِلی

اقوام عالم نے کووِڈ 19 کا مقابلہ کیسے کیا؟

PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
Aik Rabta Apnon Sey

اُردو ڈائجسٹ

مئی 2020ء
رمضان/شوال 1441ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 5

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدرِ مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیرِ اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلسِ تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر: کاشف شہزاد
کمپوزر: رانا محمد سلیم

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری 740 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707
پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں
بیرونِ ملک ~~100~~ 80 امریکی ڈالر
اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرونِ ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

G-III,325 جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت 130 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

فہرست

مئی 2020ء

کچھ اپنی زبان میں
کڑے وقت سے نمٹنے کے ہمہ پہلو تقاضے 08

ہم کہاں کھڑے ہیں
کورونا وائرس کو خوفناک وبا بنانے کی سازش؟ 11

عالمی لیڈر
ایک قلاش... امریکا کا کیسے ہر دلعزیز لیڈر بن گیا؟ 18

دلچسپ و عجیب
تخیل کی کاریگری... تصور کی طاقت کی کارفرمائیاں 197

عالم تمام
بھارتی مسلمانوں کی دریا دلی 40
لاک ڈاؤن میں مسلمانانِ بھارت نے ہندو عوام کی مدد کر کے غیر مسلموں کے دل جیت لیے

سفرنامہ
سعودیہ سے ترکی تک... ماضی اور حال کا سفر طے کرتا ایک دلچسپ سفرنامہ 44

اخلاقیات
ہمیں اللہ سے ڈرنا ہے... عقل و فہم کی معراج پانے والا انسان معمولی وائرس کے سامنے بے بس 53

جگ بیتی
مولانا مودودیؒ کی شگفتہ مزاجی... عالم دین اور منفرد سیاسی راہنما کی بذلہ سنجی کے واقعات 57

خصوصی کہانی
آنسوؤں کے آٹھ قطرے... واقعات جنھیں وبا سے پیدا کردہ لاک ڈاؤن نے جنم دیا 70

قسط وار
زندگی، ایک بہتا دریا!... انسانی حیات اور دریاؤں کا فلسفہ بیان کرتی انمول تحریر 75

تازہ افسانہ
شکار... بدگمانی کا زہر گھولنے والی عورت کی عبرت اثر داستان 81

مزح
سرکار کا ہر فن مولا... چٹکی میں سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کرنے والے لوگ 85
رشتہ مطلوب ہے... ایک مہ جبیں کی خصوصیات جو کبھی خامیاں بھی لگتی ہیں 166

پُراسرار کہانی
تصویر کا راز... موسم گرما کی ایک دوپہر جسے وہ کبھی نہ بھول سکا 88

طب و صحت
وبا کے مریض وقت کیسے گزاریں؟ 96
دورِ ابتلا میں جسمانی و روحانی مسائل سے نمٹنے مشورے

اُردو ادب
انتقام... جب ایک حساس ڈائریکٹر کو اچانک بڑا صدمہ پہنچا 100

آپ بیتی
کار رجسٹریشن کا پُلِ صراط 105
گاڑی رجسٹر کراتے ہوئے ایسے مسائل کا سامنا ہوا کہ توبہ ہی بھلی

یادگارِ رفتگاں
دُنیائے اُردو کا درویش 112
ممتاز ماہر زبان کا ذکرِ خیر جن سے ایک عالَم نے استفادہ کیا

اُردو ادب
پانچ میل دُور... محبت کی دھیمی آگ میں سُلگتا دلآویز فسانہ 116

پاکستانیات
بانیانِ پاکستان واقعات کے آئینے میں 122
عظمتِ کردار عیاں کرتی سبق آموز یادیں

ہندی کہانی
اُکھڑے ہوئے لوگ... ایک نرالے جوڑے کی دردانگیز داستان 126

فنونِ لطیفہ
تجسّس اُبھارنے والی بہترین فلمیں 138
ناظرین کو اپنے سحر میں جکڑ لینے والی یادگار فلموں کا دلچسپ قصّہ

اُردو افسانے
فسانہ کہیں جسے 142
کاتبِ تقدیر دل کی نہاں خواہشات بھی سن لیتا ہے
سمندر 159
ایک پُراسرار ہستی کی کتھا جس تک کوئی نہ پہنچ سکا

گوشۂ عید
گاؤں کی عید 65
جب لوگ معصومیت اور سادگی سے تہوار مناتے تھے
آؤ عید منائیں 151
کورونا کے ڈر سے رب کا عطا کردہ تحفہ کیوں بھولیں

سیاسیات
صدر ایوب خان دہلی میں 170
جب وہ دیرینہ قضیے حل کرنے اچانک بھارت جا پہنچے

عالمی ادب
کاروبار بڑھانے کا انوکھا گُر
ایک شخص کی قہقہہ بار کتھا

عظیم ماں
کڑی دھوپ میں گھنا سایہ
باہمت ماں کا ولولہ انگیز ذکرِ حیات

تاریخ
جب ٹھگوں کا راج تھا
قافلوں کو لوٹ لینے والے پُراسرار گروہ کا دلچسپ تذکرہ

نفسیات
زندگی پُرلطف بنا لینے کا آسان نسخہ
چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی زندگی کا حُسن ہیں

منتخب کالم
کوٹ نانک کی مسیحا
کتابوں میں ہی نہیں بڑے آدمی زندگی میں بھی ملتے ہیں

مستقل سلسلے
تبصرہ کتب
چمنِ خیال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

سن لو بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم (یونس:62) (اے سرکشو!) کیا یہ (جنتی) وہی (نہیں) ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ نہیں عطا کرے گا انھیں اللہ اپنی رحمت سے (دیکھو انھیں تو حکم مل گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں۔ نہیں کوئی خوف تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے۔ (الاعراف:49) تمہارے دوست نہیں مگر اللہ کا رسول ﷺ اور ایمان والے کہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔ (المائدۃ:55)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے:

''جس نے میرے دوست سے دشمنی کی میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں اور میرا بندہ میری فرض کی ہوئی چیزوں کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو پناہ دیتا ہوں۔'' (صحیح بخاری شریف)

کڑے وقت سے نمٹنے کے ہمہ پہلو تقاضے

الطاف حسن قریشی

مئی کا مہینہ آن پہنچا ہے اور طبی ماہرین بار بار خبردار کر رہے ہیں کہ یہ مہینہ کرونا وائرس کے حوالے سے انتہائی سخت ہوگا۔ اس میں روزانہ کے حساب سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد اس موذی مرض کا شکار ہوکر مفلوج ہو جانے کے علاوہ موت کے منہ میں بھی جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹرز، نرسیں، ٹیکنیشنز اور خاکروب جو کرونا وائرس کی جنگ میں فرنٹ لائن پر محدود وسائل کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں اور شہادت کا درجہ بھی حاصل کر رہے ہیں، ان کے ساتھ ہماری حکومت کا رویہ حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ اس خوفناک جنگ میں ان کی رائے، ان کی فرض شناسی، بلا کی ایثار کیشی اور ان کی ماہرانہ رائے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں تین پریس کانفرنسیں کی ہیں جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اور ڈبڈباتی آنکھوں سے التجا کرتے رہے کہ یہ انجان بیماری بے حد خطرناک ہے جس کے خاتمے کے لیے سخت لاک ڈاؤن کے علاوہ احتیاطی تدابیر پر کاربند رہنا اور مجمع اور ہجوم سے مکمل اجتناب ناگزیر ہے۔ ان کے خیال میں لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے حکومت اور عوام کو غیر معمولی سنجیدگی، یکسوئی اور اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی اور دور بینی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ کورونا وائرس کے متعلق دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں جو تحقیق جاری ہے اور معیاری جریدوں میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا آنے والے عہد کی تباہ کن وباؤں کی ایک ابتدائی شکل ہے، اس لئے آج ہی میں پوری قوت کے ساتھ اس کی روک تھام پر ساری توجہ مرکوز کر دینا ہوگی، مگر دنیا میں تین ماہ کے ہلاکت خیز تجربوں اور مستقبل کے خوفناک زائچوں کے باوجود

پاکستان میں ایک بدنظمی اور بے نیازی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ اس قدر کڑی آزمائش کے مقابلہ کرنے کے لئے اربابِ حکومت ایسی ایسی ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں جن سے کنفیوژن میں تشویشناک اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اصل ہدف آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا ہے۔ چین، سنگاپور اور جنوبی کوریا میں اس جان لیوا مرض پر سخت لاک ڈاؤن اور حفاظتی تدابیر پر پوری دلجمعی سے عمل درآمد سے قابو پایا جا چکا ہے۔ امریکہ اور یورپی ممالک جن کے سربراہوں نے شروع شروع میں کرونا وائرس کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا اور ایک بے پروائی کا رویہ اختیار کیا تھا، وہاں متاثرین کی تعداد تیس لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہے اور عالمی طاقتیں بے بس دکھائی دیتی ہیں۔ ان حد درجہ عصاب شکن مناظر دیکھنے کے باوجود پاکستان نے کرونا وائرس کی مؤثر مدافعت کے لیے کوئی واضح اسٹرٹیجی اپنائی ہے نہ اسے اولین اہمیت دی ہے۔ ہمارے رہبرانِ کرام یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکے کہ لوگوں کی جانیں بچانا زیادہ ضروری ہے یا معیشت کو سنبھالا دینا۔ اسی تذبذب اور غیر یقینی کے نتیجے میں کرونا وائرس پہلے کے مقابلے میں تیز رفتاری سے پھیل رہا ہے اور عام شہری کمر توڑ مہنگائی سے بلبلا اٹھے ہیں۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے بیروزگار ہونے والے دہاڑی دار افراد کو معاشی سہارا فراہم کرنے لیے جو صنعتیں کھولی گئی ہیں، ان سے یہ تاثر قائم ہوا ہے کہ سرمایہ داروں کے سرپرستوں نے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ اربوں کے پیکیجز جو عوام کے مختلف طبقات کو دیے گئے ہیں، ان کے بارے میں عدالتِ عظمیٰ نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ان میں شفافیت پائی جاتی ہے نہ ان کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ دراصل ہر مرحلے پر قومی قیادت کا فقدان شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ برسرِ اقتدار جماعت جو بائیس برسوں تک مختلف نوعیت کی کڑی تپسیا اور مانگے تانگے کی بیساکھیوں کے سہاروں سے اقتدار میں آئی ہے، اسے اور اس کے سربراہ کو اچھی حکمرانی کے آداب معلوم ہیں نہ وہ سیاسی بصیرت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ انہیں محض تنازعات اٹھانے اور ابتلا کو دعوت دینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ جناب عمران خان نے اپنی نام نہاد سیاسی جدوجہد میں زیادہ تر غیر سیاسی طاقتوں پر انحصار کیا ہے۔ سن 2000 میں جنرل پرویز مشرف سے سحر زدہ رہے اور ان کے ریفرنڈم کی مہم تن دہی کے ساتھ چلاتے دکھائی دیے۔ پھر سن 2011 میں ایک طاقتور ایجنسی کی حمایت سے مینارِ پاکستان کے سائے تلے ایک عظیم الشان جلسہ کرنے میں کامیاب

رہے۔ اسی وقت جناب چوہدری شجاعت حسین نے آرمی چیف سے برسرِ عام شکایت کی تھی کہ ان کی جماعت کے لوگوں پر تحریک انصاف میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ سن 2014 میں عمران خان انتخابات میں دھاندلی کا بہانہ بنا کر اسلام آباد پر چڑھ دوڑے۔ جناب جہانگیر ترین خان جو اسلام آباد کے محاصرے میں کمک فراہم کرتے رہے، اب انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ 2013 کے انتخابات میں کوئی دھاندلی نہیں ہوئی تھی۔ جناب عمران خان جو بلند آواز میں اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ اقتدار میں آ کر دس بارہ ارکان پر کابینہ تشکیل دیں گے، وہ ماشاءاللہ پچاس ارکان پر مشتمل ہے جن میں 18 غیر منتخب افراد بھی شامل ہیں۔ ایک طرف لحظہ بہ لحظہ نہایت کڑے وقت کا سامنا ہے اور دوسری طرف حکومت یکسوئی، قومی یکجہتی، دور بینی اور مستقل مزاجی کے اوصاف سے محروم نظر آتی ہے۔ اس نے پوری توجہ کرونا وائرس کی بیخ کنی پر مرکوز کرنے کے بجائے 18 ویں آئینی ترمیم اور نیشنل فائنینشل کمیشن ایوارڈ کو ختم کرنے یا اس میں غیر معمولی ردوبدل کرنے کا شوشہ چھوڑ دیا ہے جو شدید سیاسی محاذ آرائی کی زہر آلود فضا میں بدترین آئینی اور سیاسی بحران کو جنم دے سکتا ہے۔ یہ وقت قومی اتفاق رائے پیدا کرنے اور دلوں کو مسخر کرنے کا ہے۔ طبی ماہرین اور عملے کی ضرورتیں پوری کرنے، ان کے مشاہروں میں خاطر خواہ اضافوں اور ان کو فیصلوں میں شامل کرنے کا وقت ہے۔ یہ وائرس سے متاثرین کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے اور شہدا کو قومی اعزازات عطا کرنے کا وقت ہے۔ یہ نفس کے اندر پرورش پانے والے انا کے وائرس پر قابو پانے کا وقت ہے۔ یہ سیاسی مکالمے کی تہذیب کو فروغ دینے اور پارلیمان کو اقتدار کا حقیقی منبع کی حیثیت دینے کا وقت ہے۔ یہ اجتماعی بصیرت کو بروئے کار لانے اور باہمی احترام کی روایات کو مستحکم کرنے کا وقت ہے۔ بدقسمتی سے اب تک ہمارے ناخداؤں نے جو طور طریقے اختیار کیے ہیں تو بے اختیار حضرت غالب آتے ہیں۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں؟ دیکھیے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نے پا ہے رکاب میں

الطاف حسن قریشیؒ

ہم جیسا سمجھتے ہیں، کبھی کبھی ویسا ہوتا نہیں

کورونا وائرس کو خوفناک وبا بنانے کی سازش

دو امریکی ڈاکٹروں کا چشم کشا دعویٰ ہے کہ امریکی و یورپی حکومتوں نے بڑی عیاری سے
ایک عام وائرس کو دہشت کی علامت بنا دیا تاکہ گریٹ گیم کھیل کر
اپنے مذموم مقاصد حاصل کیے جا سکیں

طیب اعجاز قریشی

بیکرز فیلڈ امریکا کی امیر ترین ریاست کیلیفورنیا کا آٹھواں بڑا شہر ہے۔ یہ کیرن نامی کاؤنٹی (تحصیل) کا صدر مقام بھی ہے۔ شہر میں پونے چار لاکھ لوگ بستے ہیں۔ تحصیل کی آبادی ساڑھے آٹھ لاکھ ہے۔ بیکرز فیلڈ میں ڈاکٹر ڈینئل ایرکسن اور ڈاکٹر آرٹن میشی ایک بڑا نجی اسپتال، ایسلریٹیڈ ارجنٹ کیئر نامی چلاتے ہیں۔ اس اسپتال کی خاصیت یہ ہے کہ یہ کیرن کاؤنٹی میں نئے کورونا وائرس، سارس کوو2 سے پھیلی عالمگیر وبا، کوویڈ19 کے ٹیسٹ کرنے والا واحد نجی طبی مرکز ہے۔

پچیس اپریل تک کیرن کاؤنٹی میں کوویڈ 19 کے دس ہزار ٹیسٹ کیے گئے تھے۔ ان میں سے چھ ہزار دونوں ڈاکٹروں کے نجی اسپتال ہی میں انجام پائے۔ اسی دن ڈاکٹر ایرکسن اور ڈاکٹر آرٹن نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ جس نے جلد ہی پورے امریکا میں تہلکہ مچا دیا۔ وجہ یہ کہ ڈاکٹر اس میں تصویر کا دوسرا رخ سامنے لے کر آئے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

ڈاکٹر ایرکسن و آرٹن نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ نیا کورونا وائرس بھی فلو (انفلوئنزہ) کے وائرسوں سے ملتا جلتا ہے۔ درست کہ یہ ایک سے دوسرے انسانوں کو بہ سرعت منتقل ہوتا ہے۔ مگر یہ اتنا زیادہ خطرناک نہیں جتنا کہ اُسے بنا دیا گیا۔ پوری دنیا میں سارس کوو2 کو دہشت کی علامت بنا دینے میں امریکی و یورپی حکومتوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔

آگے بڑھنے سے قبل فلو کے وائرسوں کا تعارف ہو جائے۔ فلو قدیم چھوتی مرض ہے۔ مؤرخین کے مطابق اس نے آٹھ ہزار سال قبل چین میں بڑی آبادی کو متاثر کیا تھا۔ تب سے یہ وقتاً فوقتاً دنیا بھر میں ''وبا'' اور ''عالمگیر وبا'' پیدا کر رہا ہے۔ فلو وائرس کی کئی اقسام ہیں۔ ان میں سے تین وائرس...... اے، بی اور سی انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ بھی سارس کوو2 کی طرح انسان میں بخار، گلے میں درد، عضلات میں تکلیف، کھانسی، تھکن، سر درد وغیرہ کی علامات پیدا کرتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ ایک مخصوص علاقے میں کسی چھوتی بیماری سے کثیر تعداد میں لوگ متاثر ہوں تو اسے ''وبا'' (Epidemic) کہتے ہیں۔ جبکہ کوئی چھوتی بیماری دنیا کے بڑے حصے کو لپیٹ میں لے ڈالے تب وہ ''عالمگیر وبا'' (Pandemic) بن جاتی ہے۔ امریکا کی امداد پر پلنے والا عالمی ادارہ صحت (WHO) کوویڈ19 کو بھی عالمگیر وبا قرار دے چکا۔

عام لوگ نہیں جانتے کہ فلو وائرس کی مختلف اقسام ہر سال دنیا بھر میں ''تیس سے پچاس لاکھ'' انسانوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کی تیار کردہ رپورٹوں میں درج ہے کہ نشانہ بنے مریضوں میں سے ہر سال ''ساڑھے چھے لاکھ'' مرد و زن چل بستے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو کوویڈ19 ابھی فلو وائرسوں سے پھیلی وبا کے مانند نہیں ہوئی مگر اپنے مفادات کی خاطر اُسے بنا دیا گیا۔

☆☆

اب آیئے اس سنسنی خیز انکشاف کی طرف جو ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن نے اپنی پریس کانفرنس میں کیا۔ ان کا دعویٰ ہے، امریکی حکومت نے ملک بھر کے اسپتالوں کو ہدایت دی تھی کہ فلو، کھانسی اور نزلے بخار کے مریضوں کو بھی کاغذات میں کوویڈ19 کا شکار بنا دکھایا جائے۔ یہ چونکا دینے والا انکشاف ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ٹرمپ حکومت دنیا والوں کو دھوکا دے رہی ہے۔ آخر کیوں؟

آپ جانتے ہوں گے، یہ امر اب تک سربستہ راز ہے کہ سارس کوو20 نے کیونکر جنم لیا۔ کئی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ اس کو چین یا امریکا کی کسی حیاتیاتی لیبارٹری میں بنایا گیا۔ دیگر سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ چمگادڑ سے کسی دوسرے جانور میں منتقل ہوا اور پھر اسے انسان کے جسم میں داخل کر دیا۔ یہ پراسرار نیا کورونا وائرس بہرحال ایک سچائی ہے۔ بن کر دنیا میں پھیل چکا۔

ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن کا مگر دعویٰ ہے کہ امریکا اور یورپ میں خصوصاً فلو اور امراض سینہ سے مرنے والے انسانوں کو بھی جان بوجھ کر کوویڈ19 سے متاثرہ دکھایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ وبا کو دہشت اور خوف کی علامت بنا دیا جائے۔ یہ مقصد پا کر امریکی و یورپی حکومتیں ملک گیر لاک ڈاؤن کرنا چاہتی تھیں۔ سوال مگر یہ کہ امریکا اور اس کے ہمنوا یورپی ممالک برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، کینیڈا وغیرہ کے لاک ڈاؤن سے کیا مفادات وابستہ تھے؟

ہم کوویڈ19 سے قبل کے حالات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے امریکا اور چین کے مابین زبردست تجارتی و معاشی جنگ چل رہی تھی۔ اس جنگ نے عالمی معیشت پر بھی منفی اثرات مرتب کیے۔ تاہم چین کو تجارتی جنگ سے زیادہ نقصان نہ پہنچ سکا۔ اسی دوران چینی کمپنی، ہوواے نے 5-جی ٹیکنالوجی کی آمد کا اعلان کر دیا۔ آج کی کاروباری و تجارتی و صنعتی دنیا انٹرنیٹ پر بہت حد تک

ڈاکٹر ایرکسن اور ڈاکٹر آرٹن

انحصار کرنے لگی ہے۔ اگر دنیا میں چین ساختہ 5-جی ٹیکنالوجی سکہ رائج الوقت بن جاتی تو یقیناً چینی حکومت کو معاشی و سیاسی طور پر بہت فائدہ ہوتا۔ اسی لیے امریکا کے زبردست دباؤ پر بعض یورپی ممالک نے چینی کمپنی، ہوواے سے 5-جی ٹیکنالوجی لینے سے انکار کر دیا۔

چین اور امریکا کی تجارتی جنگ کے دوران ہی یہ بات سامنے آئی کہ چینی حکومت وسیع پیمانے پر سونا خرید رہی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ عنقریب چینی کرنسی کو عالمی کرنسی کے طور پر متعارف کرا دیا جائے۔ چینی حکمران یوں عالمی معیشت و مالیات میں امریکی کرنسی، ڈالر کی اجارہ داری کو کاری ضرب لگانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھیں روس کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے، چینی شہر ووہان میں اچانک نیا کورونا وائرس نمودار ہو گیا۔

نئے وائرس نے تیزی سے پھیل کر ووہان میں ہزارہا چینیوں کو بیمار کر ڈالا۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ شہریوں میں وائرس سے مدافعتی قوت موجود نہ تھی۔ یہی ماجرا بعدازاں دیگر ممالک میں بھی دیکھنے کو ملا۔ جب چینی حکومت کو احساس ہوا کہ یہ ایک وبا ہے تو اس نے کئی علاقے سیل کر دیے اور وہاں کاروباری و صنعتی سرگرمیاں روک دیں۔ اس سے چینی معیشت کو اربوں ڈالر کا نقصان ضرور ہوا مگر فائدہ یہ پہنچا کہ کوویڈ19 پورے چین میں نہیں پھیل سکی۔ اوائل اپریل 2020ء تک چین نے وبا پر قابو پا لیا۔

14 جنوری کو چین سے باہر تھائی لینڈ میں سارس کوو20 سے متاثر پہلا مریض دریافت ہوا۔ جلد ہی دیگر ممالک میں بھی اس چھوتی وائرس کے شکار مریض سامنے آنے لگے۔ لیکن حیرت کی بات یہ کہ چین کے پڑوسی ملک نہیں دور دراز واقع یورپی ممالک کوویڈ19 سے زیادہ متاثر ہوئے جسے ماہ مارچ میں ''عالمگیر وبا'' قرار دے دیا گیا۔

مثال کے طور پر ہانگ کانگ چین کا ہمسایہ ملک ہے۔ تاحال وہاں ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہی کیس سامنے آئے ہیں جبکہ اموات کی تعداد 4 رہی۔ اسی طرح منگولیا میں صرف ''38'' کیس سامنے آئے اور کوئی انسان ''عالمگیر وبا'' سے نہیں مرا۔ جنوبی کوریا جیسے گنجان آباد ملک میں صرف ساڑھے دس ہزار کیس ملے اور ''246'' اموات ہوئیں۔ البتہ روس میں تقریباً ایک لاکھ کیس دریافت ہوئے۔ تاہم وہاں بھی صرف ''972'' لوگ ہی کوویڈ19 کے باعث چل بسے۔

دوسری طرف امریکا اور یورپی ممالک کے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں۔ تادم تحریر امریکا میں ساڑھے دس لاکھ، اسپین میں دو لاکھ پینتیس ہزار، اٹلی میں دو لاکھ پانچ ہزار، فرانس میں ایک لاکھ پینسٹھ ہزار اور برطانیہ میں ایک لاکھ اکسٹھ ہزار لوگ کوویڈ19 کا نشانہ بن چکے۔ امریکا میں ساٹھ ہزار، اٹلی میں ستائیس ہزار، اسپین میں چوبیس ہزار، فرانس میں تئیس ہزار اور برطانیہ میں اکیس ہزار اس ''عالمگیر وبا'' کی بدولت لقمہ اجل بن گئے۔

☆☆

امریکا اور یورپی ممالک میں سارس کو وڈ 2 کے کیسوں کی تعداد کیوں زیادہ ہے، اس کا بھانڈا ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن نے پھوڑ دیا ہے۔ وجہ یہی کہ امریکا اور یورپی ممالک میں فلو اور امراض سینہ کے مریضوں کو بھی کووڈ 19 کا شکار بتایا جارہا ہے؟ لیکن ایسا کیوں کیا گیا؟

اس لیے کہ نئی وبا کو زیادہ سے زیادہ خطرناک دکھایا جائے۔ یوں چین اور چینی قوم کو دنیا بھر میں بدنام کرنا مقصود تھا۔ یاد رہے، نیا کورونا وائرس آتے ہی امریکی و یورپی میڈیا نے چین کے خلاف شرانگیز اور زہریلی پروپیگنڈا مہم شروع کردی تھی۔ اخبارات نے چینی قوم کی تضحیک کرنے اور مذاق اڑانے والے کارٹون شائع کیے۔ حتیٰ کہ صدر ٹرمپ نے کورونا وائرس کو ''چائنیز وائرس'' قرار دے ڈالا۔ اس سارے پروپیگنڈے کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے تمام ملکوں میں چینیوں سے نفرت پیدا کی جاسکے۔ انھی کو کووڈ 19 پھیلانے کا مجرم بنا دیا جائے۔ اسی لیے بعض یورپی شہروں میں چینیوں پر حملوں کی خبریں بھی آئیں۔ ٹرمپ تو اب بھی وقفے وقفے سے چین پر زبانی حملے کررہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صدارتی الیکشن میں انھیں ہرانے کی خاطر چینی حکومت نے کورونا وائرس چھوڑ دیا۔

☆☆

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ترکی، چین، روس اور ایران میں سارس 20 کے لاکھوں کیس کیسے سامنے آگئے؟ غور و فکر سے افشا ہوتا ہے کہ یہ چاروں ممالک انسانیت پر امریکا و یورپ کے تھوپے عالمی معاشی و سیاسی نظام کے مخالف ہیں۔ وہ دنیا سے امریکا و یورپ کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی سچائی یہ پہلو سامنے لاتی ہے کہ ممکن ہے، ان ممالک کی معیشت تباہ کرنے کے لیے کورونا وائرس پھیلایا گیا۔ حتیٰ کہ ان مخالفین کی معیشتیں تباہ کرنے کی خاطر امریکا و یورپی ممالک نے اپنے ہاں بھی لاک ڈاؤن متعارف کرادیے۔ مقصد یہی تھا کہ درج بالا چاروں ملکوں کی معیشت کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔ اسی لیے اپنی معیشتوں کو بھی پہنچنے والا عارضی نقصان برداشت کرلیا گیا۔ ''گریٹ گیم'' کھیلتے ہوئے اس قسم کی چالیں چلنا انہونی بات نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ انکشاف بھی کیا کہ ماسک پہننا نہ پہننے سے زیادہ خطرناک ہے۔ وجہ یہ کہ عام لوگ ماسک پہننے کا طریقہ نہیں جانتے۔ وہ اکثر بیشتر اُسے ہاتھ لگاتے رہتے ہیں۔ تب بہت سے جراثیم اور وائرس ماسک سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ آسانی سے منہ یا ناک کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ صرف آپریشن کرتے ہوئے ماسک پہنتے ہیں۔ تب آپریشن تھیٹر میں بڑا ''کنٹرولڈ ماحول'' ہوتا ہے اور وہاں کوئی بھی خطرناک جرثومہ یا وائرس زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن عام صورت حال میں وہ کبھی ماسک نہیں پہنتے۔

امریکی ڈاکٹروں نے تیسرا انکشاف یہ کیا کہ شہریوں کو گھروں میں قید کرکے ان کا مدافعتی نظام (Immune System) کمزور کردیا گیا۔ دراصل کہ جب انسان قدرتی ماحول میں رہتا بستا ہے تو اُسے نت نئے جراثیم اور وائرسوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ تب انسانی مدافعتی نظام کے خلیے اور ضد جسم (Antibody) ان سے لڑ بھڑ کر اپنے آپ کو طاقتور بنا لیتے ہیں۔ لیکن جو انسان قدرتی ماحول سے دور رہے، تو خود بخود اس کا مدافعتی نظام کمزور ہونے لگتا ہے۔

امریکا میں لاک ڈاؤن کے خلاف احتجاج

ڈاکٹروں نے اسی لیے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ جب بھی لاک ڈاؤن ختم ہونے پر دنیا بھر کے لوگ باہر آئے، تو سارس کو وڈ 2 ہی نہیں دیگر چھوتی بیماریوں کے وائرس اور جراثیم اُن پر دھاوا بول سکتے ہیں۔ چونکہ کئی ہفتے قدرتی ماحول سے دور رہنے کی وجہ سے لوگوں کا مدافعتی نظام کمزور ہوگا لہٰذا وہ نت نئی بیماریوں کے شکار ہوجائیں گے۔

امریکی ڈاکٹروں نے کووڈ 19 کے جو ٹیسٹ کیے، ان کے نتائج سے یہ حساب لگایا کہ ریاست کیلیفورنیا میں آباد ساڑھے چار کروڑ لوگوں میں سے پچاس لاکھ سارس کو وڈ 2 کا شانہ بن چکے۔ 25 اپریل تک ریاست میں کووڈ 19 سے بارہ سو لوگ جاں بحق ہوئے تھے۔ لہٰذا مریضوں میں موت کی شرح ''0.03 فیصد'' برآمد ہوئی۔ ڈاکٹروں نے تبھی اپنی قوم کو اس حیرت انگیز سچائی سے مطلع کیا کہ موسمیاتی فلو سے بھی ہر سال ریاست کیلیفورنیا میں اتنے ہی لوگ مرتے ہیں۔ کورونا وائرس محض فلو وائرسوں کی نئی قسم ہے۔ لیکن عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے پشتی بانوں نے مذموم مفادات کی تکمیل کے لیے اُسے دہشت ناک وائرس بنا دیا۔

یہ تمام حقائق پیش کرکے ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن نے ٹرمپ حکومت سے مطالبہ کیا کہ امریکا سے فی الفور لاک ڈاؤن ختم کیا جائے۔ اس کی وجہ سے عام لوگوں کے کاروبار تباہ ہوگئے۔ متوسط اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لاکھوں امریکی اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گویا وہ حکمرانوں کے مفاداتی کھیل کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جبکہ گھروں میں مقید رہنے سے ازدواجی جھگڑوں میں بھی اضافہ ہوا اور نفسیاتی مسائل بڑھ گئے۔

امریکی ڈاکٹروں نے اپنی پریس کانفرنس کی وڈیو یوٹیوب پر اپ لوڈ کردی تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں لاکھوں لوگوں نے اُسے دیکھ لیا اور وہ کووڈ 19 کے دوسرے رخ سے آگاہ ہوئے۔ اس وڈیو نے خصوصاً امریکی معاشرے میں ہلچل مچادی۔ بہت سے امریکی ٹرمپ حکومت سے لاک ڈاؤن ختم کرنے کا مطالبہ کرنے لگے تاکہ معمولات زندگی بحال ہوسکیں۔ وہ کسی قسم کی گریٹ گیم کا حصہ بن کر اپنی معاشی و معاشرتی زندگی تباہ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

جب امریکی ڈاکٹروں کے نقطہ نظر کا امریکا میں غلغلہ بلند ہوا تو امریکی اسٹیبلشمنٹ حرکت میں آگئی۔ اس کے حکم پر گوگل کمپنی نے یوٹیوب سے ڈاکٹروں کی وڈیو ہٹادی۔ یہی نہیں، سرکاری ڈاکٹروں نے ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ انھیں جعلی ڈاکٹر اور دھوکے باز قرار دیا گیا۔ لیکن لاکھوں عام امریکیوں کی نظر میں دونوں ڈاکٹر بہادر اور دلیر ہیرو بن گئے جنھوں نے طاقتور اسٹیبلشمنٹ کی مکروہ اصلیت کا پردہ چاک کردیا۔ امریکی حکومت کی کارگزاری سے عیاں ہے کہ وہ بھی

آمرانہ حکومتوں کے مانند نا قدین کا گلا گھونٹ دینے کی پالیسی پر کاربند ہو چکی۔ یہ آزادی رائے پر بڑا حملہ ہے۔

دو امریکی ڈاکٹروں کی دلیری کے باعث اب امریکا میں لاک ڈاؤن ختم کرنے یا نہ کرنے کی ''ہائی پروفائل'' بحث چل نکلی۔ مشہور امریکی کاروباری، ایلن مسک نے ڈاکٹروں کی جرات کو سراہا اور ٹرمپ حکومت سے مطالبہ کیا کہ لاک ڈاؤن ختم کر دیا جائے کیونکہ اب وہ امریکی معیشت کا دھڑن تختہ کر سکتا ہے۔ تاہم گوگل اور فیس بک کے مالکان، لیری پیج اور مارک زکر برگ لاک ڈاؤن جاری رکھنے کے حامی نہیں تھے۔

☆☆

پریس کانفرنس میں ڈاکٹروں نے سویڈش حکومت کو سراہا جس نے اپنے ملک میں لاک ڈاؤن نہیں لگایا اور معمولات زندگی کسی حد تک جاری رکھے دیے۔ البتہ وہاں ہائی اسکول اور یونیورسٹیاں بند ہیں۔ نیز عوامی مقامات پر ''معاشرتی دوری'' کا اصول لاگو کر دیا گیا۔ لیکن پرائمری اور چھوٹے بچوں کے اسکول کھلے رکھے گئے۔

سویڈن کی آبادی تقریباً ایک کروڑ ہے۔ وہاں اب تک صرف بیس ہزار افراد کو وید 19 کا نشانہ بنے ہیں۔ ہر ملک کی طرح سویڈن میں بھی زیادہ تر بوڑھے مرد و زن ہی کورونا وائرس سے موت کے منہ میں گئے۔ یہ وائرس مگر نوجوانوں اور بچوں کو زیاہ نقصان نہیں پہنچا سکا۔

اسکینڈے نیوین ملک، سویڈن کی مثال سے عیاں ہے کہ اس نے امریکی و برطانوی منصوبے پہ کلی طور پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ ممکن ہے، سویڈش حکومت نے بھی فلو اور امراض سینہ کے مریض کو وید 19 کے کھاتے میں ڈالے ہوں مگر اس نے مملکت میں مکمل لاک ڈاؤن کرنے سے انکار کر دیا۔

سویڈن میں دراصل عوام اپنے حکمرانوں اور سرکاری اداروں پر اعتماد رکھتے ہیں۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ حکومت نے جو بھی فیصلہ کیا، اس میں عوام کی بہتری مضمر ہو گی۔ عوام کا اعتماد پا کر ہی ماضی میں بھی سویڈش حکومتیں دلیرانہ فیصلے کرتی رہی ہیں۔ مثلاً مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین کے معاملے میں سویڈن نے اکثر پاکستان اور فلسطینیوں کا ساتھ دیا ہے۔ نیز سویڈش حکومت وقتاً فوقتاً اسرائیل اور بھارت کو تنقید کا نشانہ بناتی ہے۔ اسی لیے اس بار سویڈن نے امریکی ایجنڈے پر مکمل طور پر عمل نہیں کیا۔ یوں اس نے اپنی معیشت اور معاشرتی زندگی کو تباہی سے بچا لیا۔

یہ یاد رہے کہ عالمی معاشی نظام کی سب سے بڑی کرنسی امریکی ڈالر ہے۔ اسی لیے امریکا چاہے کئی ٹریلین ڈالر کا مقروض ہو جائے، وہ زیادہ سے زیادہ ڈالر چھاپ کر اپنے آپ کو دیوالیہ ہونے سے بچا لے گا۔ یہی حقیقت مدنظر رکھ کر وہ اپنے دشمنوں کو بھی کاری ضرب لگا سکتا ہے۔ کووید 19 کے بطن سے پھوٹنے والے حالات اور واقعات گواہی دیتے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اب ڈاکٹر ایرکسن اور آرٹن تو گھر کے بھیدی بن گئے اور انھوں نے بہت سے خفیہ راز فاش کر دیے۔

امریکی و یورپی طاقتوں نے اس ہوشیاری و عیاری سے اپنا کھیل کھیلا کہ پاکستان سمیت کئی ترقی پذیر ممالک نے مکمل لاک ڈاؤن کے ذریعے اپنے ہاتھوں قومی معیشت کو نقصان پہنچا دیا۔ حالانکہ پاکستان میں فلو وائرس کبھی متحرک نہیں رہے اور ہر سال چند ہزار لوگوں کو ہی نشانہ بناتے ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ ہی موت کا شکار ہوتے ہیں۔ مگر امریکی و یورپی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر پاکستانی حکومت نے بھی ملک بھر میں خاصا سخت لاک ڈاؤن نافذ کر دیا۔ یوں رہی سہی کاروباری و صنعتی سرگرمیاں بھی

جام ہو گئیں۔ نیز ہزار ہا لوگ اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

حکومت پاکستان کو امریکی ڈاکٹروں کے پیش کردہ حقائق کا بغور جائزہ لینا چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اغیار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کرہم اندھے کنوئیں میں جا گریں۔ اس عظیم تباہی سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ جلد از جلد مرحلہ وار پاکستان بھر سے لاک ڈاؤن ختم کر دیا جائے۔ سارس کو وید 2 ہمارے وطن کو جتنا نقصان پہنچا سکتا تھا، وہ انجام دے چکا۔ اب لاک ڈاؤن سے چھٹکارا پانے کا وقت آ پہنچا ہے تاکہ ملکی ترقی و خوشحالی کا سفر دوبارہ شروع ہو سکے۔

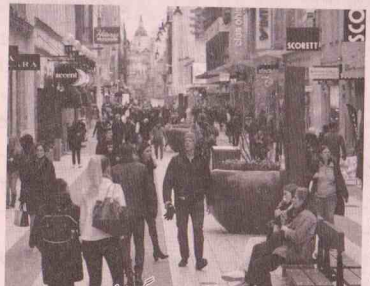

سویڈن میں معمولات زندگی جاری ہے

☆☆

پریس کانفرنس میں ڈاکٹر ایرکسن و آرٹن نے کووید 19 پھیلنے سے روکنے کے لیے ایک طریق کار بھی پیش کیا۔ یہ طبی اصطلاح میں ''گروہی مدافعت'' (Her Immunity) کہلاتا ہے۔ اس طریق کار میں وبا کے وائرس کو ایک علاقے یا ملک میں قدرتی طور پر پھیلنے دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ آبادی کا بڑا حصہ وائرس سے لڑ کر اپنے جسم میں اس کی مدافعت پیدا کر لیتا ہے۔ یوں پھر اس آبادی میں وائرس پھیلنے نہیں پاتا اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

گروہی مدافعت کا طریق کار عموماً ویکسین کی مدد سے انجام پاتا ہے۔ مگر کووید 19 کی ویکسین اب تک ایجاد نہیں ہو سکی۔ اسی لیے امریکی ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ اسے اپناتے ہوئے ضعیف مرد و زن اور کمزور مدافعتی آبادی کا 70 تا 80 فیصد حصہ سارس کوو 2 سے مدافعت حاصل کر لے تو پھر انھیں بھی چلنے پھرنے کی آزادی ہو گی۔

گروہی مدافعت کا طریق کار دو دھاری تلوار رکھتا ہے۔ اول یہ کہ اس کی وجہ سے علاقہ یا ملک لاک ڈاؤن کا نشانہ نہیں بنتا جس سے کئی معاشی و معاشرتی قباحتیں جنم لیتی ہیں۔ دوم یہ کہ آبادی کا مدافعتی نظام کسی ویکسین وغیرہ کے بغیر ہی مضبوط ہو جاتا ہے۔ سویڈن میں بھی کسی حد تک گروہی مدافعت ہی کا طریق کار اپنایا گیا۔ ماہرین کے نزدیک وہ اس لیے کامیاب رہا کہ لاک ڈاؤن ہونے کی صورت میں بھی وہاں اتنی ہی اموات ہوتی تھیں جتنی گروہی مدافعت کے ذریعے رونما ہو سکیں۔

کووید 19 سے بنی نوع انسان کو کئی سبق حاصل ہوئے۔ ایک سبق یہ بھی ملا کہ خدانخواستہ مستقبل میں کسی اور وبا نے جنم لیا تو حکومتیں بذریعہ لاک ڈاؤن زندگی جام کر دینے کے بجائے گروہی مدافعت سا ملتا جلتا طریق کار اختیار کر سکتی ہیں۔ یوں وبا سے مقابلہ ہو سکے گا اور معمولات زندگی بھی رواں دواں رہیں گے۔ ◆◆◆

رضوان شاہ

اقوامِ عالم نے کورونا کا مقابلہ کیسے کیا؟

12 جنوری 2020ء تک کورونا وائرس صرف چین ہی میں براجمان تھا۔ البتہ دنیا بھر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ چین میں ایک نیا موذی مرض جنم لے چکا۔ 13 فروری کو اچانک میاں کورونا نے بیرون دنیا چھلانگ لگا دی۔ اس دن تھائی لینڈ میں کورونا کی پھیلائی وبا، کووڈ 19 کا کیس دریافت ہوا۔ یہ چین سے باہر منظر عام پر آنے والا پہلا کورونا کیس تھا۔ اس کے بعد جاپان، جنوبی کوریا اور فلپائن میں بھی سامنے آئے اور پھر وائرس یکے بعد دیگرے عالمی ممالک کو اپنا نشانہ بناتا چلا گیا۔

ہر ملک میں حکومت کا مرکز توجہ یہ نکتہ بن گیا کہ کس طرح قیمتی انسانی جانیں بچائی جائیں؟ اس ضمن میں اقوام عالم نے کورونا سے لڑنے کی خاطر مختلف حکمت عملی اپنائی۔ مثال کے طور پر کسی ملک نے پوری مملکت میں ایسا زبردست لاک ڈاؤن لاگو کر دیا جو کرفیو کے مماثل تھا۔ جب چین، اٹلی، اسپین میں وبا عروج پر تھی تو وہاں ایک شہری بھی گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ برطانیہ میں شہریوں کو اجازت دی گئی کہ وہ ایک گھنٹا باہر نکل کے ورزش کر لیں یا اشیائے ضروریہ لے آئیں۔ پاکستان میں تمام صوبوں نے لاک ڈاؤن کی مختلف پالیسی اپنائی۔ صوبہ سندھ میں کچھ عرصہ کافی سخت ناکہ بندی رہی۔ پنجاب میں مخصوص شعبہ جات سے تعلق رکھنے والوں کو بغرض کام نکلنے کی اجازت مل گئی۔

وزیراعظم سنگاپور کی تقریر

سنگاپور بھی متاثرہ ممالک میں شامل تھا۔ مگر وہاں حکومت کے متحرک ہونے کی وجہ سے وبا زیادہ پھیلنے نہ پائی۔ ذیل میں وزیراعظم سنگاپور کی تقریر پیش ہے جس میں انھوں نے اپنی حکمت عملی اور مستقبل کے لائحہ عمل کو نمایاں کیا۔ یہ تقریر یوم مئی کے موقع پر کی گئی:

حکومتوں نے کووڈ 19 سے نبرد آزما ہو کر مختلف حکمت عملیاں بنائیں، کسی کو کامیابی ملی، کسی کو ناکامی

لیبر موومنٹ سے تعلق رکھنے والے بھائیوں، بہنوں اور میرے ہم وطنوں

اس سال، ہم مشکل حالات کے درمیان یوم مئی منا رہے ہیں۔ کووڈ۔19 کی عالمی وبا اب بھی پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ سنگاپور میں ہمیں ''سرکٹ بریکر'' کے نفاذ کو تقریباً ایک مہینہ ہو چکا۔ اب ہم روزانہ دس سے پندرہ کیس سامنے آ رہے ہیں جو نمایاں پیشرفت ہے، لیکن ہمیں ابھی مزید کچھ کرنا ہے۔ تارکین وطن کے مابین اب بھی بہت سارے کیسز موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی تعداد کم ہے، شاید اس لیے کہ کارکن جوان ہیں۔ بہرحال ہم ان کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اسپتالوں سے میڈیکل ٹیمیں ان کے علاقوں میں برائے مدد بھجوائی ہیں۔

پنگول میں ایس 11 کا علاقہ سب سے بڑا کووِڈ۔19 کلسٹر ہے جسے ہم جدید ترین اسپتال سینگکنگ جنرل ہسپتال (ایس کے جی ایچ) کے ذریعہ سہولیات مہیا کر رہے ہیں۔ حقیقت میں علاقے کے رہائشیوں نے یہ ہسپتال بنانے میں مدد کی۔ اسپتال میں داخل ایک کارکن نے اپنے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ جس وارڈ میں داخل ہے، اس میں ٹائلیں لگانے کا کام اسی نے انجام دیا۔ سینگکنگ اسپتال کی میڈیکل ٹیم علاقے کے ورکرز کی خدمت کرنے پر بہت خوش ہے۔ یوم مئی تارکین وطن سمیت تمام کارکنوں کی خدمات منانے کا دن ہے۔ میں سنگاپور کی تعمیر و ترقی میں مہمک تمام تارکین وطن کارکنوں کی محنت اور تعاون پر شکریہ اور نیک خواہشات بھیجتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لاک ڈاؤن ہر ایک کے لیے مشکل رہا ہے۔ پابندیوں نے کاروبار اور ملازمتوں کو متاثر کیا اور کافی تکلیف دہ صورتحال پیدا کر دی۔ لیکن آپ نے اس میں بھی مثبت راہیں تلاش کر لی ہیں۔

میں خاص طور پر ضروری خدمات مہیا کرنے والے اپنے بھائیوں اور بہنوں کا شکرگزار ہوں، جنھوں نے سنگاپور میں زندگی کو رواں دواں رکھا۔ ہمارے ڈاکٹر، نرسیں، وزارت افرادی قوت کے افسران، پبلک ٹرانسپورٹ ورکرز، سیکیورٹی گارڈز، کلینرز، سوشل سروس پروفیشنلز، ڈلیوری سوار اور ٹیکسی ڈرائیور، ہمارے اساتذہ، جنھوں نے ہوم بیسڈ لرننگ کے نفاذ کے لیے سخت محنت کی اور پرائمری اسکول کے اساتذہ بھی۔ آپ سب نے قربانیاں دیں اور فرائض کی بجا آوری فرمائی۔ اہل خانہ بھی آپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ آپ سب کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

وبائی مرض نے عالمی معیشت کو بھاری نقصان پہنچایا۔ آئی ایم ایف نے پیش گوئی کی ہے کہ 1930 کی دہائی کے معاشی عدم استحکام کے بعد اب عالمی جی ڈی پی میں سب سے تیزی سے زوال آیا ہے۔ آزاد معیشت کے طور پر سنگاپور کو اس بدحالی کا مکمل احساس ہے۔ تجارت اور سرمایہ کاری، ہمارا زندگی سب کچھ درہم برہم ہو چکا۔ اگر مدد نہ کی گئی تو بہت سی بڑی اور چھوٹی اچھی کمپنیاں کاروبار سے باہر ہو جائیں گی اور بہت سے کارکن اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

پوری دنیا کی حکومتیں اپنی معیشتیں بچانے اور عوام کی بہبود کے لیے بڑی رقوم خرچ کر رہی ہیں۔ سنگاپور حکومت نے بھی اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ 60 بلین سنگاپورین ڈالر کا بجٹ اس کام کے لیے مختص کیا ہے۔ لیکن دوسری حکومتوں کے برعکس ہمیں قرض نہیں لینا پڑا۔ ہم صدر کے اجازت سے اپنے قومی ذخائر زرمبادلہ سے یہ مدد حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے ذخائر ایک نعمت ہیں، جس کے لیے ہمیں اپنے آباؤ اجداد کی اقدار، نظم و ضبط اور دور اندیشی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ بحران درحقیقت عاقلانہ اور مصلحت پسندانہ امن کے وقت اپنے ذخائر کی تعمیر کے لیے یاد دہانی ہے تاکہ واقعی مشکل وقت میں یہ ہمارے کام آ سکیں۔

ہم نے اس بحران میں ملازمتیں بچانے، کمپنیوں کے اخراجات کم کرنے اور شہریوں کو سہولتیں فراہم کرنے کی خاطر

ان ذخائر کا استعمال کیا ہے۔ ہم نے بجٹ میں جاب سپورٹ اسکیم متعارف کرائی۔ اب حکومت تمام شعبوں میں اجرت کا تین چوتھائی ادا کر رہی ہے۔ اس سے کمپنیوں کو اپنے مقامی ملازمین برقرار رکھنے کا پابند بنادیا گیا۔ لیکن کاروباری اداروں کے اخراجات زیادہ ہیں۔ بہت سے کارکنان اب بھی تنخواہ میں کٹوتی دیکھیں گے، اوور ٹائم ضائع ہونے یا اجرت میں براہ راست کمی کی وجہ سے۔ یہ ناگزیر امر ہے۔

لیکن میں آجروں اور کارکنوں، دونوں کو طویل المدتی نظریہ اپنانے کی ترغیب دیتا ہوں۔ مزدوروں کو کاروبار جاری رکھنے کے لیے اجرت کی قربانی قبول کرنا ہوگی۔ اور مالکان کو اپنے کارکن برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس مشکل دور میں انھیں ان کی مدد کرنا ہے۔ انہیں مصیبت آنے پر کارکنوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس طرح کارکن احسان یاد رکھیں گے۔ وفاداری سے خدمت کر کے کاروبار کو زندہ رکھنے میں مدد کریں گے۔ جب معیشت کی بحالی شروع ہوگی تو کمپنیاں بھی از سرنو تعمیر و ترقی کیلیے بہتر حالت میں ہوں گی۔

ہم کوویڈ 19 کے نئے کیسوں کی تعداد کم کرنے کے بعد لاک ڈاؤن اقدامات بتدریج ختم کر دیں گے۔ ہمیں آہستہ آہستہ اپنی معیشت کو دوبارہ شروع کرنا ہوگا۔ یہ آسان نہیں۔ ہمیں کوویڈ۔19 ٹیسٹنگ تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔ حفاظتی تدابیاپناتے ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھنا چاہیے تاکہ انفیکشن دوبارہ سر نہ اٹھا پائے۔

ہم نے عوام کو دی جانے والی ضروری خدمات جاری رکھی ہیں۔ لیکن باقی معیشت کو ایک ساتھ نہیں، بلکہ تدریجاً کھولنا ہوگا۔ کچھ صنعتیں دوسروں کے مقابلے میں پہلے کھل جائیں گی۔ وہ اپنا نقصان جلد پورا کرلیں گی۔ مثال کے طور پر وہ کمپنیاں جو ہمیں دنیا اور عالمی سطح پر سپلائی چین سے مربوط رکھتی ہیں۔ دوسرے شعبوں کو انتظار کرنا پڑے گا، خاص طور پر وہ جو ہجوم کو راغب کرتے یا لوگوں کے ساتھ قریبی رابطے میں شامل ہوتے

وزیر اعظم سنگاپور

ہیں، جیسے تفریحی مقامات اور کھیلوں کے بڑے ایونٹ۔

ہمیں لیکن تمام صنعتوں کو برقرار رکھنا چاہیے تاکہ جب حالات اجازت دیں تو وہ کاروبار دوبارہ شروع کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ منزل کمپنیوں، کارکنوں اور حکومت کے مابین قریبی تعاون کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں۔

سیاحت اور ہوا بازی کو دوسرے شعبوں کی نسبت بحالی میں بہت زیادہ وقت لگے گا، کیونکہ بین الاقوامی سفر اس وقت تک محدود رہے گا جب تک کہ کوویڈ۔19 پوری دنیا میں مسئلہ رہتا ہے۔ ہوائی نقل وحمل سنگاپور کے عالمی اور علاقائی مرکز کے کردار میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک تزویراتی شعبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہوابازی کے لئے اضافی مدد فراہم کر رہی ہے۔

سنگاپور ایئر لائنز کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ قومی ایر لائن کی حیثیت سے اس نے کوویڈ 19 سے لڑنے میں ہماری کوششوں کی حمایت کی ہے۔ ضروری سامان کی ترسیل کے لیے ہر دم کمر بستہ رہی۔ سنگاپور کے شہریوں کو وطن واپس لانے کے لیے پروازیں چلائیں۔ اس کا کیبن عملہ اسپتالوں، ٹرینوں، بازاروں اور مالز میں نگہداشت کے سفیروں کی حیثیت

سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ لیکن بیشتر ایئر لائنز کی طرح اس کی پروازیں بھی کچھ عرصے کے لیے گراونڈ رہیں گی۔ انتظامیہ نے تنخواہوں میں کٹوتی کی ہے۔ یونینوں اور کارکنوں نے بھی قربانیوں کو قبول کیا ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ ایئر لائن کو اب تک کے سب سے بڑے بحران کا سامنا ہے۔ وہ سب کمپنی کو زندہ رہنے میں مدد دینے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

حکومت کو یقین ہے کہ سنگاپور ایئر لائنز اس بحران سے سرخرو ہو کر نکلے گی۔ اس نے ہمیشہ پوری دنیا میں سنگاپور کا جھنڈا بلند کیا۔ ہمیں اس پر فخر ہے۔ ہم اسے دوبارہ ایسا کرنے کے قابل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ طویل مدت میں کوویڈ 19 یقینی طور پر عالمی معیشت میں بہت سی تبدیلیاں لائے گا۔ سامان اور لوگوں کی نقل وحرکت کم آزاد ہوگی۔ ممالک خوراک اور درآمدی اشیا جیسے چہرے کے ماسک کی درآمد پر کم انحصار کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے عالمی تجارت، سرمایہ کاری اور سنگاپور کے لیے بڑے مضمرات ہوں گے۔

ہماری معیشت میں بھی اہم بنیادی تبدیلیاں جنم لیں گی۔ کچھ صنعتیں مستقل طور پر درہم برہم ہو جائیں گی۔ کمپنیوں کو زندہ رہنے کے لیے اپنے کاروباری ماڈل تبدیل کرنا ہوں گے۔ کچھ ملازمتیں بالکل ختم ہو سکتی ہیں۔ ان صنعتوں میں محنت کشوں کو نئے شعبوں میں ملازمتوں کے قابل بنانا ہوگا۔ لیکن نئے مواقع پیدا ہوں گے اور نئی ملازمتیں بھی۔ لاک ڈاؤن کے دوران لوگوں نے زندگی سے ہم آہنگ ہونا سیکھا ہے۔ دوسروں کے ساتھ عملی طور پر کام کرنا سیکھا ہے۔ طلبہ آن لائن سیکھنے کی عادت ڈال رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ آن لائن چیزیں خرید رہے ہیں۔ آن لائن رقوم ادا کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کام کرنے کے نئے طریقوں میں مواقع ہوں۔

دیگر صنعتیں جیسے طبی خدمات، بائیوٹیک، خوراک کی تیاری اور ترسیل، اور آئی ٹی بھی ترقی کر رہے ہیں۔ آج بھی ان میں سے بہت سی فرموں کی طلب میں بڑھی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملازمت پر رکھتی ہیں۔ ہمارے پاس ان میں سے کچھ نئے اور بڑھتے ہوئے شعبوں میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ دیگر صنعتیں ہمارے لیے نئی ہوں گی، اور ہمیں اپنی مہارت اور افرادی قوت کو تیار کرنا ہوگا۔

ہم کمپنیوں کو نئے ماحول اپنانے اور دستیاب ملازمتوں کے لیے کارکنوں کو دوبارہ تربیت دینے میں مدد کریں گے۔ کارکنوں کو بڑے پیمانے پر تربیت دینے کے لئے ہم ہنر سکھانے کے پروگرام تشکیل دیں گے۔ حکومت نے ملازمت کے نئے مواقع اور تربیت دینے میں مدد کے لیے جاب سیکیورٹی کونسل تشکیل دی ہے۔ ہم ہر کام بچانے کے قابل نہیں ہوں گے لیکن ہم ہر کارکن کی دیکھ بھال کریں گے۔

کوویڈ 19 کے بعد کی دنیا اپنانے میں سنگاپور تنہا نہیں ہے۔ لیکن ہمارا چیلنج سب سے زیادہ بڑا ہے کیوں کہ ہم چھوٹے اور عالمگیر ہیں۔ تاہم اس میں فائدہ بھی ہے۔ ہمارا چھوٹا ہونا ہمیں بدلتے ہوئے حالات میں فوری عمل کرنے میں معاون بنتا ہے جبکہ عالمی رابطے کا مطلب ہے کہ ہم تیزی سے ترقی کے نئے مواقعوں کی نشاندہی کر اور ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سب سے اہم بات، ہمارے پاس وہ سب ہے جو ان حالات سے نمبرد آزما ہونے کے لیے چاہیے۔ ہم معاشی تنظیم نو کا تجربہ رکھتے ہیں۔ اور ہم اس حوالے سے ایک سے زیادہ بار کام کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس کاروبار کی ترقی، افرادی قوت میں سرمایہ کاری کرنے، اور اپنے لوگوں کی دیکھ بھال کرنے کے وسائل موجود ہیں۔ ہمارے پاس سہ فریقی شراکت داری ہے، جو کئی دہائیوں سے قائم ہے۔ آجر، لیبر موومنٹ اور حکومت اچھے اور برے حالات میں مل کر کام کرتے ہیں۔ ہم وفاداری اور اعتماد کے تعلقات کے پابند ہیں۔

سنگاپور کے وزیر اعظم، لی ہسین لونگ نے ''سرکٹ بریکر'' کے جملے کو ایک نیا معنی بخشا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کے نزدیک، اس سے مراد وہ حفاظتی آلہ ہے جو برقی سرکٹ میں کرنٹ کے بہاؤ کو روکنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن سنگاپور میں رہنے والے لوگوں کے لیے اس کا مطلب ہے، ملک کے اندر کووڈ 19 کی منتقلی کے سلسلے کو توڑنے کی خاطر گھر میں رہنا۔ ''سرکٹ بریکر'' کے عرصہ کے دوران صرف مندرجہ ذیل کاموں کے لیے گھر سے نکلا جاسکتا ہے:

۱۔ لازمی سروز کے محکموں میں کام کرنے کی غرض سے یا پھر اسکولوں میں جانے کے لیے جو اس عرصہ میں کھلے ہیں۔

۲۔ بچے کو چائلڈ کیئر سینٹر میں چھوڑنے کے لیے اگر آپ لازمی سروسز کے کسی محکمے کام کرتے ہیں۔

۳۔ گھر کا سودا سلف خریدنے کے لیے۔ لیکن وہاں پر بھی ایک دوسرے سے ایک میٹر کے فاصلے پر کھڑا رہنا ضروری ہے۔

۴۔ اکیلے یا اپنے ساتھی کے ساتھ ورزش کے لیے۔

۵۔ کورونا وائرس سے متاثر ہونے کی صورت میں طبی امداد کے لیے۔

۶۔ کسی بزرگ یا معذور شہری کی مدد کے لیے۔

۷۔ کسی طبی ایمرجنسی امداد کے لیے۔

۸۔ عدالت کے کسی حکم کی تعمیل کے لیے۔

۹۔ نیشنل سروس میں رپورٹ کے لیے۔

اس کے علاوہ کسی بھی صورت میں گھر سے پہلی دفعہ نکلنے پر تحریری وارننگ دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسری مرتبہ خلاف ورزی کی صورت میں تین سو سنگاپوری ڈالر جرمانہ کیا جاتا ہے اور تیسری مرتبہ خلاف ورزی پر عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

کورونا سے نبرد آزما ہوتے ہوئے تمام حکومتوں میں دنیا کی امیر ترین اور انگلوی سپر پاور، امریکی حکومت کو خاصی خفت و ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ایک معمولی وائرس نے صدر ٹرمپ کے ''عظیم امریکا'' نعرے کو خاک میں ملا دیا۔ ٹرمپ حکومت دیکھ رہی تھی کہ کورونا ہولے ہولے امریکا کی سمت بڑھ رہا ہے مگر اس نے وبا سے نمٹنے کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے۔ چنانچہ کورونا نے ارض امریکا پر قدم دھرے تو وہ ٹڈی دل کی طرح پوری مملکت میں پھیل گیا۔ تادم تحریر دس لاکھ سے زائد امریکی کووڈ 19 کا شکار ہو چکے۔ اموات کی تعداد بھی ساٹھ ہزار سے بڑھ چکی۔ یہ دونوں اعداد دُنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔

امریکا میں بھی ریاستوں نے وبا کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف حکمت عملیاں تشکیل دیں۔ ریاست نویدا نے سب سے سخت لاک ڈاؤن متعارف کرایا۔ وہاں کئی دن تک کوئی انسان سڑک پہ پیر نہیں مارسکا۔ مگر ریاست کیلیفورنیا کے ساحل سمندر پر انسانوں کے ہجوم در ہجوم نظر آتے رہے جس پر ماہرین طب نے حیرت وتشویش کا اظہار کیا۔ آخر حکمران طبقے کو ہوش آیا اور کورونا کے طبی ومعاشی منفی اثرات سے بچنے کے لیے اربوں ڈالر خرچ کیے جانے لگے۔

حیران کن بات یہ کہ کورونا نے عالمی سپر پاور کو تو بے در پے حملوں سے بے حال کر دیا مگر خانہ جنگی، غربت اور جنگوں سے بدحال یمن اس قدرتی آفت سے محفوظ رہا۔ تادم تحریر وہاں صرف ایک کیس سامنے آیا ہے۔ چنانچہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ شام، عراق افغانستان اور لیبیا میں کورونا کے اتنے زیادہ مریض سامنے نہیں آئے جتنی توقع تھی۔

یمن، شام، عراق، افغانستان اور لیبیا میں صحت کا نظام بھی تباہ و برباد ہو چکا۔ خدانخواستہ وہاں وبا پھیل جاتی تو دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں مرد وزن اس کی لپیٹ میں آکر لقمہ اجل بن جاتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آفات قدرتی وغیر قدرتی کا مقابلہ کرنے کے باعث ان کے مدافعتی نظام مضبوط ہو چکے۔ اسی لیے کورونا وائرس انھیں زیادہ نقصان نہ پہنچا سکا۔ بعض اوقات امریکی و یورپیوں کی طرح حد سے زیادہ صفائی کی عادات مدافعتی نظام کمزور کر دیتی ہیں کیونکہ وہ نت نئے جراثیم اور وائرسوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔

یمن میں مختلف متحارب گروہوں کے مابین لڑائی جاری ہے۔ وہاں دو کروڑ چالیس لاکھ افراد آباد ہیں۔ ان میں سے ''80 فیصد'' غربت اور بیروزگاری کا نشانہ بن چکے۔ تخمینہ ہے کہ اگر کووڈ 19 وہاں پھیلی تو آدھی آبادی اس کا شکار ہو سکتی ہے اور ان میں سے کم از کم ایک ڈیڑھ لاکھ چل بسیں گے۔

انوکھی بات یہ کہ اب بھی بعض ممالک میں وبا کا ایک مریض سامنے نہیں آیا۔ ان ممالک میں شمالی کوریا، تاجکستان، ترکمانستان، لیسیتھو اور بحرالکاہل و بحراوقیاس میں واقع چھوٹے جزائر شامل ہیں۔ جزائر اضی قطعات سے دور ہیں۔ اس لیے ان کا کووڈ 19 سے پاک رہنا سمجھ آتا ہے۔ مگر شمالی کوریا، تاجکستان، اور ترکمانستان جیسے بڑے ممالک کیونکر محفوظ رہے حالانکہ وہ مرکز وبا، چین سے قرب رکھتے ہیں۔ ماہرین کا دعویٰ ہے، ان ممالک کی آمرانہ حکومتیں اپنے ہاں وبا کے مریضوں کی تعداد چھپا رہی ہیں۔

یہ ایک نرالی صورت حال ہے۔ بعض ملک مریضوں کی تعداد ظاہر نہیں کرنا چاہتے تو کئی ملکوں میں الٹ چلن رائج ہو گیا۔ وہاں بیماری کوئی بھی ہو، اُسے کووڈ 19 کا مریض ظاہر کیا جانے لگا۔ کئی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یہ حرکت بدامریکا، برطانیہ اور انڈیا کے زیر سایہ رہنے والے ممالک میں اپنائی گئی تاکہ مذموم مقاصد حاصل ہو سکیں۔ دیگر ممالک کا مدعا یہ تھا کہ بین الاقوامی مالیاتی اور امدادی اداروں سے بھاری بھر کم امداد حاصل کی جاسکے۔ بعض حلقوں نے پاکستانی حکومت پر بھی یہ الزام لگایا ہے۔ صد افسوس کہ کرپٹ اور لالچی عناصر انسانی المیے کی آڑ لے کر اپنا گھناؤنا کھیل جاری رکھتے ہیں۔

ایسے ہی انسانوں کے کرتوتوں کی وجہ سے قدرت الٰہی عذاب نازل فرماتی ہے۔

ترکمانستان میں حالت یہ ہے کہ وہاں ڈاکٹر میڈیا سے کووِڈ 19 کے بارے میں گفتگو نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شہری ماسک زیب تن کرے، تو اُسے جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ جو کوئی وبا کے متعلق بات کرے، تو اسے سزا دی جاتی ہے۔ دنیا بھر کے دانشوروں کو تعجب ہے کہ کووِڈ 19 کو پوشیدہ رکھ کر ترکمانستانی حکومت آخر کیا مقاصد پانا چاہتی ہے؟ کیا یہ کہ عالمی سطح پر اس کی حیثیت کو نقصان نہ پہنچنے پائے؟ یاد رہے، ترکمانستان کے تقریباً سبھی پڑوسی ممالک میں کورونا کے مریض سامنے آچکے۔

ترقی یافتہ ممالک میں نیوزی لینڈ کی حکومت نے کووِڈ 19 سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سب سے زیادہ مقوی، چستی، فوری عمل اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ وہاں مسلمانانِ عالم کی پسندیدہ حکمران، جیسنڈہ آرڈن حکمران ہیں۔ ان کے اقدامات کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔

نیوزی لینڈ میں 28 فروری کو وبا کا پہلا مرض سامنے آیا۔ 14 فروری تک ان کی تعداد چھے ہوگئی۔ اسی دن کیوی حکومت نے اعلان کیا کہ ملک میں بیرون ممالک سے آنے والا ہر شخص چودہ دن قرنطینہ میں رہے گا۔ نیوزی لینڈ ایسا سخت قدم اٹھانے والا دنیا کا پہلا ملک تھا۔ پھر 19 مارچ کو غیرملکیوں کے آنے پر پابندی لگادی گئی۔ 23 مارچ کو وزیراعظم آرڈن نے ملک بھر میں لاک ڈاؤن لاگو کردیا۔

یہ لاک ڈاؤن ایسا نہیں تھا کہ طاقتور کو تو گھومنے پھرنے کی آزادی مل گئی جبکہ عام شہری گھروں میں بند رہے۔ نظر بندی کا قانون سب شہریوں پر یکساں لاگو کیا گیا۔ صرف اشد ضرورت کے تحت ہی عام شہری گھر سے نکل سکتے تھے۔ نیز تمام عوامی مقامات پر ”معاشرتی دوری“ کا اصول سختی سے نافذ کیا گیا۔ ان اقدامات کی وجہ سے نیوزی لینڈ میں کورونا زیادہ پھیلنے نہ پایا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ نیوزی لینڈ کو بہترین قیادت کے سبب ہی کامیابی ملی۔ وزیراعظم آرڈن نے وبا سے نمٹنے کی ذمے داری ایک طبی سائنس داں کے سپرد کردی۔ وسائل بھی انھی کو دے ڈالے۔ اس طبی سائنس داں نے اپنا تجربہ اور مہارت بروئے کار لاتے ہوئے کووِڈ 19 سے نمٹنے کے بہترین انتظامات کیے۔ مثلاً وسیع پیمانے پر ٹیسٹ کرائے۔ یوں مریضوں کی بڑی تعداد اوائل ہی میں دریافت ہوگئی اور وہ وائرس دیگر شہریوں میں پھیل نہیں پایا۔

دنیا بھر میں طب وصحت سے منسلک ماہرین یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی کورونا وائرس اتنا زیادہ نہیں پھیل سکا جس کی توقع تھی۔ نہ پھیلنے کی وجہ کیا ہیں؟ اسی سلسلے میں ماہرین نے مختلف آرا پیش کیں۔

ماہرین کے نزدیک ایک وجہ یہ ہے کہ ان ملکوں کی بیشتر آبادی نوجوانوں، لڑکوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ کورونا وائرس ان پر کم ہی اثر کرتا ہے، اسی لیے وہ جنوبی ایشیاء میں پھیل نہیں سکا۔ مزید برآں تینوں ممالک نے ملک بھر میں لاک ڈاؤن لگا دیا۔ یہ اقدام بھی موثر ثابت ہوا۔

بھارت کے معاملے میں بعض ماہرین کا خیال ہے کہ مودی سرکار نے کووِڈ 19 سے اموات کی تعداد دانستہ کم رکھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ”عظیم بھارت“ کے تصور کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ وزیراعظم مودی خبط کی حد تک یہ تمنا رکھتے ہیں کہ عالمی برادری میں بھارت سپر پاور کا درجہ حاصل کرلے۔ لیکن کورونا جیسی کوئی نہ کوئی آفت موصوف کی خواہش ملیامیٹ کر ڈالتی ہے۔ یہ آفتیں دنیا والوں پر آشکارا کرتی ہیں کہ بھارت آج بھی کروڑوں بھوکے ننگے اور بیروزگار باشندوں کا دیس ہے جہاں انھیں جائے حاجت جیسی ضروری سہولت بھی میسر نہیں۔

کووِڈ 19 سے مقابلہ کرتے ہوئے اسکینڈے نیوین ملک، سویڈن کی حکومت نے سب سے منفرد حکمتِ عملی

اپنائی۔ اس نے ملک بھر میں کسی قسم کا لاک ڈاؤن نہیں لگایا البتہ ہائی اسکول اور یونیورسٹیاں بند کردیں۔ نیز عوامی مقامات پر معاشرتی دوری کا اصول لاگو کردیا۔ تاہم پرائمری اور چھوٹے بچوں کے اسکول کھلے رکھے گئے۔

نتیجہ یہ ہے کہ وبا پھیلنے کے ساتھ ساتھ سویڈن میں معمولاتِ زندگی جاری رہے۔ کاروباری ادارے اور کارخانے کھلے رکھے گئے۔ لوگوں نے اپنے معمول کے کام جاری رکھے۔ حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی اسکول جاتے رہے۔ غرض سویڈن میں کورونا وائرس حکومت اور عوام، دونوں کو زیادہ خوفزدہ نہیں کرسکا۔

ماہرین طب نے مگر سویڈش حکومت کی حکمت عملی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا کہنا تھا لاک ڈاؤن نہ کرنے سے دیگر اسکینڈے نوین ممالک کی نسبت سویڈن میں کورونا کو پھیلنے کا موقع مل گیا۔ اعداد وشمار دیکھے جائیں تو ان کی دلیل کچھ بے وزن لگتی ہے۔ فی الوقت سویڈن میں 20 ہزار سے زائد کیس سامنے آچکے۔ اموات کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہے۔ جبکہ دیگر اسکینڈے نیوین ممالک میں صورت حال یہ ہے: ”ڈنمارک 90 ہزار کیس اور 443 اموات۔ ناروے 7800 کیس اور 207 اموات۔ فن لینڈ 5 ہزار کیس اور 206 اموات۔ آئس لینڈ 1797 کیس اور 10 اموات۔“

یہ سطور قلمبند ہونے تک دنیا بھر میں تینتیس لاکھ سے زائد انسان کورونا وائرس کا نشانہ بن چکے۔ ان میں سے دو لاکھ اٹھائیس ہزار سے زیادہ اپنی جان ہار گئے۔ جبکہ تقریباً دس لاکھ صحت یاب ہونے میں کامیاب رہے۔ تاہم طبی سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ تندرست ہونے والے کسی بھی وقت کورونا کا دوبارہ شکار ہوسکتے ہیں۔

کورونا وائرس نے بظاہر چین میں جنم لیا مگر چینی حکومت آغاز میں سستی کا مظاہرہ دکھانے کے باوجود اُسے کنٹرول کرنے میں کامیاب رہی۔ خاص طور پر سریع الاثر حکومتی اقدامات کے باعث اموات کی تعداد بڑھ نہ پائی۔ حکومت وسیع پیمانے پر اقدامات نہ کرتی تو امریکا کی طرح چین میں بھی ہزارہا انسان چل بستے۔ ہانگ کانگ جیسے گنجان آبادی والے علاقے میں کووِڈ 19 کے صرف 1038 کیس سامنے آئے۔ یہ ثبوت ہے کہ چینی حکومت نے وبا کو پھیلنے نہیں دیا اور لاک ڈاؤن کی بدولت اسے زیر کرلیا۔

جب کورونا وائرس کرۂ ارض پر پھیل رہا تھا، تو اس دوران انوکھے دعویٰ بھی سامنے آئے۔ مثال کے طور پر اسرائیل میں بسنے والے امریکی نوبل انعام یافتہ حیاتیاتی طبعیات داں، پروفیسر مائکل لیوٹ نے دعویٰ کیا کہ بیشتر اموات کی بنیادی وجہ کووِڈ 19 نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مرنے والے زیادہ تر لوگ کسی نہ کسی سنگین بیماری میں مبتلا تھے۔ کورونا نے بس ان کی حالت بدتر بنادی، اسی لیے وہ چل بسے۔ پروفیسر مائیکل کے نزدیک کورونا وائرس فلو کے دیگر وائرسوں سے ملتا جلتا ہے اور کوئی منفرد خاصیت نہیں رکھتا۔

کووِڈ 19 کا زور اور پھیلاؤ رفتہ رفتہ ماند پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ وبا اگلے سال تک بنی نوع انسان پر حملہ آور رہے گی۔ جانی نقصان پر قابو پانے کے بعد اب دنیا بھر میں حکومتوں کو معاشی نقصانات سے نمٹنے کی خاطر جامع حکمت عملیاں بنانا ہوں گی۔ ماہرین معاشیات خبردار کر رہے ہیں کہ یہ وبا خصوصاً ترقی پذیر ممالک پر قرضوں کا مزید بوجھ ڈال دے گی۔ یہ ملک پہلے ہی غربت، بیماری اور بیروزگاری سے نبرد آزما ہیں۔ لہٰذا بڑھتے قرضے انھیں مزید مشکلات میں مبتلا کردیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ کورونا نے ہر ملک کے حکمران طبقے کو آزمائش اور کڑے امتحانوں میں گرفتار کرادیا۔ اس نازک موقع پر جن حکمرانوں نے کیوی وزیراعظم کی طرح تدبر، فرض شناسی، دیانتداری اور فوری عمل کا مظاہرہ کیا، صرف وہی کووِڈ 19 کے منفی اثرات دور کرکے سرخرو اور کامیاب قرار پائیں گے۔ ◆◆◆

ایک غریب سپر پاور امریکا کا کیسے ہر دلعزیز لیڈر بن گیا؟

طاقتور اسٹیبلشمنٹ سے ٹکر لینے والے قاضی راہنما کا ڈرامائی اور حیرت انگیز قصہ حیات

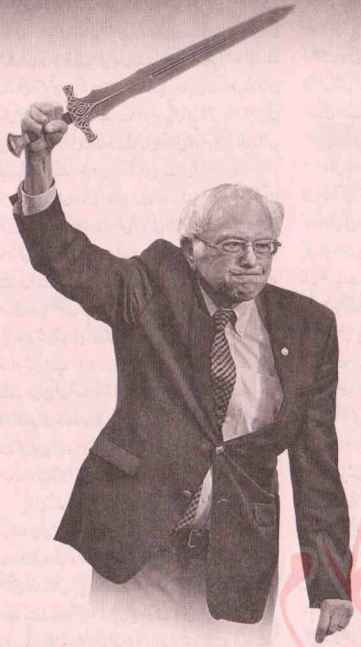

- کرائے کے مکان میں رہتے پولش مہاجر کو کیا فکر لاحق رہی؟
- شگاگو یونیورسٹی میں طلبہ وطالبات نے انتظامیہ کے خلاف کیوں تاریخی دھرنا دیا؟
- عوام کی فلاح و بہبود ایک سادہ نوجوان کا کیونکر مشن بن گیا؟
- مئیر بن کر "انکل برنی" کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟
- امریکا میں عوام کے مسائل کو کس نے قومی افق پر نمایاں کیا؟
- مضبوط لابیاں ایک عوامی نمائندے کو شکست دینے کیوں اکٹھی ہوئیں؟

وسط مارچ سے کوویڈ 19 نے دنیا بھر میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو بکھیر کر رکھ دی۔ یہ وبا ہر جگہ موضوع بحث بن گئی۔ یقیناً یہ دنیا بدل دینے والا واقعہ تھا مگر اس نے دیگر کئی اہم خبروں کو دھندلا کر رکھ دیا۔ نمایاں نہ ہونے والی ایسی خبروں میں شاید سب سے اہم خبر یہ تھی کہ 78 سالہ امریکی سیاست داں، برنی سینڈرز نے اپنی انتخابی مہم ختم کر ڈالی۔ اس خبر نے برنی کے کروڑوں پرستاروں کے دل توڑ دیے۔

امریکا میں سال رواں کے اواخر میں صدارتی الیکشن ہوں گے۔ برنی سینڈرز اوائل فروری 2020ء سے امریکا کی دو بڑی جماعتوں میں سے ایک، ڈیموکریٹک پارٹی کا امیدوار بننے کی خاطر چھے اُمیدواروں سے نبرد آزما تھا۔ تب سے امریکی ریاستوں میں پارٹی کے الیکشن جاری تھے۔ ہر ریاست میں آبادی کے تناسب سے ارکان پارٹی نے مخصوص تعداد میں اپنے نمائندے (ڈیلی گیٹس) بذریعہ ووٹ چننے تھے۔ ان کی کل تعداد 3979 ہے۔ انھی نمائندوں نے اگست 2020ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کے قومی کنونشن میں طے کرنا ہے کہ کون سا راہنما پارٹی صدارتی الیکشن میں پارٹی کا امیدوار بنے گا؟

پارٹی کے ریاستی انتخابات میں جو امیدوار کم از کم 1991 نمائندوں کی حمایت حاصل کر لیتا، اس کی جیت کا امکان روشن تھا۔ 3/فروری کو سب سے پہلے ریاست آئیوا میں جماعتی الیکشن ہوا۔ اس ریاست کے 41 نمائندے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ یعنی 14 پیٹی بوٹیگیگ نامی امیدوار کو ملے۔ 12 برنی سینڈرز، 8 ایلزبتھ وارن اور 6 جو بائیڈن کے حصے میں آئے۔ جوں جوں ریاستوں میں الیکشن آگے بڑھے، یہ واضح ہو گیا کہ اصل مقابلہ برنی سینڈرز اور سابق نائب صدر، جو بائیڈن کے مابین ہے۔

برنی سینڈرز کی انتخابی مہم کا نقطۂ عروج 3/مارچ کو رونما ہوا جب وہ کیلیفورنیا ریاست سے 221 اور ٹیکساس سے 102 نمائندے حاصل کرنے میں کامیاب رہا لیکن دس مارچ کے بعد بیشتر ریاستی جماعتی انتخابات جو بائیڈن نے جیت لیے۔ آخرکار واضح ہو گیا کہ سینڈرز اب مطلوبہ نمائندوں کی حمایت حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ۸/اپریل کو اس نے اپنی انتخابی مہم ختم کر دی۔ تب تک وہ 937 نمائندوں کی حمایت پا چکا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام کا ناقد

اہل پاکستان کی اکثریت نے ڈیموکریٹک پارٹی کے اس بین الجماعتی الیکشن میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ اس کی اہمیت سے ناواقف تھے۔ دوم رہی سہی کسر نئے کورونا وائرس سے پھیلی وبا نے پوری کر دی۔ یوں اس الیکشن میں نظریات کی جو زبردست جنگ لڑی گئی، وہ پاکستان ہی نہیں دنیا کے اکثر ممالک میں نمایاں نہیں ہو سکی۔

زوال پذیر ہونے کے باوجود امریکا اب بھی دنیا کی سب سے بڑی معاشی اور عسکری طاقت ہے۔ یہی نہیں برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور اپنے زیرنگیں دیگر ممالک کے ساتھ مل کر اسی نے سرمایہ داری کے عالمی نظام کو سنبھالا دے رکھا ہے۔ امریکا ہی دور جدید میں مروجہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا دنیا میں سب سے بڑا پشتی بان ہے۔ عالمی راہنماؤں میں برنی سینڈرز یہ منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ وہ اسی عالمی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لانا چاہتا ہے۔ وہ سرمایہ دار نظام کا ایک کڑا ناقد ہے اور ایسا لیڈر جس کی باتیں پوری دنیا میں دھیان سے سنی جاتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ برنی سینڈرز ڈیموکریٹک پارٹی کا رکن نہیں البتہ نظریاتی قرب رکھنے کے باعث وہ ماضی میں مختلف معاملات میں اس پارٹی کی حمایت کرتا رہا ہے۔ اسی طرح ڈونالڈ ٹرمپ بھی دوسری بڑی امریکی جماعت، ریپبلکن پارٹی کا رکن نہیں مگر نظریات میں قربت کے باعث وہ اس کے قریب رہا اور آخرکار اسی کے پلیٹ فارم سے لڑ کر ہی صدر بننے میں کامیاب ہو گیا۔

برنی سینڈرز کی طرح ڈونلڈ ٹرمپ بھی غیر روایتی سیاست داں ہے لیکن امریکا کی طاقتور، بااثر اور امیر اسٹیبلشمنٹ نے ٹرمپ کو بطور صدر قبول کر لیا۔ وجہ یہ ہے کہ ٹرمپ بنیادی طور پر اپنی اسٹیبلشمنٹ کا کبھی مخالف نہیں رہا۔ 2016ء میں اس کی انتخابی مہم تین نمایاں نکات رکھتی تھی: اوّل یہ کہ غیر ممالک مثلاً چین میں امریکی صنعت کاروں، تاجروں اور کاروباریوں نے جو کمپنیاں و کارخانے کھول رکھے ہیں، وہ واپس امریکا لائے جائیں تاکہ نئی ملازمتیں جنم لیں اور بیروزگاری دور ہو۔ دوم یہ کہ مہاجرین کی آمد پر پابندی لگ جائے۔ سوم یہ کہ جنگیں ختم کر دی جائیں۔

اسٹیبلشمنٹ سے ٹکر

درج بالا تینوں نکات متنازع تھے مگر انھوں نے امریکی اسٹیبلشمنٹ کو براہ راست نقصان نہیں پہنچایا۔ مزید برآں ٹرمپ بذات خود ایک کھرب پتی ہونے کے ناتے اسٹیبلشمنٹ کا حصہ تھا۔ اسی لیے اس کی راہ میں رکاوٹیں نہیں ڈالی گئیں۔ بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ اس میں شامل بعض عناصر نے ٹرمپ کو کامیاب کرانے کے لیے اپنا کردار ادا کیا ہو۔

برنی سینڈرز مگر امریکی اسٹیبلشمنٹ کا کٹر مخالف ہے۔ اس نے انتخابی مہم شروع کرنے سے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ صدر بن کر امریکا میں رائج معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کرے گا۔ مدعا یہ تھا کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ بااختیار بنا دیا جائے تاکہ عام لوگوں تک بھی ترقی و خوشحالی کے ثمرات پہنچ سکیں۔ گویا برنی سینڈرز عام آدمی کا بھلا چاہتا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ امریکا کے سیاسی و معاشی نظام میں عوام دوست تبدیلیاں لائی جائیں۔

عام آدمی کی فلاح و بہبود کے لیے سعی کرنے والا برنی سینڈرز سرمایہ دارانہ نظام کا بھی مخالف ہے۔ امریکی اسٹیبلشمنٹ کے نزدیک یہی بات سینڈرز کی سب سے بڑی خامی ثابت ہوئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ صدر بن کر اپنے ایگزیکٹیو آرڈرز کی بدولت عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں اہم تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ وہ تبدیلیاں پھر امریکی معاشرے کے طاقتور و بااثر مٹھی بھر افراد کی طاقت و حیثیت کمزور کر سکتی تھیں۔

یہی وجہ ہے، جب ابتدائی ریاستی الیکشن میں برنی سینڈرز کو کامیابی ملی تو امریکی اسٹیبلشمنٹ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ اپنی بقا کی خاطر وہ پوری قوت سے متحرک ہو گئی۔ اس نے پھر سینڈرز کو ناکام بنانے کے لیے خفیہ و عیاں سازشیں کیں اور اُسے اپنی انتخابی مہم ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ایک 78 سالہ بوڑھا آخرکار انتہائی طاقتور امریکی اسٹیبلشمنٹ سے شکست کھا گیا۔ اب کوئی کرشمہ ہی اسے ڈیموکریٹک پارٹی کا صدارتی امیدوار بنا سکے گا۔

اس ہار کے ذریعے بھی سینڈرز نے مگر سبھی امریکیوں ہی نہیں تمام دنیا والوں پر بھی یہ سچائی اُجاگر کر دی کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام عوام پر ظلم و ستم ڈھانے کا ہتھیار بن چکا۔ یہ معاشی نظام مٹھی بھر لوگوں کو تو زبردست فوائد پہنچا رہا مگر عوام اس کے ثمرات سے مستفید نہیں ہو پاتے۔

برنی سینڈرز کی غیر معمولی، ڈرامائی اور سبق آموز داستان عیاں کرتی ہے کہ انسان اگر دوسروں کی بھلائی کے لیے سرگرم ہو، تو اسے کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور مل جاتی ہے۔ سینڈرز فرشتہ نہیں، دوران حیات اس سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور گناہ بھی، تاہم اپنی ذات نہیں، دوسروں کی خاطر سرگرم رہنے کے باعث وہ گوشۂ گمنامی سے نکل آیا۔ اُسے چاہنے والے ملے اور عزت و احترام کرنے والے بھی۔ شہرت ہی نے پھر اسے دولت مند بھی بنا دیا۔ اس کی داستان زندگی میں ہمارے لیے کئی سبق مل جاتے ہیں۔ اس نے اپنی فکر و عمل سے امریکی معاشرے ہی نہیں دنیا بھر میں سیاسی و معاشی شعور و آگہی

برنی سینڈرز کا والد

بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

غریب مہاجر کی آمد

برنارڈ سینڈرز 8 ستمبر 1941ء کو نیویارک کے علاقے، بروکلین میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ، الیاس بن یہودا سینڈرز پولینڈ کے ایک غریب یہودی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اچھے مستقبل کے خواب دیکھتا 1921ء میں امریکا چلا آیا۔ ناخواندہ ہونے کے باعث مگر اُسے عمدہ ملازمت نہیں مل سکی۔ وہ پینٹ کی ایک کمپنی میں سیلز مینی کرنے لگا۔ جلد نیویارک میں مقیم ایک یہودی لڑکی، ڈوروتھی سے اس کی شادی ہوگئی۔ پہلے ایک لڑکے، لیوس نے جنم لیا۔ پھر سات برس بعد برنارڈ عرف برنی دنیا میں چلا آیا۔

یہ خاندان کرائے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں مقیم تھا جس کے صرف تین کمرے تھے۔ اس عمارت میں نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے خاندان مقیم تھے۔ کوئی ڈرائیور تھا تو کوئی مزدور۔ ان کی آمدن کم تھی تو خواہشات بھی محدود تھیں۔ وہ کھینچ تان کر گزارا کر ہی لیتے۔ اس زمانے میں لوگ اپنے خول میں سمٹ کر نہ رہتے۔ شام کو بڑے بوڑھے عمارت کے صحن میں بیٹھ جاتے۔ گپیں لگاتے اور بچوں کو نصیحتیں کرتے۔ غرض اس آزادانہ ماحول میں برنی کی پرورش ہوئی۔

تاہم گھر میں آخری ماہ پیسے نہ ہوتے تو برنی کے والدین میں تھوڑی بہت منہ ماری ہو جاتی گو الیاس اور ڈوروتھی کوشش کرتے کہ وہ بچوں کے سامنے بحث نہ کریں مگر انھیں بچپن ہی میں پتا چل گیا کہ پیسا نہ ہونا وجہ فساد بن سکتا ہے۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ اکثر الیاس کو علم نہ ہوتا کہ وہ اگلے ماہ فلیٹ کا کرایہ ادا کر پائے گا یا نہیں۔ بہرحال انھیں کھانے کو مناسب غذا مل جاتی لیکن والدین کو پیسے کے لیے لڑتا جھگڑتا دیکھ کر بچپن ہی میں سینڈرز کو احساس ہو گیا کہ مالیات ہر خاندان کی تشکیل و تعمیر یا شکست و ریخت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مطلوبہ پیسا نہ ہو تو ہر خاندان میں پریشانی رہتی ہے۔

مالی مسائل کے باوجود اہل خانہ ایک دوسرے سے قربت و محبت رکھتے تھے۔ الیاس اعتدال پسند یہودی تھا اور دیگر اہل مذہب سے کوئی کدورت نہ رکھتا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی یہ بتایا کہ سب انسان برابر ہیں۔ لہٰذا ہر کسی سے عزت و احترام کے ساتھ پیش آؤ۔ وہ انصاف اور مساوات پر زور دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انصاف پانا ہر انسان کا حق ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ مالی مسائل میں گھرے رہنے کے باوجود الیاس لالچی آدمی نہ تھا۔ اس کی بس یہی خواہش تھی کہ روزمرہ ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ قناعت و سادگی کا درس اس نے اپنی اولاد کو بھی دیا۔ وہ اکثر دونوں بیٹوں سے کہتا: ”اپنی زندگی بامقصد بناؤ۔ کچھ ایسا کرو کہ معنی خیز بن جائے۔ دولت بھی کماؤ لیکن اپنی زندگی کو محض کمائی کی مشین نہ بنا لینا بلکہ اسے کارخیر میں بھی استعمال کرنا۔“

ان باتوں کا باشعور ہوتے برنی سینڈرز پر کافی اثر ہوا اور وہ بچپن ہی سے ایک سادہ مزاج اور دوسرے کے کام آنے والا لڑکا بن گیا۔ الیاس کی مالی حیثیت یہ نہ تھی کہ وہ بچوں کو نجی اسکول میں داخل کرا تا۔ اسی لیے لیوس اور برنی، دونوں نے سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی لیکن پاکستان کی طرح اس دور میں امریکی سرکاری اسکول کالجوں کا بھی اُونچا معیار تھا۔

والد اور بھائی کے ساتھ

وہاں ایسے اساتذہ مقرر تھے جن کا مطمع نظر محض پیسے کمانا نہیں بلکہ طلبہ کو معیاری تعلیم و تربیت فراہم کرنا تھا۔

ایثار کا یادگار واقعہ

اسکول کالج میں تعلیم پاتے ہوئے سینڈرز عام سا طالب علم رہا۔ اسے درسی کتب سے زیادہ غیر نصابی سرگرمیاں زیادہ بھاتی تھیں۔ وہ باسکٹ بال ٹیم کا رکن رہا۔ ڈوروتھی ریس میں بھی حصہ لیا۔ سٹیو سالوین جیمز میڈیسن ہائی اسکول میں سینڈرز کا ہم جماعت تھا۔ وہ اپنے دوست کے ایثار و قربانی کا ایک واقعہ سناتا ہے۔

ہوا یہ کہ نیویارک میں ایک میل لمبی دوڑ منعقد ہوئی۔ اس میں مختلف اسکولوں کے طلبہ نے حصہ لیا۔ اسکول سے سینڈرز اور پیٹر نامی دوڑ کے ریس میں شریک تھے۔ اتفاق سے جب دوڑ کا اختتام آیا تو وہ دونوں ہی سب سے آگے تھے۔ اس ریس کی منفرد بات یہ تھی کہ جب اختتام آتا تو اوّل اور دوم نمبر پر بھاگنے والے لڑکے ہاتھوں میں ہاتھ دیے اختتامی لکیر پار کرتے تھے مگر اس سال انوکھا واقعہ پیش آیا۔

برنی سینڈرز نے دراصل پیٹر کو اپنے دوستوں سے باتیں کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میری بڑی تمنا ہے کہ یہ دوڑ جیت جاؤں۔ اس طرح گھر میں میری واہ واہ ہوگی۔ امی ابو بہت خوش ہوں گے۔ یہ تمنا سن کر سینڈرز نے طے کر لیا کہ اگر خدا نے اُسے موقع دیا تو وہ پیٹر کو فاتح بنا دے گا۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اختتام پر سینڈرز سب سے آگے تھا۔ اس کے تھوڑا پیچھے پیٹر بھاگ رہا تھا۔ جب اختتامی لکیر قریب آئی تو روّاج کے مطابق دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیا اور پہلو بہ پہلو بھاگنے لگے لیکن لکیر سے کچھ دُور اچانک سینڈرز آہستہ ہوا اور اس نے پیٹر کو آگے دھکا دے ڈالا۔ یوں پیٹر ریس جیت گیا اور اوّل نمبر پر آیا۔ سینڈرز کی اس حرکت پر سبھی دوست بہت حیران ہوئے کیونکہ سب دیکھ رہے تھے کہ وہی دوڑ کا فاتح ہوگا۔ بعدازاں انھیں حقیقت معلوم ہوئی، تو انھوں نے سینڈرز کو ایثار و ہمدردی دکھانے پر بہت سراہا۔

جیمز میڈیسن ہائی اسکول کے شفیق اساتذہ نے بھی برنی سینڈرز کی شخصیت و نظریات وضع کرنے میں اپنا حصہ ڈالا۔ اس اسکول سے پڑھ کر کئی گمنام ہستیاں شہرت کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکیں۔ ان میں سینڈرز کے علاوہ امریکی سپریم کورٹ کی مشہور جسٹس روتھ ہیڈر، سینئر چک شومار، سینئر نورم کولمین اور گانے لکھنے والے شاعر، کیرول کنگ نمایاں ہیں۔

وہ یتیم ہو گیا

لڑکپن میں برنی سینڈرز کو کے بعد دیگرے دو نہایت تلخ صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ جب ہائی اسکول ختم ہوا تو اس کی عمر 18 سال تھی۔ اسی برس محبت کرنے والی ماں اُسے داغ جدائی دے گئی۔ الیاس کو چاہنے والی بیگم کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ بھی دو سال بعد اپنے بیٹوں کو فانی دنیا میں چھوڑ کر عالم بالا چلا گیا۔ یوں سینڈرز بھری جوانی میں یتیم ہو گیا۔ یہ 1962ء کی بات ہے۔

1960ء میں ہائی اسکول سے نکلنے کے بعد ایک سال برنی بروکلین کے ایک کالج میں زیر تعلیم رہا۔ پھر وہ شکاگو یونیورسٹی پڑھنے چلا گیا۔ وہ سیاسیات میں گریجوایشن کرنا چاہتا تھا تاہم پروفیسر صاحبان کے لیکچر اُسے خشک اور بور لگے۔

اسکول کے زمانے میں

نتیجتاً وہ جماعت میں کچھ عرصہ بیٹھ کر لائبریری چلا جاتا اور وہاں مختلف کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نے اپنے شعبے کی مناسبت سے سیاسیات پر کئی کتب پڑھیں جن میں کارل مارکس اور دیگر کمیونسٹ مفکرین کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ انھی کتابوں کے باعث برنی کمیونزم اور سوشلزم میں دلچسپی لینے لگا۔ سہ پہر کے وقت مختلف جزوقتی ملازمتیں کرتے گزارتا۔ یوں اسے ٹیوشن فیس اور ذاتی اخراجات کی خاطر رقم مل جاتی۔ بڑا بھائی بھی کچھ مالی مدد کر دیتا۔

اس زمانے میں پروفیسر اور طلبہ کھل کر اپنے اپنے سیاسی، معاشی اور مذہبی نظریات پر بحث و مباحثہ کرتے تھے لیکن اختلافات نے کبھی فساد کا رخ اختیار نہیں کیا کیونکہ برداشت اور رواداری کا دور دورہ تھا۔ فریق مخالف کی رائے کا بھی احترام کیا جاتا۔ انھی مباحثوں کے ذریعے برنی سینڈرز سیاسی و معاشی نظریے، ''سوشل ڈیموکریسی'' کو پسند کرنے لگا۔ آگے بڑھنے سے پیشتر اس نظریے کی تشریح ہو جائے۔

دنیا میں رائج نظریات

سوشل ڈیموکریسی سوشلزم یا اشتراکیت کی ایک شاخ ہے۔ سوشلزم ایک قدیم نظریہ ہے۔ یہ ایک ریاست میں دولت پیدا کرنے والے تمام ذرائع حکومت کی ملکیت ہونے پر زور دیتا ہے۔ مقصد یہ کہ معاشرے میں عدل و انصاف جنم لے، دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور ترقی و خوشحالی کے ثمرات ہر شخص تک پہنچ سکیں۔ سوشلزم کے نظریات یونانی فلاسفر افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات میں بھی ملتے ہیں۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے نظریہ کمیونزم پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک مطلق العنان حکومت ہی ریاست میں سوشلزم قائم کر سکتی ہے۔ گویا اس نے سوشلزم کا زیادہ کٹر روپ پیش کر دیا۔ اس کے جواب میں ہی نظریہ سوشل ڈیموکریسی سامنے آیا۔ اس نظریے پر عمل پیرا لوگ جمہوریت کے ذریعے سوشلزم ایک ریاست میں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور وہ مطلق العنانیت یا آمریت پر یقین نہیں رکھتے۔

سوشلزم کے مدمقابل سرمایہ داری نظریہ ہے۔ اس نظریے کی بنیاد یورپ میں پڑی جب مہاجنوں اور پھر بینکوں نے جنم لیا۔ کمپنیاں ظہور پزیر ہوئیں اور صنعتکار سامنے آئے۔ اس نظریے کو برطانوی فلسفیوں ڈیوڈ ہیوم اور آدم اسمتھ نے معین شکل دی۔

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت پیدا کرنے والے تمام یا بیشتر ذرائع نجی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ حکومت اشیا کی پیداوار اور خرید و فروخت میں کم دخل دیتی ہے۔ اشیا کی قیمتیں طلب و رسد کے مطابق متعین ہوتی ہیں اور حکومت انھیں عموماً کنٹرول نہیں کرتی۔ ہر عملی نظام کی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی فوائد اور نقصانات، دونوں رکھتا ہے۔ فوائد یہ ہیں کہ آزاد معیشت سے نت نئی اشیا ایجاد ہوتی ہیں۔ صارفین مرضی کی شے خرید سکتے ہیں۔ فرد امیر بننے کی خاطر محنت کرتا ہے۔ تاہم اس نظام کے نقصانات بھی ان گنت ہیں مثلاً:

قومی وسائل پر چند کمپنیوں کی اجارہ داری ہو جانا، دولت کا مٹھی بھر افراد میں سمٹنا، امرا کا طاقتور ہونا، مادہ پرستی کا پھیلاؤ، ظالم صنعت کاروں کا مزدوروں پر ظلم، منافع خوری وغیرہ۔ سود، کاغذی کرنسی، بینک، ٹیکس لگانا، بین الاقوامی تجارت اور ملٹی نیشنل کمپنیاں سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اجزا ہیں۔

سوشلزم اور سرمایہ داری کے وسط میں اسلامی سیاسی و معاشی نظام آتا ہے جسے بیسویں صدی میں ''اسلامی سوشلزم'' کا نام مل چکا۔ اس نظام کا منبع قرآن و سنت ہیں۔ اسی نظام کی بنیاد پر رسول اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک فلاحی مملکت کی بنیاد رکھی۔ اس کی نمایاں ترین خصوصیت عدل و انصاف کی فراوانی تھی۔ امرا پر زکوۃ واجب کی گئی تاکہ ریاست میں غربا کی دیکھ بھال ہو سکے۔ خلافتِ راشدہ میں بھی یہی نظام جاری و ساری رہا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ ہر شہری کو سالانہ دس درہم بیت المال سے فراہم کرتے تھے جسے بعد ازاں بیس درہم کر دیا گیا۔

بیسویں صدی میں مسلمانانِ ہند کے عظیم زعما علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان اسی معاشرتی انصاف کا علم بلند کرنے والے معتدل اسلامی نظام کے حامی تھے۔ 26 مارچ 1948ء کو چاٹاگانگ میں قائداعظم نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''پاکستان کی بنیادیں معاشرتی انصاف اور اسلامی سوشلزم پر استوار ہوں گی جو مساوات اور بھائی چارے پر مبنی ہیں۔'' اسی طرح وزیراعظم لیاقت علی خان نے 25/اگست 1949ء کو ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''آج کل کئی ''ازموں'' کی باتیں ہوتی ہیں مگر ہمارے نزدیک صرف اسلامی سوشلزم قابل عمل ہے۔ اس نظریے کی رو سے پاکستان میں ہر شہری ایک جیسے، برابر حقوق رکھتا ہے اور اس کا حق ہے کہ اُسے خوراک، جائے رہائش، لباس، تعلیم اور طبی سہولیات میسر آئیں۔ جو ریاست شہری کو یہ سہولتیں نہیں دے سکتی، وہ کبھی ترقی نہیں کر پائے گی۔ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جو معاشی نظام پیش ہوا تھا، وہ آج بھی ہمارے لیے بہترین پروگرام ہے۔''

سوشلزم، سرمایہ داری اور اسلامی معاشی نظام میں دو اہم فرق ہیں۔ پہلا یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام میں امرا کو مراعات و سہولیات ملتی ہیں اور غریب پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظام انسانوں کو قدرتی صلاحیتوں، محنت یا تعلیم اور دیگر خصوصیات مدنظر رکھ کر تقسیم کرنے کے علاوہ تسلیم کرتا ہے کہ بعض انسان مالی حیثیت میں دوسروں سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں۔ سوشلزم ان خصوصیات کو مدنظر نہیں رکھتا، وہ تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ گویا گدھے اور گھوڑے میں کوئی فرق نہیں رہتا جو ایک غیر فطری امر ہے۔

دوسرا اہم فرق یہ کہ سرمایہ داری میں تمام مسائل کی جڑ قدرتی وسائل میں کمی اور پیداوار گھٹ جانا ہے۔ سوشلزم کے نام لیوا کہتے ہیں کہ جب سرمایہ دار مزدوروں اور غریبوں کا استحصال کرے، تب مسائل جنم لیتے ہیں مگر اسلامی معاشی و سیاسی نظام میں قرآن مجید کی رو سے مسائل کا منبع خود انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ ابراہیم آیت 33 تا 34 میں فرماتے ہیں:

''(ہم نے) تمہارے لیے سورج اور چاند مسخر کیے جو برابر چل رہے ہیں۔ اور تمہارے لیے رات دن مسخر کیے۔ اور تمھیں بہت کچھ منہ مانگا دیا اور اگر اللہ کی نعمتیں گننے لگو تو شمار نہیں کر سکو گے۔ بے شک آدمی بڑا ظالم اور ناشکرا ہے۔''

درج بالا آیات کی تفسیر یہ ہے کہ انسان ظلم اور ناشکری سے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی نفی کر دیتا ہے جو دنیا میں عدل و انصاف اور مساوات لاگو کرتے ہیں۔ وہ پھر گروہوں کے مابین اختلافات پیدا ہوتے اور قدرتی وسائل ضائع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی نکتہ نگاہ سے کرۂ ارض پر تمام مسائل انسان کے اپنے کرتوتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ لالچ ہوس چھوڑ کر خدائی احکامات پر عمل کرے، تو دنیا امن و محبت کا گہوارہ بن جائے۔

سرکاری تعصب کے خلاف دھرنا

آئیے اب دوبارہ نشوونما پاتے برنی سینڈرز کی طرف پلٹتے ہیں جسے سوشل ڈیموکریسی کا نظریہ بھا گیا۔ یعنی وہ عوام کو

یونیورسٹی میں احتجاجی طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے

ساتھ ملا کر سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیلی لانے کا خواب دیکھنے لگا۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ امریکی معاشرے میں دولت کی نامنصفانہ تقسیم ختم کر کے آمدن کو غریب اور نچلے طبقوں تک پہنچا دیا جائے۔ اپنا خواب پورا کرنے کی خاطر وہ ایک تنظیم، ینگ پیپلز سوشلسٹ لیگ کا رکن بن گیا۔ یہ سوشلسٹ پارٹی آف امریکا کی نوجوانوں کے لیے مخصوص تنظیم تھی۔

اس وقت شکاگو شہر کی روزمرہ زندگی میں سفید فام اور سیاہ فام کی طبقاتی تقسیم بہت نمایاں تھی۔ ہوٹلوں میں دونوں اقوام کے لیے باتھ روم الگ تھے اور نلکے بھی۔ بسوں میں سیاہ فام علیحدہ بیٹھتے۔ وہ الگ محلوں میں رہتے اور سفید فاموں کے علاقوں میں جانے سے گریز کرتے۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی میں طلبہ و طالبات کے ہوسٹل بھی اس نسلی تقسیم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ برنی سینڈرز اور اس کے ہمنوا سٹوڈنٹ لیڈر سمجھتے تھے کہ یہ نسلی تقسیم اخلاقی و قانونی لحاظ سے نامناسب ہے۔

جنوری 1962ء میں برنی سینڈرز نے دیگر طلبہ راہنماؤں کے ساتھ مل کر یونیورسٹی انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ تمام ہوسٹلوں میں سیاہ فام اور سفید فام طلبہ کے لیے مخصوص کمرے ختم کیے جائیں۔ مقصد یہ تھا کہ ہر طالب علم کسی بھی کمرے میں قیام کر سکے۔ یونیورسٹی نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔

جب مطالبہ پورا نہ ہوا تو طلبہ لیڈروں نے انوکھا قدم اُٹھایا۔ تقریباً 35 طلبہ وائس چانسلر (صدر یونیورسٹی) کے دفتر میں جا دھمکے اور وہاں دھرنا دے دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنا مطالبہ پورا ہونے تک وہیں بیٹھے رہیں گے۔ وہ وہاں بیٹھ کر تاش اور برج کھیلنے لگے۔ کھانا بھی کھایا گیا۔ پھر شعر کہنے اور کہانیاں سنانے کی محفل جمی۔ اس دوران طلبہ لیڈر وقتاً فوقتاً دھرنے والوں سے خطاب کر کے ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ برنی سینڈرز نے بھی جوشیلی تقریر کی اور ساتھیوں کو بتایا کہ وہ اپنے عزم و ہمت سے ایک غلط روایت کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

گیون فیڈن اس زمانے میں برنی سینڈرز کا ہم جماعت تھا۔ وہ بتاتا ہے: ''برنی نرم و مہذب لہجے میں بولتا تھا۔ وہ قیادت کرنے کے گر سیکھ رہا تھا مگر اس وقت کوئی کہتا کہ مستقبل میں برنی امریکی صدر بن سکتا ہے تو سبھی ہم جماعت ہنس پڑتے۔'' بہرحال طلبہ لیڈروں کا اصرار رنگ لایا اور یونیورسٹی انتظامیہ نے ہتھیار ڈال کر ہوسٹلوں میں نسلی امتیاز کی پالیسی ترک کر دی۔ اس فتح سے پہلی بار برنی سینڈرز کو احساس ہوا کہ عام لوگ اتحاد کر لیں، تو وہ طاقتور اسٹیبلشمنٹ کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔ اس واقعہ نے اس کے سیاسی کیریئر کا بھی آغاز کر دیا۔

ایک قابل قدر سوشلسٹ راہنما

برنی سینڈرز یوجین ڈیبز (Eugene Debs) کا پرستار تھا جس نے اوائل بیسویں صدی میں امریکی سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ ڈیبز امریکا ہی نہیں دنیا بھر کے مزدوروں، کسانوں اور کارکنوں کو جمع کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ متحد ہو کر فتح کے شادیانے بجا سکیں۔ برنی نے آگے چل کر یوجین

کی حیات و خدمات پر ایک دستاویزی فلم بھی بنائی۔ فلم میں برنی ناظرین کو بتاتا ہے: ''آپ سوشلسٹ پارٹی کی حمایت کریں۔ صرف یہی پارٹی غریب کو معاشی تحفظ دیتی اور اُسے دولت مندوں کے ظلم سے بچاتی ہے۔ معاشرے میں معاشی انصاف اس جماعت کی منزل ہے۔''

1979ء میں برنی سینڈرز نے درج بالا دستاویزی فلم کا نیا ورژن تیار کیا۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ امریکا کو کیسے بڑے بینک اور ملٹی نیشنل کارپوریشنیں کنٹرول کر رہی ہیں لیکن عام امریکی اس سچائی سے بے خبر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی حکومت کیونکر خفیہ طریقوں سے کام کرتی ہے۔ فلم میں بتایا جاتا ہے کہ یوگین نے امریکا میں کس طرح مزدور یونینوں کی بنیاد رکھی اور پہلی جنگ عظیم کی مخالفت کرنے کے باعث اُسے کیوں جیل بھجوا دیا گیا۔ برنی سینڈرز اپنے ہیرو کے متعلق کہتا ہے:

''یوگین ڈیبز اپنے زمانے میں مستقبل کا لیڈر تھا۔ وہ نہ صرف شاندار مقرر تھا بلکہ رحم دل انسان بھی۔ وہ آتے جاتے کسی بھی فقیر کو اپنی قمیص تک دے ڈالتا تھا۔ میرے نزدیک یوگین کے نظریات کا جوہر یہ تھا..... یہ نظام بنیادی طور پر غلط ہے کہ چند لوگوں کے پاس تو بے انتہا دولت ہو جبکہ سیکڑوں لوگ چند ڈالر بھی اپنے پاس نہیں رکھتے۔''

صدارتی الیکشن کی حالیہ انتخابی مہم میں ٹرمپ سے وابستہ زرد صحافت کرنے والے اخبارات نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ برنی سینڈرز کمیونسٹ ہے۔ اس پر برنی کے حامی دانشوروں نے امریکی عوام کو بتایا کہ وہ سوشل ڈیموکریسی پر یقین رکھتا ہے۔ اسکینڈے نیویا کے ممالک میں خصوصاً اسی فلاحی پر عمل پیرا سیاسی جماعتوں نے سویڈن، ڈنمارک، ناروے اور فن لینڈ میں فلاحی ریاست کے تصور کی بنیاد رکھی۔

یہ فلاحی ریاستیں مگر کبھی سرمایہ دارانہ ممالک کی طرح بینک، ملٹی نیشنل کارپوریشنیں، نجی ملکیت کے کاروبار، کارخانے اور اسپتال و اسکول رکھتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ امریکا و برطانیہ کی حکومتوں سے زیادہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم ہیں۔ یہ فلاحی ریاستیں مزدوروں اور عام لوگوں کو دیگر ممالک کے برعکس زیادہ مراعات و سہولیات دیتی ہیں۔ برنی سینڈرز امریکا میں بھی اسی قسم کا سیاسی و معاشی نظام رائج کرنے کا متمنی ہے۔ وہ بتاتا ہے:

''یوگین ڈیبز کا تصور یہ تھا کہ امریکا میں مزدور و کسان حکومت سنبھال لیں۔ وہ پھر عوام کی بھلائی کے اقدامات کریں۔ مثلاً یقینی بنائیں کہ ہر بچہ، امیر ہو غریب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ ہر شہری کو علاج کی مفت سہولت دستیاب ہو۔ وہ مناسب معیار زندگی کا حامل ہو اور اُسے غربت و بیروزگاری کی آفات چٹ نہ سکیں۔''

شادی اور دیسی زندگی

شکاگو یونیورسٹی کی انتظامیہ کو سیدھے راستے پر لانے کے بعد برنی کوشش کرنے لگا کہ اسکولوں میں بھی نسلی امتیاز کا چلن ختم کر دیا جائے۔ اس ضمن میں برنی نے دیگر طلبہ کے ساتھ مقامی حکومت کے خلاف مظاہرے کیے۔ ایک جلوس میں اس کی پولیس والوں سے تُو تُو میں میں ہوگئی۔ پولیس نے اُسے گرفتار کیا اور 25 ڈالر کا جرمانہ لگا دیا۔ برنی 1963ء میں مارٹن لوتھر کنگ کے تاریخی جلسے میں بھی شریک ہوا۔ اس میں کنگ نے اپنی عالمی شہرت یافتہ تقریر ''میں نے ایک خواب دیکھا ہے'' کی تھی۔

1963ء میں برنی کیریئر کے تیرکا نشانہ بن گیا۔ اُسے یونیورسٹی میں زیر تعلیم ایک انیس سالہ دوشیزہ، ڈیبرا اشٹنگ سے محبت ہوگئی۔ ڈیبرا ایک ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔ وہ بھی برنی کے مانند سماجی بہبود کی سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی تھی۔ یہ دونوں نوجوان مل کر دنیا کو بدلنے کے خواب دیکھنے اور تصوراتی منصوبے بنانے لگے۔ وہ کرۂ ارض سے ظلم و ناانصافی کا خاتمہ چاہتے تھے۔

1964ء کے وسط میں برنی اور ڈیبرا نے گریجوایشن کر لی۔ دونوں کی خواہش تھی کہ شہر کی تیز رفتار اور بھیڑ بھڑ کے والی زندگی چھوڑ کر کسی دیہی علاقے میں شادی کر کے جا بسیں۔ یہی وجہ ہے، انھوں نے اپنی جمع پونجی ملائی اور ریاست ورماؤنٹ کے ایک قصبے میں ڈھائی ہزار ڈالر سے 80 ایکڑ رقبے پر محیط ایک قطعہ زمین خرید لیا۔ وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا گھر بھی بنا ہوا تھا جس میں بجلی نہیں تھی۔ ستمبر 1964ء میں برنی اور ڈیبرا کی شادی ہوئی اور جوڑا اپنے نئے گھر چلا آیا۔

قصبے میں برنی کو ایک مختلف زندگی سے واسطہ پڑا۔ وہاں علم و دانش والے لوگ عنقا تھے۔ لوگوں کی اکثریت نچلے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کھیتوں میں کام کرتے اور اپنی ضرورت کا اناج اُگا لیتے۔ ان کے درمیان اُٹھ بیٹھ کر برنی ان مسائل سے آگاہ ہوا جن سے امریکی دیہاتی نبرد آزما تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ ایک مقامی غیر سرکاری تنظیم سے وابستہ ہوگیا جو کسانوں اور مزدوروں کے مختلف کام انجام دیتی تھی۔ تنظیم سے اسے گزارے لائق تنخواہ ملنے لگی۔

ڈیبرا مگر جلد ہی قصباتی زندگی سے بور ہوگئی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، اسی لیے وہ زیادہ عرصہ انتہائی سادہ زندگی نہیں گزار سکی۔ برنی کے پاس اکثر اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ اسے کوئی شے دلوا سکے۔ برنی کو مادی اشیا سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ معمولی قمیص پتلون پہنتا تھا اور بس اتنا کھانا کھاتا کہ بھوک مٹ جائے۔ اس کے اخراجات بہت کم تھے۔ مگر ڈیبرا ایسی راہبانہ زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکی۔ لہٰذا اس نے اٹھارہ ماہ بعد ہی طلاق لے لی اور واپس اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ تاہم دونوں سابق میاں بیوی کے مابین تعلقات آج بھی خوشگوار ہیں۔

برنی بڑھئی بن گیا

طلاق کے بعد برنی مختلف علاقوں میں آنے جانے لگا۔ کبھی وہ نیویارک پہنچ جاتا اور وہاں تین چار ماہ قیام کرتا۔ پھر ورماؤنٹ کے کسی قصبے میں ڈیرے ڈال دیتا۔ یوں وہ ایک سیلانی بن گیا جو نگر نگر گھومنے لگا۔ رقم کمانے کی خاطر اس نے مختلف کام کیے۔ کبھی اسکول میں اُستاد بن گیا۔ کبھی واقف کاروں کے ساتھ بڑھئی بن بیٹھا۔ غیر سرکاری تنظیموں سے بھی منسلک رہا۔ یوں اس نے اگلے چار پانچ سال میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لیا۔

اس دور آوارگی کے دوران ہی برنی سے ایک گناہ عظیم بھی سرزد ہوگیا۔ نیویارک میں ایک لڑکی، سوزین نامی اس کی واقف کار بن گئی۔ دونوں ایک ساتھ بھی رہے۔ اسی ساتھ کے دوران سوزین حاملہ ہوگئی۔ اس نے مارچ 1969ء میں ایک ناجائز بچے، ایوی سینڈرز کو جنم دیا۔

امریکا کے آزاد معاشرے میں لڑکے لڑکیاں شادی کیے بغیر اکٹھے رہتے ہیں مگر آج بھی مہذب اور تعلیم یافتہ امریکی اس روش کو اخلاقی و مذہبی لحاظ سے بُرا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ناجائز بچے کا باپ ہونا برنی سینڈرز کے دامن پر ایسا بدنما داغ ہے جسے وہ ساری عمر نہیں دھو سکتا۔ برنی نے بہرحال ماں اور بچے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا اور انھیں خرچہ دینے کی ذمہ داری اٹھالی۔ یوں اس نے اپنی فاش غلطی کا کچھ مداوا کر دیا۔ ورنہ اس کی سیلانی روش دیکھتے ہوئے بعید نہیں تھا کہ برنی انھیں لاوارث چھوڑ دیتا مگر وہ ذمہ دار باپ ثابت ہوا۔

زندگی اب تک لشتم پشتم گزر رہی تھی لیکن بیٹے کی پیدائش کے بعد برنی کے کاندھوں پر اس کی پرورش کا بوجھ آن پڑا۔

یہی وجہ ہے، اب برنی نے کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ کرلیا جس سے نہ صرف وہ اپنے آدرش اور مقاصد زندگی پورے کر سکے بلکہ اُسے کچھ آمدن بھی ہوجائے۔ چنانچہ تاریخ، شخصیات، سماجیات اور عمرانیات کے موضوعات پر اس نے دستاویزی فلمیں بنانے کا کاروبار شروع کر دیا۔ یہ تیس منٹ سے ایک گھنٹے پر محیط ہوتیں جنھیں وہ اسکول کالجوں میں فروخت کر دیتا۔

یہ ایک انوکھا کاروبار تھا مگر اس سے برنی کو اتنی آمدن ضرور ہوجاتی کہ وہ اپنا اور بیٹے کا ماہانہ خرچ برداشت کر سکے۔ حقیقتاً اس کا اپنا خرچہ تو بہت کم تھا۔ بیٹے کے اخراجات زیادہ تھے۔ 1970ء میں برنی ریاست ورماؤنٹ کے صدر مقام، مونٹ پیلٹر میں رہنے لگا۔ وہاں اس نے ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا۔ برنی اکثر قلاش رہتا۔ اسی لیے وہ بروقت بجلی اور پانی کے بل ادا نہ کر پاتا۔ جب فلیٹ کی بجلی کٹ جاتی تو وہ پڑوسی سے بذریعہ تار بجلی لے کر کام چلاتا۔

سیاست میں داخلہ

رفتہ رفتہ برنی اخبارات و رسائل میں مضامین لکھنے لگا۔ ان کی اشاعت سے رقم آنے لگی تو اس کا مالی بوجھ کچھ کم ہوا۔ 1971ء میں وہ سوشلسٹ نظریات رکھنے والی سیاسی جماعت، لبرٹی یونین پارٹی کا رکن بن گیا۔ اپنی صلاحیتوں کے سبب وہ جلد جانا پہچانا لیڈر بن بیٹھا۔ حتیٰ کہ پارٹی نے اسے ریاست سے سینٹر کا الیکشن لڑنے کی خاطر چن لیا۔ برنی نے اسی پارٹی کے پلیٹ فارم سے گورنر ورماؤنٹ کا انتخاب بھی لڑا مگر ناکام رہا۔

لبرٹی یونین پارٹی ویت نام جنگ کی مخالفت کے زمانے میں بنی تھی۔ جب جنگ ختم ہوگئی تو اس کا وجود بھی دھیرے دھیرے ختم ہوگیا۔ یہی وجہ ہے، 1977ء میں آخرکار برنی نے بھی استعفا دے دیا۔ وہ پھر پیٹ پالنے اور بیٹے کے اخراجات کی خاطر مختلف ملازمتیں کرنے لگا۔ قلم کاری کا پیشہ

بیٹے کے ساتھ ایک محفل میں

بھی جاری رہا۔ اس کے دوست بتاتے ہیں کہ وہ تب اکثر تہی دست رہتا۔

1980ء میں برنی سینڈرز نے ریاست ورماؤنٹ کے سب سے بڑے شہر، برلنگٹن کو اپنا نیا ٹھکانا بنالیا۔ تب شہر میں اڑتیس ہزار افراد آباد تھے۔ چار ہزار امرا نے اپنے عالیشان گھر ایک پوش علاقے میں بنا رکھے تھے۔ جبکہ نچلے اور متوسط طبقوں کے شہری بقیہ علاقوں میں رہتے جہاں شہری سہولیات کی کمی تھی۔ خاص طور پر سڑکوں پر برف پڑتی تو کئی دن صاف نہ ہوتی۔ شہریوں کو اپنی مدد آپ کے تحت سڑکیں صاف کرنا پڑتیں۔

دراصل شہر کی بلدیاتی حکومت پچھلے بیس برس سے ڈیموکریٹک لیڈروں نے سنبھال رکھی تھی۔ جبکہ گورڈن پیکونٹ نامی ڈیموکریٹک راہنما تیرہ برس سے میئر چلا آرہا تھا۔ وہ لکیر کا فقیر جیسا مزاج رکھتا تھا اور اس نے کبھی شہری معاملات درست کرنے کی کوششیں نہیں کیں۔ لہٰذا بلدیاتی کارکن امرا کے علاقے میں تو مختلف سرکاری کام کر دیتے لیکن غریبوں کے علاقوں میں کام طویل عرصہ لٹکے رہتے۔ اس صورت حال سے عام شہری پریشان تھے۔

برلنگٹن میں پروفیسر رچرڈ شوگرمان برنی سینڈرز کا دوست بن گیا۔ وہ شہر میں واقع یونیورسٹی آف ورماؤنٹ میں عالمی

مذاہب کا پروفیسر تھا۔ اسے یہ لاابالی سا مگر سنجیدہ انتالیس سالہ جوان پسند آیا جو امریکی حکمرانوں کا سخت مخالف تھا۔ وہ دولت مند امریکیوں کو تمام مسائل کی جڑ سمجھتا اور انھیں شدید تنقید کا نشانہ بناتا تھا۔ پروفیسر رچرڈ نے برنی کو مشورہ دیا کہ اگر وہ عام آدمی کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتا ہے تو میئر کا الیکشن لڑے۔ میئر بن کر وہ نچلے و متوسط طبقات کا سہارا بن سکتا ہے۔

میئر کے الیکشن کی جنگ

برنی کو پروفیسر کا مشورہ قابل عمل لگا۔ وہ جان چکا تھا کہ شہر میں بلدیاتی حکومت کو نااہلی و سستی کے جراثیم چمٹ چکے۔ نیز وہ صرف طاقتور اور بااثر افراد پر دھیان دیتی تھی۔ یہ صورت حال مدنظر رکھ کر ہی 1981ء کے موسم سرما میں برنی میئر برلنگٹن کا الیکشن لڑنے میدان عمل میں اتر گیا۔

حسب روایات برنی کے پاس انتخابی مہم چلانے کی خاطر رقم نہ تھی۔ اس نے اپنے منشور پر مبنی پمفلٹ چھپوائے اور انھیں لے کر ہر گھر جانے لگا۔ اس نے اپنی مہم نچلے و متوسط طبقات کے علاقوں میں ہی چلائی جہاں لوگ بلدیاتی حکومت کے لیڈروں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ ووٹروں کو فخر سے بتاتا: ''میری کل جائیداد گیارہ سو ڈالر ہے۔ یہ ایک پندرہ سالہ پرانی کار اور سیونگ اکاؤنٹ پر مشتمل ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں اور نہ ہی کہیں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔'' (برنی نے قصبے والا گھر فروخت کر دیا تھا)

برنی جہاں بھی جاتا، لوگ اس کی باتیں توجہ سے سنتے کیونکہ وہ انھی کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ پیسے کے معاملے میں وہ سب سے گیا گزرا تھا۔ وہ لوگوں کو بتاتا:

''امریکا میں دولت بہت ہے۔ ہم چاہیں تو ہر شخص کو مفت تعلیم مل جائے۔ مفت علاج ہو۔ کرائے کے سستے گھر میسر آئیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ دولت کا بیشتر حصہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہے۔'' یعنی وہی ارتکاز دولت جس کی دین اسلام میں سخت ممانعت آئی ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ میئر کا الیکشن لڑنے سے قبل برنی سینڈرز سیاست سے مایوس ہو چکا تھا۔ برنی کا خیال تھا کہ اس شعبے میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ تاہم پروفیسر رچرڈ کے اصرار پر اس نے آخری بار سیاسی میدان میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ الیکشن بھی ہار گیا تو اُسے چھوٹی موٹی غیر سیاسی ملازمتیں کر کے ہی زندگی بِتانی ہوگی۔ اسی لیے الیکشن جیتنے کی خاطر برنی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور انتخابی مہم میں اپنی ساری توانائی صرف کردی۔

ڈیموکریٹک لیڈروں کو یقین تھا کہ برنی کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ ''وہ ہر وقت راک فیلروں کو گالیاں دیتا رہتا ہے اور اسے کوئی ٹھوس کام کرنا نہیں آتا۔'' مگر زمینی حقائق مختلف تھے جنھیں ڈرائنگ روم کی سیاست کرنے والے ڈیموکریٹک لیڈر نہیں پہچان سکے۔ عام لوگوں کی اکثریت کو برنی کی صورت اپنا مسیحا نظر آ گیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اُسے میئر بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس زمانے میں ٹونی پومرلیو نامی ایک دولت مند ریاست کا ''پراپرٹی ٹائیکون'' تھا۔ وہ برلنگٹن میں وسیع و عریض سرکاری زمین خرید کر وہاں عالیشان ولا، ہوٹل، سینما اور دفاتر بنانا چاہتا تھا۔ برنی سینڈرز اس منصوبے کی مخالفت کرنے لگا۔ برنی کا کہنا تھا کہ منصوبے کے ذریعے شہر دو حصوں میں تقسیم ہوجائے گا۔ ایک حصے میں امرا رہیں گے اور دوسرے میں غربا۔ برنی نے نعرہ لگایا: ''برلنگٹن برائے فروخت نہیں۔'' اس کا دوسرا انتخابی نعرہ تھا: ''تبدیلی کا وقت آ پہنچا۔''

ووٹوں سے کامیابی

ڈیموکریٹک لیڈر اس وقت چوکنا ہوئے جب شہر کی مختلف سماجی تنظیموں نے برنی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ دھیرے دھیرے سرکاری ملازمین کی تنظیمیں بھی برنی کی

کامیابی کا جشن مناتے ہوئے

چھتری تلے آ گئیں اور اس کی قوت بڑھتی چلی گئی۔ جب پولیس یونین نے برنی کو اپنا نمائندہ بنایا تو سبھی شہریوں کو یہی پیغام گیا کہ وہ خطرناک آدمی نہیں۔

ڈیموکریٹک لیڈروں نے شہر کا اقتدار اپنے ہاتھوں سے جاتا دیکھا تو وہ چونک کر بیدار ہوئے۔ انھوں نے پھر اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے اور شہریوں کو تحائف دے کر اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے لوگوں سے وعدہ کیا کہ اب اقتدار سنبھال کر وہ سبھی کے کام کریں گے۔ ظاہر ہے، شہر کئی برس سے ڈیموکریٹک پارٹی کے قبضے میں تھا۔ انھیں بلدیہ عظمیٰ سے نکال باہر کرنا آسان کام نہیں تھا۔

ڈیموکریٹک لیڈروں کے متحرک ہونے سے الیکشن میں کانٹے دار مقابلہ ہوا۔ کبھی گورڈن کے ووٹ زیادہ ہو جاتے تو کبھی برنی فتح یاب دکھائی دینے لگتا۔ برنی کے حمایتیوں کو یقین تھا کہ چالاک و عیار ڈیموکریٹک لیڈر جیت کی خاطر ناجائز طریقے بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ بہرحال سانس بند کر دینے والے لمحات کے بعد اعلان ہوا کہ برنی 12 ووٹوں سے جیت گیا ہے۔ فوراً ہی اس کے حمایتی خوشی سے رقص کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو مبارک بادیں دی جانے لگیں۔

شکست کی خبر مگر ڈیموکریٹک لیڈروں پر بجلی بن کر گری۔ انھوں نے نتیجتاً عدالت میں چیلنج کر دیا۔ جج نے ووٹوں کی گنتی دوبارہ کرنے کا حکم دیا۔ اس بار بھی برنی 10 ووٹوں سے جیت گیا۔ یوں ایک غریب و مسکین آزاد امیدوار نے عوامی ووٹوں کی قوت سے ڈیموکریٹک لیڈروں کو ہار کا مزہ چکھا دیا جو کہیں زیادہ دولت و اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ آخر وہ انہونی ہو گئی جس کا طاقتور گروہ نے گمان بھی نہ کیا تھا۔

انتخابی وعدے پورے ہوئے

لیکن اصل مقابلہ تو اب شروع ہوا تھا۔ بلدیہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے کونسلر زیادہ تھے۔ باقی کونسلر امریکا کی دوسری بڑی سیاسی جماعت، ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں آزاد میئر، برنی سینڈرز ان کے درمیان سینڈوچ بن گیا۔ برنی کوئی بھی عوام دوست منصوبہ پیش کرتا، تو کونسلر اس کی راہ میں قانونی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے۔ اس روش سے برنی بہت پریشان ہوا۔ کبھی کبھی تو وہ اتنا زچ آ جاتا کہ اس وقت کو کوسنے لگتا جب اس نے میئر کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میئر بن کر اگرچہ اُسے پتا چلا کہ سالانہ تقریباً 34 ہزار ڈالر بطور تنخواہ ملیں گے تو برنی کو خاصی حیرت ہوئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سال میں اتنی زیادہ رقم کما رہا تھا۔ تاہم رقم کی بڑھوتری اس کے رہن سہن میں زیادہ تبدیلی نہیں لا سکی۔ دراصل اُسے مادی اشیا سے رغبت بہت کم تھی۔ جو ملتا، کھا لیتا۔ لباس کوئی بھی ملا، وہی پہن لیا۔ اس کی زندگی کا مقصد دوسرے انسانوں کے کام آنا تھا اور اپنا یہی مشن پورا کرنے وہ میئر بنا تھا۔

انھی دنوں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک سپاہی تبادلہ ہو کر برلنگٹن آیا۔ اس کی ڈیوٹی بلدیہ کی عمارت کے آس پاس

لگی۔ پہلے دن اس نے دیکھا کہ جہاں میئر کی کار کھڑی ہوتی ہے، وہاں ایک ٹوٹی پھوٹی فوکسی گاڑی کھڑی ہے۔ اس کی پچھلی بتی ٹوٹ چکی تھی۔ سطح پر بھی جا بجا ڈینٹ پڑے تھے۔ وہ سمجھا کہ کوئی سرپھرا اپنی پھٹیچر گاڑی میئر کی جگہ کھڑی کر گیا ہے۔ اس نے ڈرائیور کا چالان کر دیا۔

جب برنی سینڈرز کو یہ بات معلوم ہوئی، تو وہ بہت ہنسا۔ سپاہی بھی حقیقت جان کر کھسیانا ہو گیا۔ تبھی دوست احباب نے برنی پر زور دیا کہ وہ کوئی اچھی سی گاڑی خرید لے۔ چند ماہ بعد برنی کے پاس رقم جمع ہوئی تو اس نے نسبتاً نئے ماڈل کی کار خرید لی۔ تاہم وہ بعد میں اپنی محبوبہ، فوکسی کو یاد کر کے پچھتاتا رہا۔

مخالفین پر برسنے کے باوجود عملی طور پر برنی افہام و تفہیم سے دوسروں کے ساتھ چلنے والا آدمی تھا۔ یہ خاصیت میئر بن کر اس کے کام آئی۔ برنی نے جلد ریپبلکن پارٹی کے کونسلروں کو اپنا دوست بنا لیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے بعض کونسلر بھی اس کے ہمنوا بن گئے۔ یوں ان ساتھیوں کی بدولت وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے لگا اور بلدیہ کا کاروبار چل پڑا۔

برنی نے وہ تمام وعدے پورے کیے جو اس نے اہل شہر سے کیے تھے۔ سڑکیں اب برف باری کے بعد فوراً صاف کر دی جاتیں۔ نچلے و متوسط علاقوں کے مسائل بھی جلد حل ہو جاتے۔ برنی نے غربا کے لیے نئے فلیٹ بنائے۔ یہی نہیں، اس نے برلنگٹن کے کاروباری طبقے اور صنعتکاروں کو بھی اپنا دوست بنا لیا۔ ان کے تعاون سے برنی نے کاروبار دوست پالیسیاں بنائیں جن سے شہر کو طویل المعیاد فوائد پہنچے۔ دراصل برنی کو احساس ہو گیا کہ تاجروں اور کاروباریوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے کیونکہ بلدیہ کو انھی سے ٹیکسوں کی رقم ملتی تھی۔ یہ رقم پھر شہری سرگرمیاں انجام دینے میں کام آتی۔

پہلے سال برنی کو اپنی ذمے داریوں سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈیموکریٹک کونسلروں نے اس کی تقرریاں روک دیں۔ حتیٰ کہ کسی کو برنی کا سیکرٹری ہی بننے نہیں دیا۔ اس کے دفتر کا عملہ بھی پورا نہ تھا۔

ان مسائل کے باوجود برنی نے ہمت نہیں ہاری اور طاقتور سیاسی مافیا کے سامنے ڈٹ گیا۔ اب وہ انھیں دکھانا چاہتا تھا کہ سوشل ڈیموکریسی کے نظریات پر عمل پیرا ہو کر عوام دوست حکومت تشکیل دینا ممکن ہے۔ عوام کا تعاون بھی برنی کے ساتھ شامل رہا۔ یوں تمام تر مشکلیں ہوتے ہوئے بھی برنی اپنے کام کرنے لگا۔

شہری تعمیر و ترقی

اہل شہر کی امنگوں پر پورا اُترنے کے باعث 1983ء میں برنی میئر کا اگلا الیکشن آسانی سے جیت گیا۔ اس کا کہنا تھا:

''ہمارا یہ چھوٹا سا شہر سرمایہ دارانہ نظام کے پھیلائے گھپ اندھیرے میں اُمید کی کرن ثابت ہو سکتا ہے۔'' اسی سال برنی نے برلنگٹن میں قسطوں پر ایک پانچ سو گز والا مکان خرید لیا مگر یہ نئی رہائش گاہ بھی ساز و سامان سے محروم تھی۔ وہاں بس چند کرسیاں پڑی دکھائی دیتیں اور چند گدے۔ باقی سارا گھر سامان آرائش سے خالی تھا۔ اس سادگی کے باوجود بعض سوشلسٹ کارکنوں نے گھر خریدنے پر برنی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ برنی مال و دولت کی چکاچوند سے متاثر ہو چکا۔

انھی دنوں برنی نے رسالے میں مضمون لکھ کر اپنا سیاسی نظریہ واضح کیا۔ وہ لکھتا ہے:

''سوشلسٹ ہونے کے باوجود میں جمہوریت پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ ہمارے معاشرے میں عوام کو ہر فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے اور یہ کہ حکومت کی ساری آمدن عوام میں تقسیم ہو جائے۔ ہر کوئی خوشحال ہو اور دولت کی تقسیم منصفانہ انداز میں انجام پائے۔ امریکی عوام کی اکثریت دن رات محنت کرتی ہے مگر بدلے میں اُسے بہت کم ملتا ہے۔ میں انھی لوگوں کا نمائندہ بن کر حکومت میں آنا اور

انھیں زیادہ دینا چاہتا ہوں۔''

حیران کن طور پر برنی ایک عمدہ معاشی منتظم ثابت ہوا۔ اس نے بلدیہ کے اخراجات کم کر دیے۔ شہریوں پر ٹیکس بڑھائے بغیر سڑکوں کی مرمت کرائی۔ پیدل راہیں درست کیں۔ باغات کو حسین و جمیل بنایا۔ غرض بلدیہ کی تمام سرگرمیاں بہ احسن وخوبی ادا کیں۔ اس امر نے اہل شہر کے دل جیت لیے۔ لہٰذا ہر الیکشن میں برنی کو زیادہ ووٹ پڑ جاتے۔ برنی خوشی سے کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے برلنگٹن کے بہت سے لوگ سیاست میں دلچسپی لینے اور ووٹ ڈالنے لگے۔

برنی نے شہر کی معاشی ترقی کے لیے بھی کئی منصوبے بنائے۔ نامور کاروباریوں اور تاجروں پر مشتمل ایک ٹاسک فورس بنائی جس نے مختلف معاشی منصوبے بنا کر دیے۔ غرض شہری حکومت سنبھال کر برنی اس میں واقعی انقلابی تبدیلیاں لے آیا۔ اس نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا۔ 1985ء تک برنی کا شمار امریکا کے ''بیس بہترین میئروں'' میں کیا جانے لگا۔ اس کے کارناموں کی دھوم مچ گئی اور وہ سیاست میں جانا پہچانا نام بن گیا۔

ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ثابت کر دکھایا، اگر نیت نیک ہو اور کام خلوص سے کیا جائے تو اشتراکی نظریات کو عوام دوست عملی اقدامات کا روپ دینا ممکن ہے۔ مشہور امریکی رسالے، رولنگ سٹون نے برنی کو ''سبز پہاڑوں کا سرخ میئر'' قرار دیا۔ برنی کی ایک اور خاصیت یہ تھی کہ اس نے باصلاحیت، محنتی اور دیانتدار افراد کی ٹیم تیار کر لی۔ اس ٹیم کے ذریعے اُسے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بہت مدد ملی۔ اس ٹیم میں برلنگٹن کی ایک نمایاں کاروباری شخصیت، بروس لیفر بھی شامل تھا۔ وہ چند کارخانوں کا مالک تھا۔ بروس کہتا ہے:

''حکومت صاف ستھری اور ایماندار ہو تو بہت فرق پڑتا ہے۔ تب ہر کوئی اپنے حصے کے ٹیکس دیتا ہے۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا دیا گیا ہر پیسا موثر انداز میں خرچ ہوگا۔ پھر بطور میئر برنی پر سب کو اعتماد تھا۔ اسی لیے اس کی ٹیم کا ہر رکن اپنے کام ذمے داری سے انجام دیتا۔ برنی کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ انتہا پسند نہیں بلکہ ایک اعتدال پسند راہنما ہے۔ ایسا راہنما جسے بچے بھی بے تکلفی سے انکل برنی کہہ سکتے ہیں۔''

دوسری شادی اور رکن ایوانِ نمائندگان

چھے سال میئر رہنے کے بعد برنی اب آگے بڑھنا چاہتا تھا تاکہ زیادہ بلند عہدے پر پہنچ کر اپنے فلاحی پروگرام کو وسعت دے سکے۔ 1986ء میں اس نے ورماؤنٹ کی گورنری کا الیکشن لڑا مگر ناکام رہا۔ 1988ء میں امریکی قومی اسمبلی (ایوان نمائندگان) کے الیکشن میں حصہ لیا۔ اس نے ڈیموکریٹک امیدوار کو پچھاڑ دیا۔ ریپبلکن امیدوار صرف ساڑھے تین فیصد زیادہ ووٹ لے کر ہی اس سے جیت سکا۔ اس الیکشن نے ثابت کر دیا کہ ریاست ورماؤنٹ میں برنی ایک نمایاں سیاسی طاقت بن چکا۔

1988ء ہی میں برنی نے ایک طلاق یافتہ اور تین بچوں کی ماں، جیسن اومیرا ڈرسکول سے شادی کر لی۔ وہ بلدیہ کے ایک دفتر میں کام کرتی تھی۔ 1989ء میں برنی نے ہارورڈ یونیورسٹی اور ہملٹن کالج، نیویارک میں سیاسیات اور عمرانیات کے موضوعات پر لیکچر دیے۔ اُسے جو آمدن ہوئی، برنی نے اس سے ایک نیا گھر قسطوں پر خرید لیا۔ اسی سال برنی نے میئر شپ کو خیرباد کہہ ڈالا۔ اب وہ ایوان نمائندگان کا الیکشن جیتنے کی خاطر اپنی توانائی مرتکز کرنا چاہتا تھا۔

1990ء میں ایوان نمائندگان کا نیا الیکشن ہوا۔ اس نے بھرپور انداز میں انتخابی مہم چلائی سادگی جس کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ اکثر ایسے سویٹر زیب تن کیے ہوتا جس کے بٹن ٹوٹے ہوتے۔ پاؤں میں واجبی سا جوتا ہوتا مگر تقریر کرتے ہوئے وہ کارپوریٹ امریکا پر برس پڑتا۔ اُسے علم تھا کہ جیت کی

خاطر طاقتور اور بارسوخ شخصیات کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے لیکن برنی نے صرف عوام سے مدد مانگی۔ وہ ان کا نمائندہ بن کر اپنی قومی اسمبلی میں جانا چاہتا تھا۔

ریاست کے عوام نے بھی اُسے مایوس نہیں کیا اور برنی کل ووٹوں میں سے 59 فیصد ووٹ لے کر ایوان نمائندگان میں پہنچ گیا۔ اس کا مدمقابل، سابق ریاستی گورنر اور ریپبلکن پارٹی کا امیدوار، پیٹر اسمتھ صرف 39 فیصد ووٹ لے سکا۔ یوں ایک غریب مہاجر کا بیٹا اور مفلسی کی زندگی گزارنے والا سماجی وسیاسی راہنما دنیا کی اکلوتی سپر پاور کے حکومتی ایوانوں میں پہنچ گیا۔ برنی سینڈرز امریکی سرمایہ دارانہ نظام پر جتنی مرضی تنقید کرے، مگر یہ امریکا کا جمہوری نظام ہی تھا جس نے اُسے ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے اور وہ تہی دامن ہوتے ہوئے بھی ایوان نمائندگان پہنچنے میں کامیاب رہا۔

برنی کی کامیابی اس لحاظ سے بھی منفرد تھی کہ وہ پچھلے چالیس برس میں منتخب ہونے والا پہلا آزاد رکن اسمبلی تھا۔ آخری بار ریاست اوہایو سے فریزر ریس نامی راہنما 1950ء میں بطور آزاد امیدوار ایوان نمائندگان کا حصہ بنا تھا۔ اب برنی کی سالانہ آمدن بھی بڑھ گئی۔ بطور رکن وہ سوا لاکھ ڈالر تنخواہ پانے لگا۔ یوں برنی کا معیار زندگی بلند ہو گیا اور وہ پہلے کی طرح دو کوڑی کا محتاج نہیں رہا۔ پہلے تو اسے بجلی کا بل بھرنے کے لیے بھی مارا ماری کرنا پڑتی تھی اور جب بل ادا نہ ہوتا تو بجلی کٹ جاتی۔

2007ء تک برنی ریاست ورماؤنٹ سے ایوان نمائندگان کی نشست جیتتا رہا۔ اس دوران برنی نے قانون سازی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ بطور آزاد امیدوار وہ دونوں بڑی پارٹیوں پر تنقید کرتا تاہم بیشتر مواقع پر وہ ڈیموکریٹک پارٹی کا ہمنوا بن جاتا۔ نظریاتی طور پر یہ پارٹی برنی کے زیادہ قریب تھی۔ اسی دوران مخالفین کی کوشش رہی کہ وہ برنی کے خلاف کوئی اسکینڈل کھڑا کر سکیں۔

انھوں نے برنی کی پہلی بیگم اور محبوبہ (سوزین) سے بھی رابطہ کیا جو اب شادی شدہ تھیں۔ مگر انھوں نے یہی جواب دیا کہ برنی جینٹلمین ہے اور ہمیں اس سے کوئی شکایت نہیں۔ یہی نہیں، دونوں خواتین نے میڈیا میں برنی کے حق میں بیانات دے ڈالے۔ یوں برنی کے مخالفین کو یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ اس کی نجی زندگی پر کیچڑ اچھال سکیں۔ برنی کو ویسے بھی امریکی میڈیا سے شکایت ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود سے منسلک موضوعات نمایاں نہیں کرتا جبکہ لوگوں کی نجی زندگی میں جھانک کر جھوٹی سچی باتوں پر اسکینڈل کھڑے کر لیتا ہے۔

سینٹ میں آمد

برنی سینڈرز افغانستان اور عراق پر حملے کے خلاف تھا۔ 2006ء میں وہ ورماؤنٹ سے سینٹر بن گیا۔ اُسے ڈیموکریٹک پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ تاہم امریکی حکومت کے طاقتور ترین ادارے میں پہنچ کر اس نے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی۔ سینٹر بن کر برنی نے ترقی و کامرانی کا ایک اور درجہ پالیا۔ اس کی سالانہ تنخواہ بھی ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ڈالر ہو گئی۔ تاہم وہ سینٹ میں غریب ترین سینٹر تھا۔

سینٹر بن کر برنی نے مختلف قوانین بنانے میں متحرک کردار ادا کیا۔ مثلاً اس نے ان درآمدات پر پابندی لگوا دی جن پر شبہ تھا کہ ان کی تیاری میں چائلڈ لیبر استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح کمیونٹی ہیلتھ سینٹروں کے لیے حکومت سے دس کروڑ ڈالر کی امداد منظور کرائی۔ 2010ء میں برنی نے ٹیکس بڑھانے کے ایک بل کے خلاف ''ساڑھے آٹھ گھنٹے'' تقریر کی اور خطاب کا نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس تقریر نے برنی کو پورے امریکا میں مشہور کر دیا۔ تقریر میں برنی نے نچلے و متوسط طبقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے امرائے امریکا کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

برنی سینڈرز 2007ء سے سینٹ کا انتخاب جیت رہا ہے۔ جون 2017ء میں امریکی سینٹروں نے ایران اور روس

پر پابندیاں لگانے کی خاطر ایک بل پیش کیا۔ سینٹ میں صرف برنی اور رینڈ پال نے اس کی مخالفت کی۔ برنی ایرانی ایٹمی معاہدہ ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ 2018ء میں اس نے یہ بل پیش کیا کہ امریکا کو یمن میں جاری سعودی جنگ کی حمایت ترک کر دینی چاہیے۔ یہ بل پہلے سینٹ اور پھر ایوان نمائندگان سے بھی منظور ہو گیا۔ تاہم صدر ٹرمپ نے اسے ویٹو کر دیا۔

2015ء میں اگلے صدارتی الیکشن میں ڈیموکریٹک پارٹی کا نمائندہ بننے کی خاطر کئی امیدوار آپس میں برسرِ پیکار ہوئے۔ ان میں ہیلری کلنٹن اور برنی سینڈرز سب سے نمایاں تھے۔ برنی نے حسبِ دستور عوام کی مدد سے اپنی انتخابی مہم چلائی۔ انھی سے چندے لیے اور امرا سے ایک ڈالر بھی لینے سے انکار کر دیا۔ برنی کو نچلے اور متوسط طبقوں میں بہت پذیرائی ملی لیکن ریاستی الیکشنوں میں برنی مطلوبہ ڈیلی گیٹس حاصل نہیں کر سکا۔ اس باعث برنی نے اپنی انتخابی مہم روک دی۔

مسلمانوں کا پسندیدہ امیدوار

فروری 2019ء میں برنی نے اعلان کیا کہ وہ الیکشن 2020ء کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے پھر نمائندہ بننے کی سعی کرے گا۔ اس بار برنی نے اپنی انتخابی مہم وسیع پیمانے پر چلائی۔ سوشل میڈیا کی مدد لی اور انتخابی مہم چلانے کی خاطر ٹیم بنائی۔ اس نے پاکستانی مہاجرین کی اولاد، فیض شاکر کو کیمپین منیجر بنایا۔ یوں فیض شاکر کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ ایک اہم امریکی پارٹی کی صدارتی الیکشن مہم میں مقرر ہونے والا پہلا مسلمان اور پاکستانی نژاد کیمپین منیجر بن گیا۔ برنی کہتا ہے، ہم اپنے کام انجام دینے کی خاطر ایسے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جو باصلاحیت، محنتی اور دیانتدار ہوں۔ رنگ، نسل یا مذہب چناؤ کے ہمارے معیار نہیں۔

حیرت انگیز بات یہ کہ یہودی ہونے کے باوجود برنی سینڈرز امریکا میں یہود سے زیادہ مسلمانوں میں مقبول ہے۔ اس کی بنیادی وجہ انسان دوست ہونا اور حقائق کو تسلیم کرنا ہے۔ برنی کئی بار تقریروں میں اسرائیلی حکمرانوں کو ''قابض'' اور ''غاصب'' قرار دے چکا۔ وہ نہتے فلسطینیوں پر گولیاں چلانے پر اسرائیلی حکومت کو شدید تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ انتہا پسند اسرائیلی وزیرِ اعظم، بنجمن یاہو کو ''نسل پرست'' اور ''متعصب'' کہتا ہے۔

فروری 2020ء میں ایک انتخابی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے برنی نے علی الاعلان کہا کہ اگر میں صدر بن گیا تو اسرائیل کو امریکا کی سالانہ چار ارب پر مشتمل امداد اسی وقت ملے گی جب وہ اہلِ فلسطین سے انصاف کا سلوک کرے گا۔ اسی طرح بھارتی حکمران مقبوضہ کشمیر میں کشمیریوں پر ظلم وستم کرنے لگے تو برنی سینڈرز نے مودی سرکار پر تنقید کی۔ اس نے کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں عوام پر بھارتی حکومت کا ظلم کسی طور قبول نہیں۔

دنیا بھر میں جن قوتوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنا رکھا ہے، برنی سرِ عام ان پر تنقید کرتا ہے۔ اسی لیے امریکا بھر کے مسلم گروہوں نے یہ مہم چلا دی تھی کہ ہر الیکشن میں مسلمان برنی کو ووٹ دیں تاکہ وہ پہلے ڈیموکریٹک پارٹی کا امیدوار بن جائے اور پھر صدارتی انتخاب جیتنے میں کامیاب رہے۔

منشور کے اہم نکات

برنی نے اس بار وہ اقدامات بھی واضح کیے جنھیں صدر بن کر وہ عملی صورت میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ ان میں سے اہم یہ ہیں:

تنخواہ میں اضافہ

ایک امریکی شہری کی تنخواہ 7.25 نہیں فی گھنٹہ 15 ڈالر ہونی چاہیے۔ (مخالفین نے کہا کہ تنخواہ بڑھانے سے چھوٹے کاروباروں کے مالکان مشکل میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔)

مفت تعلیم

کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مفت کی جائے گی۔ اعلیٰ تعلیم

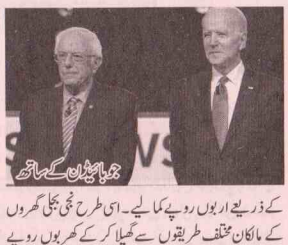

حاصل کرنا ہر کسی کا حق ہے۔ اسے صرف امرا تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ مفت تعلیم کے لیے پہلے بجٹ میں 2.2 ٹریلین ڈالر رکھے جائیں گے۔ اس رقم سے ان ساڑھے چار کروڑ طلبہ و طالبات کے تعلیمی قرضے بھی حکومت ادا کرے گی جو قرضوں کے بوجھ تلے پس رہے ہیں۔ (مخالفین نے الزام لگایا کہ برنی امیروں کی اولاد کے قرضے بھی معاف کرنا چاہتا ہے۔)

مفت علاج

حکومت ہر شہری کی ہیلتھ انشورنس کرائے گی تاکہ اس کو کسی بیماری یا حادثے کے سبب مفت علاج مل سکے۔ اس منصوبے پر اگلے دس برس میں 30 ٹریلین ڈالر خرچ ہوں گے۔ منصوبے کو ''یونیورسل ہیلتھ کیئر'' کا نام دیا گیا۔ (2016ء میں ڈیموکریٹک پارٹی نے اس منصوبے کو ''انتہا پسندانہ'' قرار دے کر مسترد کر دیا تھا مگر اب جو بائیڈن بھی اس کی تائید کر چکا)

انفراسٹرکچر پر سرمایہ کاری

اگلے چار برس میں سڑکوں، اسپتالوں، اسکولوں اور دیگر انفراسٹرکچر کی مرمت پر 1 ٹریلین ڈالر کیے جائیں گے۔

امرا پر ٹیکس

امریکی امرا پر زیادہ ٹیکس لگیں گے تاکہ دولت کی ناانصافانہ تقسیم کم ہو سکے۔ حکومت کی ذمے داری ہے کہ وہ تمام لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرے اور یہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے نہایت تکلیف دہ بات ہے کہ حکومت ارب پتیوں اور کھرب پتیوں کو ٹیکسوں میں رعایت دیتی ہے۔ ہماری حکومت امرا پر ٹیکس لگا کر حاصل ہونے والی رقم عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر خرچ کرے گی۔

(پاکستان میں بھی حکمران امرا کو ٹیکسوں میں رعایت بلکہ سہولتیں دیتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک تحقیقی رپورٹ سے انکشاف ہوا کہ شوگر ملز کے مالکان نے سبسڈی اور مہنگی چینی کے ذریعے اربوں روپے کما لیے۔ اسی طرح نجی بجلی گھروں کے مالکان مختلف طریقوں سے گھپلا کر کے کھربوں روپے ڈکار گئے۔)

آب وہوائی تبدیلیوں کا مقابلہ

دنیا بھر میں آب و ہوائی تبدیلیوں سے قدرتی آفات بڑھ رہی ہیں۔ نتیجتاً جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے۔ ان تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ''گرین نیو ڈیل'' منصوبہ اپنایا جائے گا۔ اس منصوبے پر 16.3 ٹریلین ڈالر لاگت آئے گی۔ یہ منصوبہ اگلے پندرہ برس میں دو کروڑ ملازمتیں پیدا کرے گا اور اس دوران اپنی قیمت بھی پوری کر لے گا۔ اس ضمن میں آئل کمپنیوں پر تین ٹریلین ڈالر کے ٹیکس لگائے جائیں گے۔

اسلحہ دینا مشکل ہوا

امریکا میں ہر کوئی آسانی سے بندوق خرید سکتا ہے۔ ہم برسرِ اقتدار آ کر اسلحہ خریدنے کا عمل مشکل بنا دیں گے۔ خریدار سے مکمل پوچھ گچھ ہو گی تاکہ وہ اسلحے کا ناجائز استعمال نہ کر سکے۔

اب جنگیں نہیں

ہمارے حکمرانوں نے پچھلی ایک صدی سے بے مقصد جنگیں چھیڑ رکھی ہیں۔ ان کی وجہ سے عوام کے ادا کردہ ٹیکسوں کے کھربوں ڈالر آگ میں جھونک گئے۔ لوگ اب ان سے تنگ آ چکے۔ ہم حکومت سنبھالتے ہی بیرونِ ممالک جاری تمام جنگیں ختم کر دیں گے۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری

امریکا میں بعض ملٹی نیشنل کمپنیاں بہت طاقتور بن چکیں۔ ان میں ایمزن، فیس بک اور گوگل شامل ہیں۔ ہم حکومت سنبھال کر ان کمپنیوں کی ''اجارہ داری'' ختم کردیں گے اور اس ضمن میں نئے قوانین بنائیں گے۔

صدارتی الیکشن کا امیدوار بننے کی خاطر برنی کا آغاز اچھا تھا۔ اس نے بیشتر ڈیموکریٹک نمائندوں کی حمایت پالی۔ لیکن پھر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس ناکامی نے بعض وجوہ اور غیروں کی سازشوں کے باعث جنم لیا۔ ہوا یہ کہ ابتدائی ریاستوں میں فتح کے بعد برنی کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ پھر دونوں بڑی جماعتوں اور سرمایہ دارانہ نظام پر شدید تنقید کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکا میں سیاسی نظام فرسودہ ہو چکا۔ دونوں جماعتیں امرا کی غلام اور باندیاں ہیں۔ اب ملک میں نئے سیاسی اور معاشی نظام کی ضرورت ہے۔ امریکا میں یہودی اور ہندو طاقتور لابیاں رکھتے ہیں۔ برنی نے انھیں بھی اپنا مخالف بنالیا۔

یہ نمایاں ہے کہ برنی کی صورت میں حکمران طبقے کو ایک زبردست خطرہ دکھائی دینے لگا۔ وہ برسراقتدار آ کر پچھلے ڈیڑھ سو برس سے حکمرانی کرتے چلے آرہے بالادست طبقے کی طاقت کم کرسکتا تھا۔ اسی لیے اسٹیبلشمنٹ کے تمام عناصر اپنے اختلافات وقتی طور پر بھلا کر متحد ہو گئے۔ اب برنی کو شکست دینا ان کا واحد نصب العین بن گیا۔ اس دوران یہود و ہنود نے بھی اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے اور ڈیموکریٹک پارٹی کے ووٹروں کو خریدا جانے لگا۔ حکمران طبقے کے حامی میڈیا نے بھی برنی کے خلاف شر انگیز مہم چلا دی۔ بالادست طبقہ کھل کر سامنے آگیا۔

ایلزبتھ وارن کا بھی مقابلے میں حصہ لینا وجہ تنازع بنا۔ وہ بھی برنی کی طرح سوشل ڈیموکریسی کی راہنما ہے۔ یوں اس نظریہ سیاست کے چاہنے والے ووٹروں کے ووٹ تقسیم ہو گئے۔ اگر برنی اور ایلزبتھ متحد رہتے تو قطعی نتیجہ مختلف ہوسکتا تھا۔ مزید برآں برنی سینڈرز طوعاً کرہاً ہی ڈیموکریٹک پارٹی کا رکن بنا تھا۔ اس امر نے بھی پارٹی کے دیرینہ کارکنوں کو اس سے برگشتہ کیے رکھا۔

ریاستی الیکشنوں میں نوجوانوں کے سب سے زیادہ ووٹ برنی ہی نے پائے۔ مگر ان کی تعداد توقع سے کم رہی۔ اسی طرح برنی کے خلاف پروپیگنڈے کی وجہ سے سیاہ فام اور ناخواندہ ووٹر بھی اس سے دور رہے۔ ان تمام عوامل کا یہ نتیجہ نکلا کہ برنی مطلوبہ نمائندے حاصل نہیں کرسکا اور اپنی انتخابی مہم روکنے پر مجبور ہو گیا۔ کورونا وائرس کے حملے نے بھی اس کی مہم کو متاثر کیا۔

بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ برنی اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کرلیتا یا سیاست سے کام لیتے ہوئے اس پر سخت تنقید نہ کرتا تو شاید حالات مختلف ہوتے۔ حد یہ ہے کہ ڈیموکریٹک کے بیشتر سینئر لیڈر اس کی مخالفت کرتے پائے گئے مگر برنی ساری زندگی جن سیاسی جماعتوں کے خلاف لڑتا رہا تھا، وہ اب ان سے کیسے مفاہمت کرلیتا؟ نظریاتی افراد ہار تو سکتے ہیں مگر انھیں خریدنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ برنی پر یہ تنقید بھی ہوئی کہ اس نے جو بائیڈن کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا۔ کئی امریکی دانشوروں کے نزدیک بائیڈن ایک روایتی اور ''اسٹیٹس کو'' کا نمائندہ سیاست دان ہے۔ لہٰذا وہ غیر روایتی ٹرمپ کو شکست نہیں دے سکتا۔ صرف برنی ہی میں اسے ہرانے کی صلاحیت تھی۔

برنی سینڈرز امریکا کا صدر نہیں بن سکا مگر اس نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جن نظریات کی ترویج کی، وہ اب پورے امریکا میں مقبول ہو چکے۔ کروڑوں امریکی حکمران طبقے سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کے مسائل و مشکلات دور کرے گا۔ حکمرانوں کو بھی احساس ہو چکا کہ اگر انھوں نے عام آدمی کے مسائل حل نہ کیے تو وہ حکمرانی کی آسائشوں اور

مراعات سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ انھیں ہر حال میں عوام دوست ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ اس تصور کو برنی سینڈرز کی عوامی جدوجہد ہی نے جنم دیا۔ اس نے اپنی کوششوں و سعی سے عوام کی آواز اقتدار کے بلند و بالا ایوانوں تک پہنچادی۔

پانچ سال قبل تک برنی سینڈرز کو امریکا میں اور بیرون ملک صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی جانتے تھے۔ مگر اس نے عوام کو حقوق دلوانے کی مہم چلائی تو آج وہ بین الاقوامی لیڈر بن چکا۔ اس کی باتیں بغور سنی جاتی ہیں۔ کروڑوں لوگ اُسے نیلسن منڈیلا کی طرح ایک انقلابی اور انسان دوست راہنما سمجھتے ہیں جس نے اپنے نظریات اور عملی جدوجہد سے امریکا میں اچھا خاصا انقلاب برپا کردیا۔

برنی سینڈرز بوڑھا ہو چکا مگر اس نے عوامی بیداری کی جو تحریک چلائی، وہ امریکی شہروں ہی نہیں قصبوں اور دیہات تک پھیل چکی۔ ان علاقوں میں بھی ایسے مرد و زن سامنے آ چکے جو عوامی مسائل اور مشکلات حل کرنے کی خاطر کوشاں ہیں۔ وہ حکمران طبقے پر نظر رکھتے اور اس کے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ وہ غافل اور سست نہ ہو جائے اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم و متحرک رہے۔ یوں برنی سینڈرز نے عوامی شعور و آگاہی پھیلانے کی جو تحریک شروع کی، وہ اب جاری و ساری رہے گی۔ اُسے چلانے کے لیے نوجوان امریکی لڑکے لڑکیاں سامنے آچکے جو برنی کے بجائے چراغ کو روشن رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔

اسلامی سوشلزم۔۔۔ بہترین نظریہ حیات

عام آدمی کی حالت سدھارنے کے لیے برنی سینڈرز کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ لیکن وہ سوشل ڈیموکریسی کے بجائے اسلامی سوشلزم کے اصول و قانون اپنا لیتا تو اس کی کامیابی یقینی ہو جاتی۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی سوشلزم سیاسی و معاشی طور پر انتہاپسند نہ نہیں معتدل اور متوازن نظام رکھتا ہے۔ وہ سوشلزم اور سرمایہ داری، دونوں متضاد سیاسی و معاشی نظریات کی خامیوں سے پاک ایک اعتدال پسند نہ نظام حیات ہے۔ وہ دولت مند اور مزدور، دونوں کے حقوق و فرائض کا خیال رکھتا ہے۔

اسلام دراصل دین و دنیا، دونوں میں انسان کی بھلائی و ترقی چاہتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں بھی ہے: ''الٰہی! ہمیں دنیا کی بھلائی عطا فرما اور آخرت کی بھلائی بھی۔'' (سورۃ البقرہ۔ 102) قرآنی تعلیم یہ ہے کہ ایک مسلمان روحانی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی کرے تاکہ دنیا میں خیر و بھلائی پھیلانے کے قابل ہو سکے۔ وہ دینداری اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ثبت معنی میں دنیادار بھی بن جائے اور اسلامی تعلیمات عام کرنے اور غریبوں کی فلاح و بہبود میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔

اسی لیے قرآن و سنت میں مسلمانوں کو تجارت کرنے اور صنعت و حرفت اپنانے کی تلقین موجود ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی نہ صرف تجارت فرمائی بلکہ ایک متمول خاتون، حضرت خدیجہؓ سے بیاہ فرمایا۔ پھر بہت سے صحابہ کرام مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ (قبل از خلافت)، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیرؓ بن عوام اور دیگر دولت مند صحابی گزرے ہیں۔ اگر اسلام مارت کے خلاف ہوتا، تو یہ معزز صحابہ کرام دولت اکٹھی نہ فرماتے۔

اسلام صرف ایسے صاحب ثروت کا مخالف ہے جس کی زندگی حصول زر کے گرد گھومتے لگے۔ وہ مغرور و متکبر بن بیٹھے اور اپنی دولت کو ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے کام میں لائے۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں تساہل برتے اور غربا کی امداد نہ کرے۔ صرف دنیا پرست ایسے دولت مند کو جہنم میں ٹھکانے کی ہی سناوٹی دی گئی ہے۔ لیکن اسلامی معاشروں میں مخیر مسلمانوں کو بڑا بلند مرتبہ ملتا ہے اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ●●●

عالم تمام

عاصم محمود

بھارتی مسلمانوں کی دریا دِلی

15 اپریل کی بات ہے، نئی دہلی میں مقیم امام مسجد، چوالیس سالہ حافظ محمد نصیر الدین اپنے اسکوٹر پر سبزیاں لینے منڈی گئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو چند سپاہیوں نے انھیں روک لیا۔ سڑک پر کئی لوگ آ جا رہے تھے مگر صرف انھیں روکا گیا..... اسی لیے کہ وہ وضع قطع سے مسلمان نظر آتے تھے۔ یہی نہیں، سپاہی حافظ صاحب پر چیخنے چلانے لگے۔ ایک سپاہی نے انھیں مارنے کی بھی کوشش کی وہ چلا رہے تھے: ''مسلمانو! بھارت سے نکل جاؤ تمہاری وجہ سے یہاں کورونا وائرس پھیل رہا ہے۔''

حافظ محمد نصیر الدین نے بڑی مشکل سے متعصب ہندو سپاہیوں کی گرفت سے نجات پائی۔ یہ کوئی اکا دکا واقعہ نہیں، اواخر مارچ 2020ء سے بھارت بھر میں بستے کروڑوں مسلمان انتہا پسند مودی سرکار کے باعث روزمرہ زندگی میں مشکلات اور مسائل کا شکار ہو گئے۔ ہوا یہ کہ مودی سرکار یہ پروپیگنڈا کرنے لگی کہ تبلیغی جماعت کے ارکان کی وجہ سے بھارت میں کورونا وائرس اور اس کی وبا پھیل رہی ہے۔ بھارتی میڈیا نے بھی زور شور سے اس پروپیگنڈے کو پھیلایا۔ یہی وجہ ہے، اکثر بھارتی علاقوں میں مسلمانوں کو زبردست بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔

مثال کے طور پر ہندو عوام نے مسلمان دکانداروں سے اشیائے ضرورت خریدنی بند کر دیں۔ مسلم گوالوں سے دودھ خریدنا چھوڑ دیا۔ کسی ہندو کی مسلمانوں سے دوستی تھی، تو اس نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ غرض مودی سرکار کے زہریلے پروپیگنڈے کا نشانہ بن گئے۔ ملک میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے کام ٹھپ پڑا تھا۔ اب اس بائیکاٹ نے مسلمانان بھارت کی معاشی و معاشرتی زندگیوں کو نئی مصیبت میں گرفتار کرا دیا۔

میڈیا کے اشتعال انگیز پروپیگنڈے کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہندو خصوصاً وضع قطع سے مسلمان نظر آنے والے لوگوں کی ہر سرگرمی پر نظر رکھنے لگے۔ ان کی معمولی خلاف معمول حرکت بھی یہ سمجھ کر دیکھی جاتی کہ وہ کورونا وائرس پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک افسوس ناک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

محمد یوسف بمبئی کے باسی ہیں۔ چند سال بعد قبل ان کا ایک بازو حادثے کی وجہ سے کچھ معذور ہو گیا۔ دس اپریل کو وہ اپنے اسکوٹر میں پٹرول بھروانے ایک پٹرول پمپ گئے۔ پٹرول بھروانے کے بعد جب وہ ملازم کو رقم دے رہے تھے تو بازو میں معذوری کی وجہ سے کچھ نوٹ زمین پر گر گئے۔

پٹرول پمپ کا مالک یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنے آدمی بھجوا کر محمد یوسف کو روک لیا۔ یہی نہیں، فون کر کے پولیس بلوالی۔ مالک اور دیگر ملازموں کی دعویٰ تھا کہ محمد یوسف کرنسی نوٹ گرا کر پٹرول پمپ میں کورونا وائرس پھیلانا چاہتا تھا۔ بیچارے محمد یوسف دہائی دیتے رہے کہ ان کا بازو معذور ہے۔ اسی لیے غلطی سے نوٹ گر گئے۔ مگر جذبات کی طغیانی میں عقل و ہوش بہ جاتا ہے۔ لہٰذا کسی نے ان کی نہ سنی۔

پولیس محمد یوسف کو تھانے لے گئی۔ آخر وہاں بغور ان کے بازو کا معائنہ ہوا تو پتا چلا کہ محمد یوسف سچ بول رہے ہیں۔ اس کے باوجود پولیس نے لاک ڈاؤن کی خلاف ورزی کرنے پر محمد یوسف کے خلاف پرچہ کاٹ دیا۔ نیز ان کا کورونا وائرس ٹیسٹ بھی کرایا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پٹرول پمپ کے مالک نے کرنسی نوٹ گراتے ہوئے محمد یوسف کی وڈیو سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کر دی۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں لاکھوں بھارتی اُسے دیکھ چکے تھے۔ ہندوؤں نے یہی دہائی مچائی کہ ایک اور مسلمان بھارت میں کورونا وائرس پھیلاتے پکڑا گیا۔ یوں اس وڈیو نے بھارتی مسلمانوں کے خلاف نفرت اور غصّے میں اضافہ کر دیا۔

اگلے دن جب سچائی سامنے آئی کہ محمد یوسف کی معذوری کے باعث ایسا ہوا تو بھارتی میڈیا نے بہت کم یہ سچ نمایاں کیا۔ صرف لیفٹسٹ اخبارات اور ویب سائٹس نے یہ خبر مشتہر کی کہ کس طرح جعلی وڈیوز اور جھوٹی خبروں کے ذریعے عام ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ حکمران جماعت بی جے پی کے ارکان کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف اعلانات کرنے لگے۔ مثلاً ہندوؤں سے کہا گیا کہ وہ کسی بھی مسلمان کاروباری سے کوئی کاروبار نہ کریں۔ مسلم کمپنیوں کی مصنوعات نہ خریدی جائیں۔ غرض بھارت میں مودی سرکار، قوم پرست اور انتہا پسند جماعتوں اور میڈیا نے مل کر مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہم چلا دی۔ مقصد یہی تھا

لاک ڈاؤن میں مسلمانانِ بھارت نے ہندو عوام کی ہر ممکن مدد کرنے سے غیر مسلموں کے دل جیت لیے

محمد یوسف مغذور ہاتھ دکھاتے ہوئے

کہ اس روایتی حربے سے اپنے ووٹ بینک کو زیادہ مضبوط بنایا جاسکے۔

یہ تو شکر ہے کہ مودی حکومت کے شدید تعصب نے خلیجی ممالک کے خوابیدہ حکمران طبقوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ کویتی حکومت نے ''او آئی سی'' سے درخواست کی کہ بھارت میں بڑھتی مسلم دشمنی کا سد باب کیا جائے۔ قطر کی ایک شہزادی نے سوشل میڈیا پر مودی میڈیا کو لنگر طعن کا نشانہ بنایا۔ جب مودی سرکار نے دنیائے عرب میں اپنے معاشی مفادات خطرے میں پڑتے دیکھے، تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ تب گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر وہ مذہبی بھائی چارے اور رواداری کی باتیں کرنے لگیں۔ آر ایس ایس کے چیف، موہن بھگت نے بیان دیا کہ بھارت میں سبھی مذاہب کے لوگ مل جل کر رہیں۔ نریندر مودی نے رمضان المبارک شروع ہونے پر مسلمانوں کو مبارک باد دی۔

مودی سرکار کے احکامات پر بھارتی میڈیا نے بھی مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا روک دیا۔ یوں مسلمانان بھارت کی جان میں جان آئی اور انھوں نے سکون کا سانس لیا۔ صد افسوس کہ 2014ء کے بعد سے وہ سخت مسائل اور مصائب میں پھنس گئے ہیں جو مذہبی ہیں اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی بھی۔ پریشانیوں کی ہمہ گیری کے باعث ہی ان کا دین ایمان تک خطرے میں پڑ چکا۔ چند دن قبل خبر آئی تھی کہ معاشرتی بائیکاٹ سے تنگ کر آگرہ میں چند مسلم گھرانوں نے ہندو مت قبول کرلیا۔

بھارت میں جب سرکاری طور پر مسلمانوں کی کردار کشی کی جارہی تھی تو مختلف علاقوں میں مقیم مسلمان نیکی و خیر کے کام کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنے خلاف چلی زہریلی مہم خاطر میں نہ لائے اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا رہے۔ ایسے دلیر مسلمانوں میں ریاست کرناٹک کے دو بھائی، چنچل پاشا اور مزمل پاشا قابل ذکر ہیں۔

دونوں بھائی بچپن میں یتیم ہو گئے تھے۔ بوڑھے دادا دادی نے ان کی پرورش کی۔ غیر مسلم محلے دار بھی اس نادار خاندان کی مالی مدد کرتے رہے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو ریئل اسٹیٹ کا کام کرنے لگے۔ نیک نیتی اور ایمانداری کے باعث اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں برکت دی اور وہ چند زمینوں کے مالک بن گئے۔ ہر قسم کی آسائش انھیں میسّر آ گئی۔

یہ بھائی ریاست کرناٹک میں ضلع کوئکر کے باسی ہیں۔ جب ان کے علاقے میں لاک ڈاؤن شروع ہوا تو سیکڑوں دیہاڑی دار مرد و زن بے روزگار ہو گئے۔ ان لوگوں کی جمع پونجی تو ہوئی نہیں، اس لیے غذا نہ ملنے سے بھوک کی نوبت آگئی۔ انھیں بھوک سے بے حال دیکھ کر بچپن اور لڑکپن میں بھوک پیاس کی اذیت برداشت کر چکے تھے۔ انھوں نے دکھی انسانیت کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

بھائیوں نے اپنی کچھ زمینیں فروخت کر دیں جن سے 25 لاکھ روپے حاصل ہوئے۔ اس رقم سے پھر اناج خرید کر علاقے میں کھانا پکانے کے مراکز قائم کیے گئے۔ وہاں ہر بھوکے کو کھانا ملنے لگا جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ یوں دونوں مسلم بھائی اپنے علاقے میں بھوکے اور ضرورت مند غیر مسلموں کا سہارا بن گئے۔ ان کی انسان دوستی اور دریا دلی کو خصوصاً جنوبی بھارت میں بہت سراہا گیا۔ لاکھوں ہندوؤں نے ان کی تعریف و توصیف کی۔ یاد رہے، جنوبی بھارت میں ابھی ہندو قوم پرست اور انتہا پسند تنظیمیں زیادہ مقبول نہیں اور وہاں برداشت و رواداری کے مثبت جذبے معاشرے میں جا بجا ملتے ہیں۔

لاک ڈاؤن کے باعث بھارت میں میت کی تدفین بھی مسئلہ بن گئی۔ ایک خاندان والے تن تنہا تدفین کے کام نہیں کر پاتے اور انھیں رشتے داروں اور دوست احباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن لاک ڈاؤن کی وجہ سے معاشرتی تعلقات بھی بندش کا شکار ہو گئے۔ ایسے مشکل عالم میں یہ حیرت انگیز مظاہرے پورے بھارت میں دیکھنے کو ملے کہ مسلمان پڑوسیوں نے متوفی ہندو کے خاندان کا ہاتھ بٹایا تاکہ وہ میت کو اپنی رسومات کے مطابق دنیا سے رخصت کر سکے۔

کئی معاملات پر یہ حیران کن مظاہرے بھی سامنے آئے کہ میت کے رشتے داروں نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ تب محلے کے مسلمانوں نے جذبہ ہمدردی اور پڑوسی ہونے کے ناتے متوفی کا کیا کرم کیا۔ مسلمانوں کے اس عمل کو بھی پورے بھارت میں بہت پزیرائی ملی۔ کئی ہندو دانشوروں نے لکھا کہ یہ ہے اسلام کا حقیقی چہرہ جو خیر و بھلائی کے جذبوں سے متصف ہیں۔ یوں دوسروں کے لیے درد دل رکھنے والے بھارتی مسلمانوں کے جذبہ ہمدردی کی بدولت بھارت میں ان کے خلاف چلتی نفرت انگیز مہم میں کمی آئی اور انھیں بہت سراہا گیا۔

بھارت کے غیر جانبدار دانشوروں کا کہنا ہے کہ مودی سرکار نے بیشتر بھارتی میڈیا خرید لیا ہے۔ ٹی وی چینلوں، اخباروں اور رسائل پر مشتمل یہ زرخرید میڈیا مسلسل مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عام ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت بڑھائی جاسکے۔ یہی نفرت کا زہر تیزی سے بھارتی معاشرے میں پھیل رہا ہے۔ حال یہ ہے کہ اب شریف اور نیک مسلمان بھی دہشت گرد اور غنڈے سمجھے جا رہے ہیں۔ حکمران طبقے نے بھارتی معاشرے کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔

آج پاکستانی لاک ڈاؤن اور حکمرانوں کی نااہلی و کرپشن کے باعث وسیاسی مسائل کا شکار ہیں۔ لیکن ذرا سوچیے، ہمارے پڑوسی بھارتی مسلمانوں پر کتنی زیادہ آفتیں آئی ہوئی ہیں۔ بھارت میں حکومت سے لے کر اکثریتی فرقہ تک ان کے مذہب اور جان و مال کے درپے ہے۔ اب وہ آزادی سے اپنی مذہبی روایات پر عمل نہیں کر سکتے کہ اکثریتی فرقے کے حملے کا خوف ہر دم ان پر سوار رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانان بھارت کو کٹھن وقت سے نجات دلائے اور مودی سرکار کی کشتی عذاب الٰہی نازل فرما کر غرق کر ڈالے۔ ◆◆◆

سفرنامہ

انجینئر حافظ عبدالرؤف

سعودیہ سے ترکی تک

وہ تمام علم وفن جو کبھی مسلمانوں کی میراث تھا آج غیر مسلم قومیں اس میں ترقی کے جھنڈے گاڑ رہی ہیں

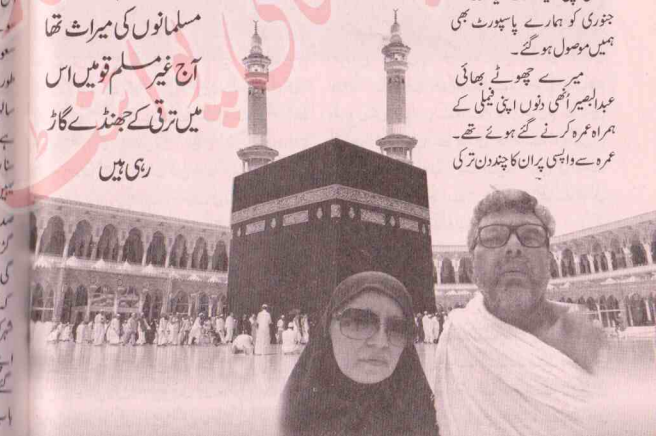

ایک دلچسپ سفر کی رُوداد، جس میں ماضی اور حال کا سفر طے ہوتا بخوبی نظر آتا ہے

میں تقریباً ایک سال سے عمرہ کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا اور خیال تھا کہ کاروباری معاملات کچھ سنبھل جائیں تو میں انشاء اللہ بیگم کے ہمراہ عمرہ کرنے ضرور جاؤں گا مگر ہمیشہ کی طرح اپنے کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا کہ میرے داماد جو میرا بھتیجا بھی ہے عبدالعظیم کا میسج آیا کہ چچا چاپنے اور چاچی کے پاسپورٹ کی کاپی بھیج دیں۔ میں نے فوراً تصاویر کھینچوا کر پاسپورٹ کی کاپی کے ہمراہ واٹس ایپ پر بھیج دیں۔ یوں یکم جنوری کو ہمارا ایک سال کا ملٹی پل ویزہ لگ گیا اور 12 جنوری کو ہمارے پاسپورٹ بھی ہمیں موصول ہوگئے۔

میرے چھوٹے بھائی عبدالبصیر اُنھی دنوں اپنی فیملی کے ہمراہ عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے۔ عمرہ سے واپسی پر ان کا چند دن ترکی میں قیام کا ارادہ تھا اور یہ عبدالبصیر کا اپنی فیملی کے ساتھ ترکی میں ایک سال میں قیام کا دوسرا پروگرام تھا۔ میں کچھ عرصے سے سلطنت عثمانیہ اور رومیوں کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں خاص طور پر صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت محمد ﷺ کو فتح مکہ کی بشارت سناتے ہوئے قیصر روم کے کنگن کے ذکر نے میرے تجسس کو جلا بخشی تھی اور دل میں آیا کہ ایک دن ضرور اتنے زرخیز تاریخی ورثے کو دیکھنا چاہیے۔ اس پر عبدالبصیر کے اس پروگرام نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ہم نے سعودی عرب جاتے ہوئے ترکی اور خاص طور پر استنبول دیکھنے کا پروگرام بنایا جو سالہا سال سے بڑے بڑے تاریخی لمحات کی داستان سنا رہا ہے جو مسلمانوں کے عروج وزوال کی گواہ ہے۔ جو یہ کہانی بھی سنا رہا کہ مضبوط قلعے اور فصیلیں بنانے ''والے'' سامان تعیش نہیں چھوڑ گئے۔ وہ مضبوط قلعے، عظیم مساجد، محل اور فصیلیں تو صدیوں بعد بھی لوگوں کو عبرت دلا رہی ہیں کہ چاہے تم مضبوط گڑھوں میں بھی جا چھپو موت تو تمہیں وہاں بھی آن دبوچے گی۔ وہاں کا صدیوں پرانا نکاسی آب کا نظام ہمیں بتا رہا ہے کہ ہم صدیوں پہلے بھی تم سے بہت ترقی یافتہ تھے۔ ''ہم'' اس شہر کو اس لیے بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کون سے لوگ ہیں جو اپنے حکمرانوں کے لیے 2016ء میں ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے اور فوجی انقلاب روک کر جدید عالمی تاریخ میں سنہرے باب کا اضافہ کر دیا۔

چنانچہ پاسپورٹ ملتے ہی میں نے ترکی کے ویزے کے لیے درخواست جمع کروادی۔ جنوری کے اختتام تک ہمیں ترکی کا ویزہ بھی موصول ہو گیا۔ اب اللہ کے کرم سے تمام ضروری معاملات حسب خواہش پورے ہو چکے تھے یوں ہم 14 جنوری کو سعودی ایئر لائنز سے استنبول کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہمارا بیٹا حافظ عبدالرحمٰن ترکی کا دورہ کر چکا تھا اس لیے اس نے سلطان احمد سکوائر کے نزدیک ہوٹل میں بکنگ کروادی اور ہم 14 فروری کو رات ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل پہنچ گئے۔

اگلے دن فجر کی نماز ہم نے Blue Mosque میں ادا کی۔ ہمارا قیام کیونکہ Blue Mosque سے دو تین منٹ کی مسافت پر تھا اور اذان کی گونج ہمیں اپنے کمرے میں سنائی دی تو ایسا لگا کہ گویا مکہ میں بیت اللہ سے اذان کی آواز آرہی ہے۔ یہ مسجد ۱۶۱۶ء میں تعمیر کی گئی تھی اور اس کی تعمیر میں استعمال ہونے والی نیلی ٹائلیں اس کی وجہ تسمیہ ہیں۔

مجھے اس مسجد میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کچھ بنیادی معلومات تھیں جو اسلام کی اساس ہیں اور جو ایک غیر مسلم کو بہ نظر غائر دیکھنے میں بھی اسلام کے بارے میں پھیلے شکوک وشبہات کی ''اصل حقیقت'' بتا دیتی ہیں اور یہ

معلومات مسجد کے اندر جانے سے پہلے ہی بیرونی دیوار پر نمایاں طور پر درج کی گئی ہیں۔ وہیں پر مسلمانوں کی اہم خدمات جنھوں نے دنیا کو تبدیل کیا خواہ وہ ریاضی ہو یا کیمیا، طب ہو یا علم فلکیات ان کی اہم ایجادات جو ماڈرن سائنس کی بنیاد بنیں ان کا مختصر تعارف بھی ان معلومات کا حصہ ہے۔

اس کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر ہم باسفورس کے بوٹ ٹرپ پر نکل گئے، جس کے دوران بہت دلکش مناظر کے ساتھ ساتھ بہت سی عمارتوں کی تاریخ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں یہ پوری دنیا میں وہ واحد مقام ہے جہاں دو برّاعظم ایک ہی ملک نہیں بلکہ ایک ہی شہر میں باہم ملتے ہیں۔ باسفورس کے ایک طرف یورپین ترکی ہے جو اپنی تاریخی حیثیت اور عمارتوں کی وجہ ساری دنیا کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے جبکہ دوسری طرف ایشیائی ترکی ہے۔ دونوں اطراف انتہائی کم فاصلے کے باوجود یکسر مختلف مزاج کی حامل ہیں۔

ترکی میں سبز پاسپورٹ کی عزت افزائی کا انوکھا منظر بھی دیکھنے کو ملا اور واقعی یہ لوگ پاکستانیوں کی دل سے عزت کرتے ہیں اور خلافت موومنٹ میں مسلمان قائدین کا کردار آج بھی ان کے دل واذہان میں زندہ ہے۔

اگلے دن ہم دولماباچے پیلس دیکھنے گئے۔ یہ محل ''مارمرا سی'' کے ساتھ واقع ہے۔ اس کے اطراف میں خوبصورت باغات اور محل دونوں ہی اس محل کے بنانے والے کے حسن ذوق اور فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ محل بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اسے انیسویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس محل نے کئی صدیوں کا سفر دیکھا یہاں اس نے بڑے زیرک سلطان بھی دیکھے اور سازشوں کے جال بننے والوں کے راز بھی اپنے اندر دفن کیے یہ دنیا کا سب سے بڑا اور پرانا محل ہے جو اب میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں سلطنت عثمانیہ کے عروج وزوال کی تاریخ گھومنے لگی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی سلطنت عطا کی تھی جو خوشحالی اور اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ ساری دنیا کی توجہ کا مرکز رہی ہے لیکن مسلمان فرمارواؤں کی عیش پرستی اور ریشہ دوانیوں نے اس عظیم سلطنت کا بھی شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

گو کہ ترکی کی پہلی یونیورسٹی کا قیام 1453ء عیسوی میں عمل میں آ چکا تھا اور اس ادارے کا نام ''دارالفنون'' یعنی House of Multiple Science رکھا گیا تھا مگر اس سفر کو مسلمان اس کامیابی سے آگے نہ بڑھا سکے جسے بعد کے دور میں یورپ نے طے کیا اور وہ تمام علم وفن جو کبھی مسلمانوں کی میراث تھا آج غیر مسلم قومیں اس میں ترقی کے جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔ بہر کیف ترکی نے اپنے ماضی کی درخشندہ روایات کو پھر سے زندہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور آج یہاں متعدد یونیورسٹیوں اپنے اچھے عالمی معیار کی وجہ سے دوبارہ علم سے رغبت

رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہیں اور کثیر تعداد میں غیر ملکی طالب علم بھی ترکی کا رخ کر رہے ہیں۔

استنبول میں ہمیں جگہ جگہ رومن ایمپائر کے دور میں استنبول شہر کی حفاظت کے لیے بنائی گئی دیوار کے باقیات نظر آئے جنہیں گرا کر نئی عمارات بنانے کے بجائے انھیں محفوظ کر کے اسی کے ساتھ تعمیرات دیکھ کر احساس ہوا کہ اہل استنبول اپنی وراثت پر کس قدر فخر کرتے ہیں۔ ہمیں اس 22 کلومیٹر طویل دیوار کا کچھ تفصیلی معائنہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ یہ دیوار پانچویں صدی میں تعمیر کی گئی۔ اس حفاظتی دیوار کو تین تہوں میں بنایا گیا تھا۔ یعنی شہر کے اردگرد تین فصیلوں کا حصار تھا اور پہلی اور دوسری فصیل کے درمیان پانی چھوڑا جا سکتا تھا۔ تیسری فصیل پر چاق وچوبند پہرے دار چوبیس گھنٹے اس شہر کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔ یہی وہ وجہ تھی کہ اس شہر میں 800 سال تک کوئی حملہ آور داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اگلے دن ہم نے اس چوک کی سیر کی جسے تکسیم سکوائر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ترکی کی جنگ آزادی 1923ء Monument لگے ہوئے ہیں۔ میرے لیے یہ چوک موجودہ عالمی تاریخ کے ناقابل یقین واقعات کی وجہ سے زیادہ اہم تھا جہاں پر لوگوں نے اپنے حکمرانوں کے لیے ٹینکوں کے آگے لیٹ کر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیے تھے۔ جو تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا اور ترکی میں قیام کے دوران معلوم ہوا کہ کیوں لوگوں نے جمہوریت کا ساتھ دیا۔ موجودہ صدر طیب اردگان نے جب 2003ء میں اقتدار سنبھالا اس وقت ترکی معاشی لحاظ سے بہت نچلے درجے پر تھا لیکن اس کی انتھک محنت نے ترکی کو دنیا کی 16 ہویں بڑی اکانومی بنا دیا ہے اور تمام دنیا سے ترک واپس اپنے ملک آ کر اس کی ترقی میں شریک ہیں۔ یہاں میرے دل سے دُعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی سچی عوامی قیادت عطا فرمائے جو لوگوں کے مسائل حل کرے جو غاصبوں پر بھی نگاہ رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور پھر واقعی لوگ انجینئرڈ جمہوریت کے بجائے حقیقی جمہوریت کا دفاع کریں۔

ترکی میں قیام کے دوران ہم نے کوشش کی کہ بے جا بازاروں اور شاپنگ مالوں میں پھرنے کے بجائے اس شہر اور اس کے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوا جائے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے Hagian Sophia کا بھی تفصیلی دورہ کیا۔ یہ عمارت نہ صرف تاریخی بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ 1935ء میں اسے میوزیم کا درجہ دے دیا گیا مگر اس سے قبل کئی سو سال تک مختلف مذاہب کی عبادت گاہ کے طور پر کام کرتی رہی۔ یہ عمارت 537ء میں تعمیر کی گئی۔ تقریباً 916 سال تک یہ عمارت عیسائی کیتھولک چرچ کے طور پر کام کرتی رہی یہاں پر دیواروں پر آویزاں موزیک آرٹ کے (یعنی بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر تصاویر بنانے کا آرٹ)

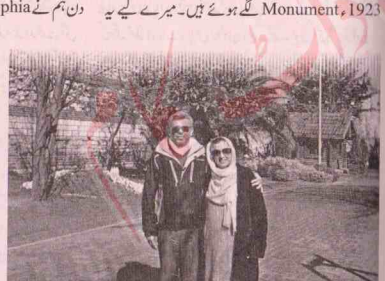

انتہائی خوبصورت شاہکار سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ اس کلیسا کو 1453ء میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا مگر یہاں پر آویزاں ان فن پاروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا اور حضرت مریم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصاویر جوں کی توں آج بھی موجود ہیں جو مذہبی رواداری کی روشن مثال ہے۔

1453ء سے 1931ء تک یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ یہاں پر سلطان، اس کے خاندان کے افراد اور خواتین کے لیے نماز پڑھنے اور خطبہ سننے کا بھی باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ اس عمارت کو بنوانے والے نوجوان آرکیٹیکٹ نے اس میں زلزلہ پیما بھی نصب کیا ہوا تھا جو اس زمانے میں بھی ان کی ترقی اور ذہانت کا پتا دیتی ہے۔

اس عمارت کے اندر گھومتے ہوئے ایک مرتبہ پھر صلح حدیبیہ کے وقت فتح مکہ کی جو بشارت دی گئی تھی، ذہن میں گھومنے لگی اور مجھے اس جگہ کی تاریخی اہمیت کا اور شدت سے احساس ہونے لگا۔

الحمدللہ استنبول میں رہتے ہوئے فجر کی نماز کے بعد باسفورس کے کنارے چہل قدمی کرنے کا بھی موقع ملتا رہا۔ صاف ستھری فضا میں سبزے سے عاری ٹنڈ منڈ درخت بھی اللہ تعالیٰ کی صناعی کی گواہی دیتے رہے۔ باسفورس کا کالا گدلا پانی بھی طلوع آفتاب کی سنہری کرنوں سے جگمگاتا اور پوچھتا رہا فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔

ترکی میں زندگی کے یادگار ترین دنوں میں شامل دس دن گزارنے کے بعد ہم سعودی ایئر لائن سے 24 فروری کو ریاض پہنچے جہاں میرے ہم زلف انجینئر احسن علی لونا، میرا داماد عبدالعظیم سمیع میرے نواسوں اور نواسی کے ہمراہ ہمیں لینے کے لیے ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ احسن بھائی پچھلے 25 سال سے سعودی عرب میں تعمیراتی انڈسٹری سے منسلک ہیں۔ ان کے ساتھ مجھے سعودی عرب میں کچھ زیر تعمیر اور کچھ

تکمیل شدہ پراجیکٹس کو دیکھنے اور جانچنے کا موقع ملا کہ یہاں پر کام کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

احسن بھائی نے میری ملاقات الفوزان کنسٹرکشن کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں سے بھی کروائی جو آج کل کنسٹرکشن انڈسٹری کا ایک بڑا نام ہے۔ احسن بھائی شروع سے ہی اس کمپنی کا اہم رکن رہے ہیں۔ اس بات کا برملا اظہار ''الفوزان'' کی اعلیٰ قیادت نے ہماری ان سے ملاقات کے دوران بھی کیا۔ ان کے الفاظ نے ایک بھائی اور ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔

29 فروری کو ہم عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوئے جہاں چار روز قیام کیا۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ ہمارے ریاض پہنچنے کے غالباً اگلے دن ہوائی اڈے جزوی طور پر یعنی کچھ ممالک کی پروازوں کے لیے بند ہونا شروع ہو گئے تھے۔

مکہ پہنچے، عمرہ ادا کیا اور اگلے دن عمرہ زائرین کی پروازیں بھی روک دی گئیں۔ اس وقت واقعی یہ احساس دوچند ہو گیا کہ یہاں وہی پہنچتا ہے جس کا ''بلاوا آ ہی گیا'' ہو۔ مکہ میں چار روزہ قیام کے بعد تین مارچ کو ہم مدینہ پہنچے۔ یہاں بھی زیادہ وقت مسجد نبویؐ میں گزارنے کی خواہش تھی کیونکہ عملاً ہمارے پاس دو دن ہی تھے۔ یوں بھی مسجد نبویؐ میں چونکہ خواتین کی نماز پڑھنے کی جگہ بالکل الگ تھی اور ریاض الجنۃ میں خواتین کا وقت عشاء کی نماز کے بعد رات 3 بجے تک اور پھر فجر سے گیارہ بجے تک تھا تو بیگم نے رات حرم میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فجر کے بعد بہت زیادہ خواتین ہوں گی لہٰذا رات کو میں اکیلا ہی ہوٹل آ گیا۔ صبح فجر پڑھ کر ہم دونوں ناشتا کرتے ہوئے ہوٹل آ گئے اور 11 بجے تک آرام کیا اور ظہر کی نماز سے پہلے دوبارہ مسجد نبویؐ پہنچ گئے۔ میں یہاں پر زیادہ تر دو نمازوں کے درمیان وقفے میں قرآن کے ترجمے اور سورتوں کی وجۂ نزول اور ان حالات کا مطالعہ کرتا جس سے بات کا سیاق و سباق بھی ترجمہ پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں ہوتا تھا اور ان چار دنوں میں میں نے 18 پارے مکمل کر لیے الحمدللہ۔

مدینہ میں بیگم کے ساتھ طے ہو گیا تھا کہ وہ رات مسجد میں ہی قیام کریں گی اور کھانا ہم نے شام کو ہی کھا لیا تھا لہٰذا میں نے بیگم سے رابطہ نہیں کیا مگر مغرب کے بعد میری طبیعت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ جسم میں سخت درد اور کپکپی کے ساتھ بخار اور کھانسی۔ میں مسجد کے اندر سے نکل کر باہر صحن میں آ گیا کہ شاید ٹھنڈک زیادہ ہے۔ وہاں صحن کی دیوار نسبتاً گرم لگی اور میں پشت کے سہارے بیٹھ گیا۔ جوں توں کر کے عشاء کی نماز تک وقت گزارا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر ہوٹل آ گیا۔ فجر کے وقت بیگم سے بات ہوئی تو انھوں نے کچھ دوائیاں جو وہ پاکستان سے ساتھ لائی تھیں، بتائیں اور میں اینٹی بائیوٹک سمیت الرجی اور بخار کی دوا کھا کر فجر پڑھنے مسجد آ گیا۔ واپسی پر ہم ناشتا کر کے ہوٹل آرام کرنے چلے گئے۔

پانچ فروری کو ہم نے واپس ریاض آنا تھا۔ وکس کی مالش نے کھانسی کو کچھ بہتر کر دیا تھا کہ سفر کا وقت بہتر گزر گیا اور یہ خوف کہ مجھے کرونا کے خدشے میں روک نہ لیا جائے، خیریت سے گزر گیا۔

ریاض پہنچ کر بھی عظیم کی خواہش کے باوجود میں ڈاکٹر کے پاس جانے سے گریزاں تھا۔ تاہم ایک اور دن اسی کشمکش میں گزر گیا۔ اس دوران بیگم پاکستان میں ہماری نئی بہو زرناب جو عبدالرحمٰن کی اہلیہ ہیں، سے مستقل رابطے میں تھیں اور زرناب کا خیال تھا کہ ہمیں آکسیمیٹن 1 گرام بند کر کے کوئی دوسری اینٹی بائیوٹک شروع کرنی پڑے گی کیونکہ میرے جسم میں شدید درد جسم میں پانی کی شدید کمی کی علامت تھا۔ تاہم سب گھر والوں کے دباؤ پر مجھے اسپتال جانا پڑا جہاں میرا کرونا ٹیسٹ بھی لیا گیا۔ وہاں پر مجھے صرف بخار کے لیے آئی وی پینا ڈول اور نمکیات کی کمی دور کرنے کے لیے ڈرپ لگائی گئی جس سے میری طبیعت کافی سنبھل گئی۔ گھر آ کر علاج شروع کر دیا گیا۔ کرونا وائرس ٹیسٹ کا رزلٹ 36 گھنٹے بعد آنا تھا اور وہ الحمدللہ ''نیگیٹو'' تھا۔

ریاض واپس آنے کے بعد میں نے سعودی حکومت کا اپنے معاملات کو چلانے کے طریقوں کا جائزہ لیا جس میں مجھے بخوبی اندازہ ہوا کہ سعودی حکومت نے نہ صرف اپنی رٹ قائم کی ہوئی ہے بلکہ عوام کو بہترین سہولیات اور سسٹم بھی دیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے جدید ٹیکنالوجی کا مربوط نظام قائم کیا ہے جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کو آپس میں معلومات لینے اور دینے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بہترین آلات اور سوفٹ ویئر استعمال کیے جاتے ہیں۔

یہاں پر مجھے تیسری سعودی ''آئی او ٹی'' Internet of things کانفرنس اور نمائش میں جانے کا بھی موقع ملا جو ریاض انٹرنیشنل کنونشن اینڈ ایگزیبیشن سنٹر میں منعقد کی گئی تھی۔ جسے دیکھ کر میں سعودی حکومت کو اپنے سسٹم کو بہترین اور

ریاض، ریلے اسٹیشن پر اپنی بیٹی، نواسے اور بیگم کے ساتھ

جدید ٹیکنالوجی سے لیس کرنے کے وژن سے انتہائی متاثر ہوا۔

بہترین اور جدید یونیورسٹیوں کی تعمیر، جدید ترین اسپتال اور کشادہ سڑکوں کا جال پچھلے دس سال سے سعودی حکومت کی اولین ترجیح میں شامل ہیں۔

13-16 مارچ تک ہمارا دمام جانے کا پروگرام تھا جہاں میرے دوسرے ہم زلف محمد اکمل جو پی۔ ایچ۔ ڈی اکنامکس ہیں اور ''ارامکو'' میں اہم عہدے پر فائز ہیں چنانچہ ہم نے بذریعہ ٹرین دمام جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں ڈاکٹر اکمل اپنی اہلیہ یعنی ہماری سالی صاحبہ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے ہمیں لے کر ارامکو کمپاؤنڈ پہنچے راستے میں گزرتے ہوئے اپنے دفتر اور دوسری عمارات کا سرسری تعارف بھی کروایا۔ ارامکو سعودی عرب کی شہ رگ کے طور پر کام کرتی ہے اور پوری دنیا کے تیل کے کل ذخائر کے 20 فیصد حصے کا انتظام سنبھالتی ہے۔ وہاں قیام کے دوران ہم نے تین شہروں کی تکون یعنی الخبر، دہران اور دمام کی سیر بھی کی اور اپنے میزبانوں کی زبردست مہمان نوازی کا لُطف بھی اٹھایا۔ ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک جو بھی چیز ہم کھاتے وہ گھر میں اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی تھی۔ اسپیشل کریلے، بریانی، چکن جنجر، کباب، کافی ڈیلائٹ، سوجی کی ٹکیاں، بادام کی ٹکیاں ہر چیز لاجواب بنی ہوئی اور ساتھ ساتھ میری سالی صاحبہ آمنہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے نے لاک ڈاؤن کا احساس ہی نہیں ہونے دیا اور ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ اور لذیذ کھانا دونوں سے بہت لطف اُٹھایا۔

بنیادی طور پر پاکستان سے ہی میرا ارادہ 17 مارچ 2020 کو واپس آنے کا تھا جبکہ عائشہ (میری بیگم) کی واپسی 18/اپریل 2020 کو ریاض سے ہونا تھی۔ میں چونکہ واپسی پر ایک مرتبہ پھر عمرے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا لہٰذا میری واپسی براستہ جدہ ہونا تھی مگر ہماری پاکستان سے روانگی کے اگلے دن ہی احسن بھائی جو ریاض میں ہمارے میزبان بھی تھے، کے بیٹے ڈاکٹر علی احسن کی شادی پاکستان میں طے پا گئی۔

شادی 17 مارچ جبکہ ولیمہ 21 مارچ کو لاہور میں منعقد ہونا تھا۔ کرونا وائرس کا ٹیسٹ نیگیٹو آنے کے بعد میں نے شادی میں شرکت کی غرض سے اپنی ٹکٹ جدہ کے بجائے ریاض سے کروالی اور ٹکٹ تبدیل کرواتے ہی اگلے دن ہوائی اڈّے عملاً بند کر دیے گئے۔ تادم تحریر ہم ریاض میں ہی اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ مقیم ہیں اور نہیں جانتے کہ ہمارا دانہ پانی اور کب تک ریاض میں لکھا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ میری فلائٹ 17 مارچ کو جدہ سے تھی اور میں نے کچھ اضافی رقم دے کر فلائٹ تبدیل کرائی تھی۔ میری 17 مارچ والی فلائٹ لاہور گئی مگر ریاض والی کینسل ہو گئی جو دانہ پانی لکھا ہونے پر میرا یقین اور پختہ کر گئی۔

گزشتہ تقریباً ایک ماہ میں، مَیں نے اپنی زندگی کے انوکھے ترین مناظر دیکھے۔ خصوصاً سعودی حکومت کے انتظامی معاملات۔ ان دنوں پورا ملک لاک ڈاؤن کی حالت میں ہے۔ کسی مسجد میں جمعہ کی نماز سمیت کوئی نماز نہیں۔ مسجد میں اذان کے فوراً بعد ہی لوگوں کو اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کا کہا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے ملک میں رویہ اس کے بالکل برعکس ہے جو ہماری کم علمی، وسائل کی کمی اور حکومتی ارادے کی کمزوری کی علامت ہے۔

میں اٹلی کے حالات پر بھی نظر رکھے ہوئے ہوں کیونکہ میرے چھوٹے بیٹے عبدالرحمٰن کی سسرال اٹلی میں ہے۔ ایسے میں جب پاکستانی عوام کے غیر سنجیدہ رویے کو دیکھیں جو بازاروں، پارکوں، مسجدوں اور درباروں کے علاوہ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹیشن اور وی آئی پی جنازوں میں شرکت سے بھی اجتناب نہ برتنے پر پاکستانی قوم کے ''موت تو برحق

ہے'' پر ایمان پر یقین آ گیا۔ بہرحال اگر ہم اٹلی جیسے برے حالات میں نہ بھی گئے تب بھی اٹلی جو دنیا میں معاشی طور پر 8 ویں نمبر پر ہے ہمارے پاس اس جیسے اسپتال اور سہولیات میسر نہیں اس لیے اس سے بہت کم مریض بھی ہمارے جیسے پسماندہ ملک کی معاشی حالت کو بہت زیادہ نقصان کا سبب بن سکتے ہیں۔

☆☆☆

18 مارچ تک ہم قصر نماز ہی ادا کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ لاک ڈاؤن رمضان سے پہلے ختم ہو جائے گا اور ہم رمضان اللہ کے حکم سے پاکستان میں ہی گزاریں گے مگر ۱۷ مارچ کے بعد ریاض میں اگلے پندرہ دن کے لیے شام تین بجے سے لے کر صبح چھے بجے تک کرفیو لگا دیا گیا۔ چنانچہ ہم فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ایک گھنٹا صبح کی سیر کرتے اور باقی دن اپنے نواسی نواسوں کے ساتھ گھر میں گزارتے۔ ہر صبح یہ امید لے کر جاگتے کہ لاک ڈاؤن ختم ہو جائے گا مگر حالات میں مزید سختی آ گئی اور کرفیو کا دورانیہ ۲۴ گھنٹے ہو گیا۔ اب گھر سے باہر اشد ضرورت کے لیے ہی نکلا جا سکتا ہے۔ وہ بھی صرف ایک فرد میڈیکل اسٹور، اسپتال یا اشیائے خورونوش کے لیے باہر نکل سکتا ہے اور یہ خریداری بھی صرف اپنے علاقے کی دکان سے کی جا سکتی ہے۔ کسی دوسرے علاقے میں جانے کی صورت میں 10000 ہزار ریال جُرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

اتنی سختی کے باوجود مریضوں کی بڑھتی تعداد سے ہمیں یہ اندازہ تو ہو گیا کہ لاک ڈاؤن ختم ہونا فی الحال تو دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں لہٰذا ہم نے قصر نماز ترک کر کے پوری نماز ادا کرنی شروع کر دی اور انفرادی نماز کے بجائے گھر میں باجماعت نماز کا اہتمام کیا۔ بیگم کا کہنا تھا کہ اس سال گھر پر تراویح کا انتظام کرنا ممکن نہیں تو یہیں پر تیاری کر لی

آنکھ تجلی ساز کہاں

رازِ غم، رازِ خوشی معلوم ہونا چاہیے
کچھ نہ کچھ تو زیست کا مفہوم ہونا چاہیے
آرزوئے مرگ میں بھی ہے سکونِ دل نہاں
ہر خوشی سے عشق کو محروم ہونا چاہیے
سوزِ دل کی آگ سے تم دور رہ سکتے نہیں
یہ محبت ہے تمھیں معلوم ہونا چاہیے
شکوۂ بیداد بھی اک طرح کا ہے انتقام
عشق کو مظلوم ہی مظلوم ہونا چاہیے
شعر ہے دراصل ماہر ترجمانِ واردات
دل پہ جو گزرے وہی منظوم ہونا چاہیے
دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے
آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے
سرو و صنوبر سب کو دیکھا
ان کا سا انداز کہاں ہے
دل خوابیدہ، روح افسردہ
وہ جوشِ آغاز کہاں ہے
پردہ بھی جلوہ بن جاتا
آنکھ تجلی ساز کہاں

(مولانا ماہر القادری)

جائے۔ لہٰذا میں نے قرآن کی دہرائی شروع کر دی اور الحمدللہ آٹھ روز میں مکمل کر لی۔

اس وائرس نے جہاں ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا وہیں اس نے بہت سی انہونی مگر اچھی چیزیں بھی تحفے میں دیں۔ مثلاً ہمارا خاندانی نظام جو غیر محسوس طریقے سے ابتری اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا، ماں باپ دونوں کی بیک وقت گھر میں موجودگی میسر آنے سے بچوں میں ایک صحت مند تبدیلی نے جنم لیا۔ وہ بچے جو والدین کی عدم توجہ کا شکار تھے، انھیں دونوں کا پیار ملا اور ان کے چہروں پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں وہیں والدین کو بھی یہ احساس ہوا کہ وہ کون سا راز ہے جو ایک مکمل اور بھرپور زندگی کا ضامن ہے۔ میں بھی اپنی مصروفیات کی وجہ سے پنے نواسوں نواسیوں کو بہت کم وقت دے پاتا تھا۔ اس وجہ سے وہ مجھ سے زیادہ مانوس نہیں تھے۔ مجھے اس بات کا بہت قلق رہتا تھا کہ وہ مجھ سے اس طرح محبت نہیں کرتے جیسے اپنے دادا سے۔ اب ۲۴ گھنٹے ان کے ساتھ گزارنے سے میں نے محسوس کیا کہ بچوں کو بزرگوں سے یکساں محبت ہوتی ہے صرف انھیں توجہ اور وقت دینے کی ضرورت ہے۔ اب وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کئی بزرگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ انھیں گھر کے بچے نظر انداز کرتے ہیں۔

اس وائرس نے گھروں میں بند بڑوں کو یہ احساس دلایا کہ بچے صرف توجہ چاہتے ہیں۔ انھیں محبت اور وقت دیں وہ خود بخود آپ کے بن جائیں گے۔ اب میں ان فرصت کے لمحات میں اپنے نواسے نواسیوں کی معصوم شرارتوں سے جی بھر کر لطف اندوز ہوتا ہوں اور ریاض میں گزرتا یہ وقت میری زندگی کا بہترین دور ہے۔ ان کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے مجھے اپنی پوتی ہشمہ رحیان بھی بہت یاد آتی ہے۔

لاہور سمیت وطنِ عزیز کے کتنے ہی شہر ماحولیاتی آلودگی اور گرد و غبار سے دھندلا رہے تھے، اس وائرس نے سب کو ایک مرتبہ پھر صاف شفاف تازہ ہوا اور نکھرے آسمان سے لطف اندوز کرا دیا۔ نسلِ نو نے بھی شاید پہلی بار ایسا خوبصورت ماحول پہلی بار دیکھا، جہاں نہ گاڑیوں کا دھواں، نہ ہارن کی بھدی کان چیرتی آوازیں، نہ شور و غل اور نہ گدلا آسمان۔

وائرس نے ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی دعوت دی کہ ہمیں مستقبل میں سانس کی بیماریوں سے بچنے اور ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے کون سے حفاظتی اقدامات کرنا ہوں گے۔ یہ سچ ہے کہ جہاں اس وبا نے ہزاروں جانیں لیں وہیں بلڈ پریشر اور ہارٹ اٹیک جیسی موذی بیماریوں کی وجہ سے اموات واقع ہونے میں نمایاں کمی دیکھنے کو ملی۔

یہی وائرس ہمیں موقع بھی دے رہا ہے کہ ہمارے بزرگ والدین جو ہماری گوناگوں مصروفیات کے سبب سارا دن ہماری راہ تکا کرتے تھے، اب ہم ان کی بہتر طور پر خدمت کر کے اپنی بہت سی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی چھوٹی سی کوشش کر سکتے ہیں۔ والدین کی بے لوث اور بے مثال محبت کا صلہ دینا تو شاید کبھی ممکن نہیں مگر اپنا وقت ان کی خدمت میں صرف کر کے انھیں اس کا چھوٹا سا حصہ لوٹایا جا سکتا ہے۔

سب سے بڑی اور اہم بات کہ یہ وائرس ہمیں موقع دے رہا کہ ہم گھر بیٹھ کر اُس ذات مقدس سے رشتہ جوڑیں اور مضبوط کریں جسے ہم روزمرہ کی مصروفیات میں بالکل بھلائے بیٹھے تھے، اور اس کی عطا کردہ نعمتیں بس اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے رہے۔ ہمارے پاس اس عظیم ہستی کے سامنے سر جھکا کر شکر ادا کرنے کا بھی وقت نہ رہا تھا۔ اس وائرس نے ہمیں وہ مہلت دی ہے کہ ہم اس ذات باری کا قرب حاصل کرنے کی سعی کر سکیں اور اس بار رمضان میں بھرپور عبادت سے مستفید ہونے کی اللہ ہمیں توفیق عطا کرے۔ آمین۔

☆☆☆

رمضان کریم

ہمیں اللہ سے ڈرنا ہے

میاں ثناء اللہ

نئے کورونا وائرس سے پھوٹنے والی وبا نے پوری دنیا کو خوف میں مبتلا کیے رکھا۔ اس وبائی مرض سے ہزاروں انسان موت کا شکار ہو چکے۔ عقل و فہم، انسانی شعور و آگہی، نت نئی سائنسی ایجادات کی معراج کو چھونے والا انسان اس نامعلوم اور ان دیکھی طاقت کے سامنے بے بسی کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ وہ انسان جو کل تک اس گھمنڈ میں مبتلا تھا کہ وہ اپنی تحقیق کی بنیاد پر کوئی مصنوعی انسان (نعوذ باللہ) بھی بنا ڈالے گا، آج وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے گھر میں دبکا بیٹھا ہے۔

اس مہلک اور جان لیوا مرض کے معرض وجود میں آنے کی جتنی بھی تعبیریں کی جائیں سب کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ انسان کے اپنے ہی ہاتھ کی کمائی ہے۔ اس لیے کہ میرا اور آپ کا رب یہ فرماتا ہے:

عقل و فہم کی معراج پانے والا انسان معمولی وائرس کے سامنے بے بسی کا مرقع بن گیا

''اور جو پہنچتی ہے تمہیں کوئی مصیبت سو وہ کمائی ہوتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی۔'' (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 30)

انسان جب اپنے خالق و مالک کے اقتدار، طاقت اور قوت کا مقابلہ کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کا خود مالک بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے اعمال و افعال کرنا شروع کر دیتا ہے جو اس کے مالک حقیقی کی ناراضگی کا ذریعہ اور سبب بنتے ہیں تو پھر بحر و بر میں فساد کا برپا ہونا قدرتی امر بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''برپا ہو گیا ہے فساد خشکی اور تری میں سبب اس کے جو کماتے ہیں ہاتھ، انسانوں کے تاکہ مزہ چکھائیں انھیں ان کے بعض اعمال کا شاید کہ وہ باز آ جائیں (الروم آیت نمبر 41)۔

آج کا انسان اپنے ایسے ہی کرتوتوں کی بنا پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے ہوئے ہے۔ ایک ایسی ہلاکت جو اس سے پہلے روئے زمین پر شاید کبھی نہیں آئی، جنگ عظیم اول اور دوم کی ہلاکت نے بھی زمین کے کچھ حصے کو متاثر کیا تھا۔ زمین کا ایک حصہ اور اس پر بسنے والی نسل آدم اس سے بھی محفوظ رہی تھی لیکن آج تو ایک ایسی ہلاکت برپا ہے جو قیامت کا منظر پیش کر رہی ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ ''العبس'' کے مطابق ہر رشتہ اپنے دوسرے رشتے سے منہ موڑے ہوئے ہے اور ہر ایک کو صرف اور صرف اپنی فکر ہے۔

وبائی مرض نے دنیا کی معیشت کو ہلا کر رکھ دیا۔ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں، ایک ایک شہر میں روزانہ اربوں روپے کی معیشت کا نقصان ہو رہا ہے اور ملکوں کا نقصان تو کھربوں کے حساب سے ہے۔ ماہرین معیشت اس بات کا اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ غریب ممالک یا جو ابھی ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں، ایسی ہی صورتحال اگر خدانخواستہ کچھ عرصہ اور رہی تو وہاں کے لوگ فاقوں کا شکار ہونا شرو ہو جائیں گے۔ غریب تو غریب، امیر ترین اور ترقی یا ممالک کو بھی اپنی معیشت ڈوبتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور جل یا بدیر اس خوف کی کیفیت سے نکلنے کے بعد بھی دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آتے میں سالہا سال کا عرصہ درکار ہوگا معیشت کی یہ تنگی بھی انسان کے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اس کا رب تو اسے پکار پکار کر کہتا ہے:

''اور جو منہ موڑے گا میری کتاب ہدایت سے تو یقی ہم اس پر اس کی معیشت کو تنگ کر دیں گے۔'' (طٰہٰ آیت نمبر 124)

جب انسان اللہ کی یاد سے منہ موڑ کر دنیوی زندگی لہو و لعب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شرم و حیا چھوڑ کر بے شرمی او بے حیائی میں فخر محسوس کرنے لگتا ہے۔ معاشی، معاشرتی طرح کے ظلم و ناانصافی کو اپنا وتیرہ بنا لیتا ہے جیسا آج کل دنیا میں ہو رہا ہے، تو پھر اللہ کہتا ہے:

''اور جو منہ موڑے گا اپنے رب کی یاد سے مبتلا دے گا وہ اسے سخت عذاب میں۔'' (الجن آیت نمبر 17)

انسان اپنے رویوں کی بنیاد پر اپنے رب کی ناراضی مو لیتا ہے۔ اپنی نافرمانیوں کے سبب اس کے غضب کو دعوت د ہے۔ سرکشی اختیار کر کے اسے انتقام لینے پر مجبور کر دیتا ہے جب انسان اپنی طاقت اور اقتدار کے نشہ سے سرشار ہو کر ا ہی جیسے انسانوں پر مشق ستم ڈھاتا ہے۔ ان کی عزتوں کو پائما کرتا ہے۔ ان کی آزادیوں کو سلب کر لیتا ہے۔ انھیں ان گھروں سے وطنوں سے نکال باہر کرتا ہے یا پھر انھیں ان گھروں میں محصور کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اس وقت چین کے مسلمانوں، فلسطین، شام، برما، ہندوستان، عراق اور کشمیر وغیر کے مسلمانوں اور دیگر انسانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور دنیا نسل آدم کا ایک حصہ ان ظالموں اور غاصبوں کا ہم نوا یا خاموش تماشائی ہے۔

مصنف کا تعارف

مصنف کا اصل نام محمد ثناء اللہ، نشریاتی نام میاں ثناء اللہ ہے۔ ۱۹۸۴ء میں انھوں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم اے اسلامک اسٹڈیز کی ڈگری حاصل کی۔ 1986 میں ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے اور تاحال منسلک ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۸۷ کو ریڈیو پاکستان نے قومی نشریاتی رابطے کا ایک پروگرام ''حی علی الفلاح'' کے نام سے شروع کیا جس کے بانی اور پروڈیوسر رہے۔ یہ پروگرام اب تک چل رہا ہے۔ دینی مسائل کا سیگمنٹ ''آپ نے پوچھا ہے''، ''عزت اور مقام''، جیسے کامیاب پروگراموں میں بہت سے نامی گرامی علما کرام کے ساتھ ۲۰۱۷ تک کام کیا۔ 1998ء میں ریڈیو پاکستان نے ایک پروگرام شروع کیا جس کا نام 'صوت القرآن' ہے۔ اس کے بانی اور پروڈیوسر، نیز تلاوت و ترجمے کا پروگرام، جو صبح ۵ سے رات ۱۲ تک نشر ہوتا ہے، اس کے بھی پروڈیوسر اور بانی ہیں۔ 2001ء میں ریڈیو پاکستان (پی بی سی) نے مذہبی پروگرام کرنے پر بہترین پروڈیوسر کے لیے نیشنل ایکسیلنس ایوارڈ سے نوازا۔ 2010ء میں وزارتِ مذہبی اُمور پاکستان نے حاجیوں کی راہنمائی کے لیے ایک کمپین 'اللھم لبیک' کے نام سے شروع کی۔ یہ نام انھی کا تجویز کردہ تھا جو منظور ہوا۔ ریڈیو پر اس کمپین کا پہلا پروڈیوسر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

جو اس ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھاتے یا اُٹھانے والے ہیں، ان کی آواز اتنی کمزور و نحیف ہے کہ وہ ان کے اپنے گھروں کے باہر تک سنائی نہیں دیتی یا پھر ان سنی کر دی جاتی ہے اور جو بزور ان مظالم کو بند کروانے کی طاقت رکھتے ہیں وہ اپنے مفادات اور دنیوی عیش و عشرت کو ان مظلوموں اور بے کسوں کی آہوں اور سسکیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ تو پھر اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے اور وہ اپنے کہے ہوئے کو پورا کر دکھاتا ہے اور نسل آدم کے اس گروہ کے بارے میں کہتا ہے:

''اور ضرور چکھائیں گے ہم ان کو مزہ دنیاوی عذاب کا بڑے عذاب سے پہلے شاید کہ وہ باز آ جائیں (۲۱) اور کون ہے بڑا ظالم اس شخص سے جسے یاد دہانی کرائی جائے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے پھر بھی وہ منہ پھیرے رہے ان سے۔ یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لے کر رہیں گے۔)السجدہ 21، 22)

یقیناً اس وقت نسل آدم بالخصوص اس کا بااختیار و بااقتدار طبقہ اور ان میں سے بھی بالخصوص اس کتاب کو ماننے والے اس پر ایمان لانے والے جس میں بار بار اللہ نے اپنے مظلوم بندوں کی مدد اور حمایت کے لیے پکارا ہے۔ اس پکار پر لبیک کہنے کے بجائے اس سے پہلوتہی کر کے مجرمانہ غفلت کا شکار ہیں اور اس روش کے اختیار کرنے سے اللہ کے غضب کو دعوت دے رکھی ہے۔

اللہ کو تو اولاد آدم کا خون بہت محبوب ہے اور یہ ناپسند ہے کہ اسے ناحق قتل کیا جائے اور پھر ایک مسلمان کا خون جس کی حرمت اللہ کے آخری رسول محمد ﷺ نے حرمت کعبہ سے بھی زیادہ بیان فرمائی ہے۔ آج جب بے گناہ، بے بس و بے کس عافیہ صدیقی کی پکار و عرش الٰہی تک پہنچتی ہو گی۔ درج بالا ممالک کے مسلمانوں اور دنیا بھر کے دیگر مقامات پر مسلمانوں کے ناحق گرنے والے خون کے چھینٹے آسمان کی طرف اُڑتے ہوں گے اور شام کی اس معصوم بچی کی اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچنے سے پہلے کی اس پکار نے کہ ''میں اپنے رب سے شکایت کروں گی کہ ہم پر ظلم کیا گیا۔'' عرش الٰہی کو ہلا دیا ہو گا۔ میرے اور آپ کے آقا حضرت محمد ﷺ نے مظلوم کی بددعا سے بچنے کا کہا ہے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے عرش کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی اور آج پوری انسانیت ایک انجانے خوف سے کانپ رہی ہے لیکن اپنے کیے پر پچھتانے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرنے کے لیے شاید اب بھی تیار نہیں۔

یاد رکھو! ایک مسلمان کے قتل کے مقابلے میں ساری دنیا کی تباہی کی اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ خاتم النبیین رحمت اللعالمین ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

زوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل رجل مسلم (الترمذی۔ مشکوٰۃ۔ کتاب القصاص)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل کے بالمقابل ہلکی ہے۔''

اللہ کے بندو! اس وقت کورونا کے نام سے پوری دنیا کو تباہی کی لپیٹ میں لینے والی یہ آفت اور مصیبت اللہ کی طرف سے آئی ہو یا ہماری نادانیوں کے سبب ہم پر مسلط کر دی گئی ہو، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم الحمدللہ ایک ایٹمی طاقت ہیں اور اپنے سے بڑی کسی ایٹمی قوت کو اللہ کی مدد سے للکار سکتے ہیں۔ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں۔ پوری قوم اپنے دین اور وطن کی خاطر متحد ہو کر لڑ سکتی ہے لیکن اللہ کے لشکروں کا مقابلہ پوری دنیا کی ایٹمی طاقتیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے کہ اللہ کے لشکر طاقت میں بہت زیادہ ہیں۔ پوری دنیا کے جن وانس مل کر اور اپنی تمام تر قوت و طاقت کو جمع کر کے بھی اللہ کے کسی ایک لشکر کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اللہ کے لشکروں پر نہ کوئی ایٹم بم کارگر ہے نہ ہی انھیں کسی کیمیائی ہتھیار سے مارا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کلسٹر بم ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ اللہ اپنے لشکروں کے بارے میں خود فرماتا ہے:

''واللہ جنود السمٰوت و الارض'' (سورۃ الفتح آیت نمبر 04)

ترجمہ۔ اور اللہ کے لشکر ہیں آسمانوں اور زمین میں۔

یہ ہوائیں، بارشیں، ژالہ باری، مچھر، مکھی، مینڈک، بادل، ٹڈیاں، مکڑیاں اور ابابیل وغیرہ، یہ سب اللہ کے لشکر ہی تو ہیں اور بظاہر کمزور ترین نظر آنے والے ان لشکروں نے بارہا اپنے اپنے وقت کی سپر طاقتوں کا غرور خاک میں ملا یا ہے۔ تاریخ گواہ ہے۔

یہ کورونا بھی اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہی تو ہے۔ اس وبا سے بچنے کے لیے جہاں حکومت کی آگاہی مہم اور ڈاکٹروں کی تجویز کردہ احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہے کہ ہمارا رب ہمیں حکم دیتا ہے، ''تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو'' (سورۃ البقرہ آیت نمبر 195)

ہمیں اللہ سے ڈرنا اور کورونا سے بچنا ہے۔

یہ بھی لازم ہے کہ ہم سب مل کر اس بات کا اقرار اور اعتراف کریں کہ:

اے ہمارے رب، اے ہمارے رحیم و کریم اللہ! ہم کمزور ہیں، تو طاقتور ہے۔ ہم سے نادانیاں ہوئی ہیں۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ تیرے فرماں بردار اور شکر گزار بندے بنیں گے۔ حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ یہ بھی عہد کریں کہ ہم تیری زمین پر تیرے بندوں پر ہونے والے مظالم بند کروانے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔ دنیا بھر کے بے گناہوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے آزاد کروانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے اور تیرے آزاد بندوں کو ان کی آزادی کا حق دلوانا اپنی اولین ترجیح بنائیں گے۔

ہم سب مل کر تیری طرف سے آنے والی کسی بھی آفت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں ہم سب مل کر توبہ کرتے ہیں بس تو ہمیں اس آزمائش سے نکال دے جیسا کہ تیرا وعدہ ہے۔

''تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو! اے اہل ایمان، تاکہ تم فلاح پا سکو)۔'' سورۃ النور آیت نمبر 31)

اے ہمارے رحمٰن و رحیم رب ہمیں معاف فرما دے۔

آمین یارب العالمین۔ ◆◆◆

جگ بیتی

مولانا مودودیؒ کی شگفتہ مزاجی

پروفیسر عبدالغنی فاروق

ضخیم جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مختلف اور متنوع موضوعات پر متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ بے حد وحساب قسم کا یہ وقیع علمی وتحقیقی اور فکری کام اس حالت میں تکمیل کو پہنچا کہ مولانا موصوف کو ملکی وغیر ملکی دفود سے بھی ملنا ہوتا تھا، سیاسی قائدین سے بھی ملاقاتیں کرنا ہوتی تھیں۔ ملک بھر میں برسرِ عمل اپنی جماعت کی سرگرمیوں کے ضمن میں ملک کے دور دراز گوشوں تک جلسہ ہائے عام سے خطاب بھی کرنا ہوتا۔ حکمرانوں اور اپنے ہم عصر مخالفین و معاندین کی سازشوں، منفی کارروائیوں اور اتہامات کے اثرات بھی ان تک پہنچتے۔ پھر وہ ایک ایک خط کا جواب بھی باقاعدگی سے دیتے اور روزانہ عصر تا مغرب مجلس عام بھی منعقد فرماتے جس میں ہر شخص ہر نوع کی بات کرتا اور ہر قسم کا سوال پوچھتا۔ الغرض مصروفیت کا عالم تھا کہ سالہا سال تک مولانا محترم عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کھانے کی میز پر بیٹھے اور صبح کی اذان تک مسلسل کام میں مصروف

بے بدل عالم دین اور منفرد سیاسی راہنما کی خوش طبعی و بذلہ سنجی کے تبسم انگیز واقعات

کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ اس امر کی تصدیق کریں گے کہ مولانا بے حد شگفتہ کلام اور خوش مزاج تھے۔ اُن کی باتوں میں جہاں وقار اور سنجیدگی کی خوشبو ہوتی، وہاں تبسم انگیز نکات بھی بیان ہوتے اور وہ شعر اُن پر صادق آتا تھا کہ

ہر حال میں میرا دل ناشاد ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند

راقم الحروف کو مولانا محترم کی عصری محفلوں میں حاضری کا شرف حاصل رہا۔ ان کی رحلت کے بعد موصوف کے بہت سے قریبی رفقاء اور عقیدت مندوں سے اُن کی باتیں سننے اور انھیں محفوظ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں نے ان حضرات سے دیگر باتوں کے علاوہ مولانا کی بذلہ سنجی، نکتہ طرازی اور شگفتہ مزاجی کے واقعات بھی دریافت کیے جنھیں آج میں پیش کر رہا ہوں۔ ان مطائبات سے مولانا محترم کی غیر معمولی ذہانت، نکتہ آفرینی اور بدیہہ گوئی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اچھا تو آپ اپنی شیخنی سمیت جا رہے ہیں

شیخ عبدالمالک ملتان کی تحریک اسلامی کے بزرگ قائد ہیں۔ مرنجاں مرنج اور بذلہ سنج۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اہلیہ سمیت حج کو جا رہے تھے۔ مولانا محترم سے ملنے گئے۔ انھیں پتا چلا تو برجستہ فرمایا: ''اچھا تو آپ اپنی شیخنی سمیت حج کو جا رہے ہیں۔''

یاد رہے کہ شیخ صاحب خود بھی پُرمزاح شخصیت ہیں اور اس حوالے سے مولانا محترم کا یہ ''جملہ'' مزید پُرلطف ہو جاتا ہے۔

دال بازار کا امیر

راوی گوجرانوالہ کے مشہور شاعر، نعت گو اور ادیب جناب راز کاشمیری مرحوم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا مرحوم گوجرانوالہ تشریف لائے۔ سٹیلائیٹ ٹاؤن میں ملک امین کے مکان پر اجتماع تھا جس میں مختلف حلقوں کے ناظمین اور اُمراء اپنا اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ ایک لحیم وشحیم صاحب کھڑے ہوئے اور اپنا نام بتانے کے بعد کہنے لگے: ''میں دال بازار کا امیر ہوں۔'' (دال بازار گوجرانوالہ کا مشہور تجارتی مرکز اور جماعت کا مقامی حلقہ ہے) مولانا نے انھیں دوبارہ ایک نظر دیکھا، مسکرائے اور فرمایا:

''اگر دال بازار کے امیر کا یہ حال ہے تو گوشت بازار کا امیر کیسا ہوگا؟''

''میں تو نکل آیا مگر......''

پروفیسر عبدالعزیز کمال کا بیان ہے کہ ۱۹۴۲ء میں مولانا پہلی مرتبہ سیالکوٹ تشریف لائے اور ریلوے اسٹیشن کے قریب چودھری عبدالحفیظ ایڈووکیٹ کے مکان پر ٹھہرے۔ انھیں جس کمرے میں ٹھہرایا گیا اس سے ملحق غسل خانہ بھی تھا۔ اپنی آمد کے تھوڑی دیر بعد مولانا غسل خانے میں تشریف لے گئے۔ باہر نکلے تو مسکرا رہے تھے۔ فرمانے لگے

''چودھری صاحب کا غسل خانہ خوب ہے۔ میں تو داخل ہوا، نکل بھی آیا مگر میری جگہ مولانا شوکت علی مرحوم ہوتے، تو داخل تو کسی نہ کسی طرح ہو جاتے لیکن پلٹ کر واپس آنا اُن کے لیے ممکن نہ ہوتا۔''

''کپکپی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے''

چودھری محمد اکبر مرحوم پنجاب کی ٹھیٹھ دیہاتی روایات کے امین تھے۔ وہ گنے کے بڑے شوقین تھے۔ جبکہ مولانا محترم دلی کا مخصوص نستعلیق مزاج رکھتے۔ چنانچہ جب چودھری صاحب گنے چوستے تو فرماتے: ''چودھری صاحب گنا آپ چوستے ہیں اور کپکپی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔'' (روایت ڈاکٹر میاں عبدالکریم صاحب برادرِ خورد چودھری محمد اکبر مرحوم)

''اوٹس عورت کی تصویر کے بغیر بھی اُبل سکتے ہیں''

پروفیسر عبدالعزیز کمال صاحب کا بیان ہے کہ قیامِ مراد پور کے دوران ایک مرتبہ ایک صاحب نے مولانا کو اپنے

تیار کردہ دلیے کے چند ڈبے تحفے میں پیش کیے۔ ڈبوں پر عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی جو چولہے کے پاس بیٹھی دلیا پکا رہی تھی۔ مولانا نے تحفہ وصول فرمایا، شکریہ ادا کیا اور تصویر کی جانب اشارہ کر کے فرمایا: ''اوٹس تو اس کے بغیر بھی اُبل سکتے ہیں!''

محمد علی نے چکور کو پانی کا جانور بنا دیا

ملک محمد امین نے بتایا کہ ۱۹۵۴ء یا ۵۵ء میں مولانا بیمار ہوئے تو آرام کی خاطر زیارت تشریف لے گئے۔ وہاں ایک ماہ قیام فرمایا۔ ایک شام کا ذکر ہے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ چودھری غلام محمد اور ڈاکٹر علوی بھی موجود تھے کہ ایک دوست نے چند چکور شکار کر کے بھیجے۔ وہ پکائے جا رہے تھے کہ اچانک کوئٹہ سے دس بارہ مہمان آگئے۔ باورچی کا نام محمد علی تھا۔ اُس نے مہمان دیکھ کر دیگچی میں پانی زیادہ ڈال دیا۔ جب یہ سالن مہمانوں کے سامنے آیا تو مولانا نے اس کی کیفیت دیکھ کر فرمایا: ''چکور جانور تو خشکی کا ہے، مگر محمد علی نے اسے پانی کا بنا دیا۔''

''ناظم شعبہ روحانیت''

قیام زیارت کے حوالے سے کوئٹہ کے فضل الٰہی قریشی نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک روز خاکروب مولانا کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری بیوی لڑ جھگڑ کر چلی گئی ہے۔ مجھے کوئی تعویذ دیں تاکہ سمجھا بجھا کر واپس لایا جاسکے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مولانا عبدالعزیز تشریف لائے، انھیں دیکھ کر مولانا مودودیؒ نے فرمایا، ''لو تمھارا کام بن گیا۔ ہماری جماعت میں تعویذ گنڈوں کے انچارج یہ صاحب ہیں۔ یہ تمھیں تعویذ لکھ کر دیں گے۔'' چنانچہ مولانا عبدالعزیز مرحوم نے اس خاکروب کو تعویذ لکھ دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے ہی دن اُس کی بیوی واپس آگئی اور وہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر آپ کے پاس آیا۔

اس پر مولانا مودودیؒ نے مولانا عبدالعزیز صاحب سے فرمایا: ''بس آج سے جماعت اسلامی کے شعبہ روحانیات کے ناظم بھی آپ ہوں گے۔''

آئینہ اور صحت

ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) کے معروف وکیل جناب محمد انور مغل نے بتایا: ''مجھے عصر و مغرب کے درمیان متعدد بار مولانا کے نیاز حاصل کرنے کی سعادت ملی۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے صحت کے بارے میں دریافت کیا، تو مولانا مختلف امراض کی تفصیل بتانے لگے۔

''لیکن مولانا، آپ کے چہرے سے تو اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ کی صحت اتنی خراب ہے۔'' اُس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھئی آئینہ دیکھ کر مجھے بھی یہی دھوکا ہوتا ہے۔'' مولانا نے فرمایا۔

''ہماری جماعت میں ایسے بھگوڑے بھی ہیں''

محمد انور مغل ہی نے بتایا کہ ڈسکہ میں ایک مرتبہ ڈاکٹر نذیر شہیدؒ تشریف لائے۔ انھوں نے مولانا کی شگفتہ مزاجی کا ایک واقعہ سنایا۔ ہوا یوں کہ جماعت کے متعدد راہنما پکنک کے لیے شالامار باغ گئے۔ مولانا بھی ہمراہ تھے۔ وہاں طے پایا کہ دوڑ کا مقابلہ ہو۔ اس میں مولانا سمیت سب اکابر نے دوڑ لگائی۔ پروفیسر خورشید آگے نکل گئے تو مولانا نے کہا: ''مجھے معلوم نہ تھا کہ ہماری جماعت میں ایسے بھگوڑے بھی موجود ہیں۔''

''یہ کس باقرخانی کا کُلچہ ہے''

ملتان کے درویش منش قائد تحریک مولانا خان محمد ربانی نے بتایا کہ ۱۹۵۳ء میں جب مولانا کی سزائے موت منسوخ ہو کر چودہ سالہ قید میں تبدیل ہوئی، تو انھیں لاہور سے ملتان لایا گیا۔ یہاں ایک دن محمد باقر خاں مرحوم (تحریک اسلامی کے ممتاز راہنما) اپنے چھوٹے بیٹے فیاض کے ساتھ مولانا کو ملنے کے لیے گئے۔ جیل کی ڈیوڑھی میں پہنچے تو مولانا تشریف

لائے اور گول مٹول پھولے ہوئے گالوں والے فیاض کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: ''یہ کس باقر خانی کا کلچہ ہے۔''

یاد رہے کہ باقر خاں مرحوم کی تین بیویاں تھیں۔

''جلیبی یا جلاب کی جمع''

اٹک کے محمد یوسف نے بتایا کہ میں گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں پڑھتا تھا۔ وہاں کے اُستاد اور معروف مصنف اُن دنوں تجدد اور آزاد فکری میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ایک روز کلاس میں میری اُن سے بحث چل نکلی۔ وہ کہتے تھے کہ اسلام میں مروجہ پردے یا برقعے کا کوئی تصور نہیں، جبکہ میں اس کے حق میں تھا۔ ثبوت کے طور پر میں نے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھی جس میں عورتوں کو اپنے چہروں پر اوڑھنیاں (جلابیب) لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جلابیب، جلباب (اوڑھنی) کی جمع نہیں ہے۔ جب میں نے کہا کہ پھر آپ بتائیں کہ اس کا واحد کیا ہے، تو کہنے لگے، ''یہ مجھے بھی معلوم نہیں، لیکن بہرحال اس کا واحد جلباب نہیں ہے۔''

میں نے مولانا مرحوم کو یہ بات سنائی تو مسکرا کر کہنے لگے ''غالباً ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جلابیب، جلیبی یا جلاب کی جمع ہوگی۔''

''آسمان بھی زاروقطار رونے لگا ہے''

اٹک کے محمد یوسف ہی نے بتایا کہ ایوب خاں کے دور میں لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس سے مولانا نے خطاب فرمایا۔ آپ تقریر کرنے اُٹھے ہی تھے کہ بارش ہونے لگی۔ کنونشن لیگی مخالفین نے ہانک لگائی:

''اللہ نہیں چاہتا کہ آپ تقریر کریں۔''

مولانا نے برجستہ جواب دیا: ''نہیں۔ زمین پر ظلم اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آسمان بھی زاروقطار رونے لگا ہے۔''

''ماں سے نسل''

مرحوم و مغفور مولانا معین الدین خٹکؒ نے دو مختلف ملاقاتوں میں مولانا مودودیؒ کے بارے میں تفصیلی گفتگو فرمائی۔ ''لطائف'' کے ضمن میں انھوں نے یہ واقعات سنائے:

۱۹۶۳ء میں جب مولانا ڈیرہ اسمٰعیل خان کے دورے پر تشریف لائے، تو مجھ سے پٹھانوں کی تاریخ دریافت کی۔ میں نے عرض کیا: ''عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ پٹھان باپ کی طرف سے اسرائیلی اور ماں کی طرف سے قریشی ہیں یعنی قیس عبدالرشید (بنی اسرائیلی) کی شادی حضرت خالد بن ولیدؓ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اسی بنا پر پٹھان یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم حضرت خالد بن ولیدؓ کی اولاد سے ہیں۔

مولانا نے یہ سن کر فرمایا، ''اچھا، تو پٹھانوں کی نسل ماں سے چلتی ہے۔''

میں نے بے ساختہ عرض کیا: ''جی ہاں، بالکل اسی طرح جس طرح سادات کی نسل ماں سے چلتی ہے۔''

اس سے مولانا بہت محظوظ ہوئے اور میری حاضر جوابی کی تعریف فرمائی۔

''چار سو بیسی''

مولانا معین الدین خٹک ہی نے بتایا: مولانا پشاور سے ڈیرہ اسمٰعیل خاں آئے تھے اور یہیں سے واپس پشاور جانا تھا۔ ڈیرہ پہنچ کر دریافت فرمایا، ''پشاور سے ڈیرہ کا فاصلہ کتنا ہے۔''

میں نے بتایا: ''دو سو دس میل۔''

برجستہ بولے: ''پھر تو آپ نے میرے ساتھ چار سو بیسی کی ہے۔''

''شیخ مودودی۔ سید نہرو''

مولانا جان محمد بھٹو مرحوم نے بتایا: ''ایک مرتبہ مولانا عرب کے دورے پر گئے۔ واپسی پر مرکزی شوریٰ میں خلیل حامدی وہاں کے حالات بتا رہے تھے۔ جب بھی عرب کے حوالے سے مولانا کا نام آتا وہ شیخ مودودی کہتے۔ ایک

صاحب نے پوچھا: ''کیا مولانا کو وہاں شیخ کہتے ہیں؟''

مولانا نے فرمایا: ''جی ہاں مجھے شیخ کہتے ہیں اور نہرو کو سید۔''

''پُوں پُوں''

۱۹۶۴ء کی کوئی تاریخ تھی۔ جیل کی بیرک کے صحن میں ایک مختصر سی روش تھی جس پر مولانا تین چار ساتھیوں کے ہمراہ ٹہل رہے تھے۔ وہ سب لوگ پہلو بہ پہلو چل رہے تھے کہ روش کی تنگ سی چوڑائی پر قابض تھے۔ اس اثنا میں، میں مدمقابل سمت سے آیا، تو مولانا نے ''پُوں پُوں'' کہا۔ گویا ہارن دے کر راستہ مانگ رہے ہوں۔ سب لوگ مولانا کی اس ادا پر بہت ہنسے۔

''مہمانوں کو بھی لے ڈوبے''

مولانا خان محمد ربانی نے جیل کے زمانے کا ایک واقعہ سنایا: ایک روز جیل میں مولانا کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ مختلف احباب غزلیں، نظمیں سنا رہے تھے۔ جیکب آباد کے احمد نور کی نظم کا ایک مصرع یوں تھا۔

صاحب خانہ ساتھ اپنے مہمانوں کو بھی لے ڈوبے

یہ سنتے ہی مولانا نے سر اٹھایا اور ہنس کر فرمایا: ''اوہ!'' (کھینچ کر) اور ساری محفل قہقہوں میں ڈوب گئی۔ اشارہ اس صورت حال کی جانب تھا کہ مرکزی شوریٰ کے سب لوگ گرفتاری کے وقت ۵۔اے ذیلدار پارک میں مقیم تھے۔ جہاں مولانا کی رہائش بھی تھی۔

اسی مشاعرے کے متذکرہ بالا مصرعے کے حوالے سے پروفیسر خورشید اپنی کتاب تذکرہ زنداں میں لکھتے ہیں کہ جیل میں مولانا کے پاس باہر سے جب بھی پھل یا مٹھائی آتی تو وہ ساتھیوں میں تقسیم فرما دیتے اور کہتے:

''دیکھیے جناب ڈبوتا ہوں، تو کھلاتا بھی ہوں۔''

''دوسری نظر سے دیکھنا منع ہے''

ملتان کے جناب خورشید احمد کانجو نے بتایا: ''ایک روز میں بھی مولانا کی محفل میں موجود تھا۔ ایک صاحب آزاد کشمیر سے آئے۔ مولانا کو وہاں تشریف لے جانے کی دعوت دے رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولانا وہاں کا پہلے بھی دورہ کر چکے۔ اُن صاحب نے اصرار کرتے ہوئے کہا: ''مولانا جی چاہتا ہے، آپ ایک مرتبہ دوسری نظر بھی دیکھ لیں۔''

''میرے بھائی! اسلام میں دوسری نظر ڈالنی منع ہے۔'' مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب میں فرمایا۔

''ایشور، عورت اور انسان''

تحریک اسلامی کراچی کے معروف کارکن جناب رجب علی نے قیامِ کراچی کے دوران کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا:

''مولانا دوپہر کے کھانے پر عموماً کوئی نہ کوئی پرلطف بات سنایا کرتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے: ''ہندوؤں کی روایات کے مطابق جب ایشور نے فیصلہ کیا کہ وہ دنیا بنائے گا تو دنیا کی تخلیق کے بعد ایک انسان بنا کر اس میں بھیج دیا۔ اب اتنی بڑی دنیا میں وہ تنہا مارا مارا پھرتا تھا۔ اس پر ایشور کو دَیا (رحم) آ گئی۔ اس نے ایک عورت بنا کر اس کے راستے میں بٹھا دی۔ جب انسان ادھر سے گزرا تو اس نے یہ نئی چیز دیکھی۔ اس کے چاروں طرف پھرا۔ اُس کا جائزہ لیا اور پھر بھاگا بھاگا ایشور کے پاس گیا اور کہا: ''اے ایشور! مجھے وہ چیز دے دے۔''

ایشور نے کہا: ''اچھا لے لے۔''

وہ لے گیا، مگر دو چار دن کے اندر واپس آ گیا اور کہنے لگا ''اے ایشور! میری اس سے نہیں نبھتی۔ اس کو واپس لے لے۔''

ایشور نے کہا، ''اچھا چھوڑ جا۔''

اسی طرح وہ آدمی بار بار عورت کو لے جاتا اور واپس کرتا رہا۔ بالآخر ایک دفعہ جب وہ لینے گیا تو ایشور نے برہم ہو کر کہا: ''یہ روز روز کا جھگڑا نہیں چلے گا۔ ایک فیصلہ کر لے۔ یا لے جا

یا چھوڑ جا۔"

اس نے کہا: "اچھا یہ بات ہے تو ایشور پھر دے ہی دے۔"

"آپ تو کچا ہی چبا جاتے ہیں"

گوجرانوالہ کے مجیب بٹ (جمعیت سے وابستہ ایک نوجوان) کو مولانا کی عصری محفلوں سے فیض یابی کا بہت موقع ملا۔ ایک ملاقات میں انھوں نے مولانا کی خوش طبعی کے متعدد حوالے دیے اور بتایا کہ مولانا ساتھیوں کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے اور تحسین فرماتے۔ ایک روز پالک اور ساگ کا ذکر آیا تو فرمایا: "آپ لوگ بھی کیا گھاس پات کھاتے ہیں؟"

شیخ فقیر حسین مرحوم نے برجستہ جواب دیا:

"مولانا ہم تو پکا کر کھاتے ہیں لیکن آپ تو کچا ہی چبا جاتے ہیں۔" یہ اشارہ مولانا کی پان خوری کی جانب تھا۔ مولانا مسکرا دیے۔

"بادل دھمکیاں دے رہے ہیں"

ایک روز لان میں، مَیں مولانا کے پاس ہی کھڑا تھا۔ کالی کالی گھٹائیں اُمڈ کر آئیں اور بادل گرجنے لگے۔ فرمایا:

"حفیظ جلدا ٹھالو..... بادل دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"آپ کو بھینسے نے ٹکر تو نہیں ماری"

ہمارے ایک دوست ایک دن گہرے سرخ رنگ کی شلوار قمیص پہن کر مولانا کی محفل میں آ بیٹھے۔ دیکھتے ہی فرمایا:

"راستے میں آپ کو کسی بھینسے نے ٹکر تو نہیں ماری؟"

"عجیب طوفانی ہوا"

اٹک کے محمد یوسف راوی ہیں: "ایوب خاں کے دور میں عید کے چاند کا قضیہ اٹھا تو سرکاری ترجمان نے بے بنیاد تاویلیں کیں۔ کہا گیا کہ پنجاب میں اُس وقت ایسی ہوائیں چل رہی تھیں جن سے فضا پر غبار چھا گیا اور چاند دکھائی نہ دیا۔ جبکہ صوبہ سرحد اس قسم کے حادثے سے محفوظ رہا۔ مولانا محترم نے یہ سنا تو فرمایا:

"جی ہاں یہ عجیب طوفانی ہوائیں تھیں کہ اٹک کا پل ہی پار نہ کر سکیں۔"

"نواز خاں صاحب کا جہاز"

نواز خاں کا تعلق ضلع سیالکوٹ سے ہے۔ کسی زمانے میں وہ اسی گلی میں رہائش پزیر تھے جہاں مولانا مرحوم کا مکان ہے۔ مولانا اس سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے مولانا کی خوش طبعی کے دو واقعات سنائے:

"میں جب اچھرے میں رہتا تھا تو میرے پاس ایک کار تھی۔ اس کا سائیلنسر کہیں گر گیا تھا اور وہ بے تحاشا شور کرتی۔ سوئے اتفاق کہ میں کئی دنوں تک نیا سائیلنسر نہ ڈلوا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھی عصر کے بعد میں کار پر وہاں سے گزرتا تو مولانا دریافت فرماتے: "نواز صاحب کا ہوائی جہاز جا رہا ہے؟" ایک رفیق نے کہا: "مولانا نواز خاں کو مشورہ دینا چاہیے کہ وہ کار کی مرمت کرائیں تاکہ شور کا یہ سلسلہ بند ہو۔" تو فوراً فرمایا: "نہ بھئی نہ اس سے تو مجھے ان کی خیریت کا پتا چلتا رہتا ہے۔"

"اسلامی قسم کی مس سیکرٹری"

مرحوم مصباح السلام فاروقی مرکز میں سیکرٹری نشر و اشاعت تھے۔ امریکا سے ایک خط آیا۔ پتے پر ان کا نام یوں لکھا تھا: "مس باح الاسلام فاروقی۔" مولانا ہنسے اور فرمایا: "امریکیوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مودودیؒ کے پاس بھی کوئی اسلامی قسم کی مس سیکرٹری کا کام کرتی ہے..... کاش وہ آ کر انھیں دیکھ سکتے۔"

"میں ڈینٹسٹ نہیں ہوں"

اٹک کے محمد یوسف ہی کی روایت ہے کہ مولانا راولپنڈی تشریف لائے۔ ایک محفل میں مخالفین کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ذکر آیا تو ایک صاحب نے کہا:

"مولانا آپ ان کو دندان شکن جواب کیوں نہیں دیتے۔"

"میرے بھائی میں ڈینٹسٹ نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔" مولانا نے جواب دیا۔

"پکانے والی آگ"

سیالکوٹ کے مخیر اور نیک نہاد رکن جماعت شیخ محمد فاضل مرحوم نے بتایا کہ قیام پاکستان سے قبل ایک مرتبہ مولانا سیالکوٹ تشریف لائے۔ چودھری عبدالحفیظ ایڈووکیٹ کے مکان پر محفل برپا تھی کہ چودھری محمد اقبال چیمہ ایڈووکیٹ نے مشورہ دیا:

"مولانا آپ کیوں ایسی تقریریں نہیں کرتے جو ملک میں چاروں طرف آگ لگا دیں۔"

مولانا نے مسکرا کر جواب دیا: "آگ کے ہم بھی قائل ہیں، مگر وہ جو پکانے والی ہو، جلانے والی نہیں۔"

"خسران مبین"

پروفیسر آسی ضیائی نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ لوگ ملک لال خاں کا ذکر کر رہے تھے۔ ملک صاحب مولانا محترم کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور دلچسپ بات یہ کہ موصوف مشہور صحافی، مولانا نصر اللہ خاں عزیز (مرحوم) کے خسر تھے۔

میں نے پوچھا: "مولانا یہ ملک لال خاں کیا ملک نصر اللہ خاں عزیز کے خسر ہیں؟"

مولانا نے برجستہ جواب دیا: "جی ہاں، یہ ہمارے ملک کے صاحب کے خسران مبین ہیں۔"

"استاد کا طائفہ"

سیالکوٹ کے سابق امیر جماعت ریٹائرڈ بریگیڈیئر نثار احمد قریشی نے بتایا:

۷۲-۱۹۷۱ء میں خرابی صحت کی وجہ سے مولانا بار بار ارکان جماعت سے کہہ رہے تھے کہ مجھے امارت کی ذمہ داریوں سے فارغ کر دیں۔ شوریٰ کے ایک اجلاس میں کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ کئی قیادت کو متعارف کرانے کے لیے مولانا چند حضرات کو ساتھ لیں اور ملک بھر کا دورہ کریں۔ اس پر مولانا نے برجستہ فرمایا:

"گویا استاد اپنا طائفہ لے کر چل پڑے۔"

اس کے بعد یہ تجویز زیر بحث نہ آ سکی۔

"یہ ہیں تو آپ کے نام"

یہ "لطیفہ" بھی مجیب بٹ صاحب نے بیان کیا:

یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ علما کے مختلف حلقوں کی جانب سے مولانا پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ایک روز گوجرانوالہ کے دو علما لاہور آئے۔ "تجدید و احیائے دین" کتاب کے حوالے سے بات چل نکلی تو مولانا نے فرمایا:

"علما اور دیگر لوگ اس کتاب کی جن باتوں پر معترض ہیں وہ دراصل شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف "تفہیمات الٰہیہ" سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ مجھے جتنی گالیاں بھی اب تک پڑ چکی ہیں، وہ میں جمع کرتا جا رہا ہوں۔ قیامت میں شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان کے حوالے کرتے ہوئے کہوں گا کہ یہ ہیں تو آپ کے نام مگر غلط پتے پر مجھے آ گئی تھیں۔"

مرغی کی کھالوں کا کاروبار

بنگلہ دیش کے ممتاز تحریکی قائد مولانا ابوالکلام یوسف نے بتایا کہ جب مولانا پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان تشریف لے گئے تو وہ جہاں بھی گئے کھانے میں انھیں مرغی کا گوشت پیش کیا گیا۔

اس حوالے سے ایک روز ایک تعارفی محفل برپا تھی۔ مختلف لوگ اپنا تعارف کرا رہے تھے کہ ایک صاحب نے بتایا: "میں کھالوں کا کاروبار کرتا ہوں۔"

"مرغی کی کھالوں کا؟" مولانا نے مسکراتے ہوئے برجستہ پوچھا۔

"وہ صاحب یہ سن کر پریشان ہو گئے اور حیران ہو کر

بولے: ”مولانا مرغی کی کھالوں کا کاروبار کون کرتا ہے؟“

”بھئی میں کئی دنوں سے آپ کے اس علاقے میں ہوں اور ہر کھانے میں مرغی کے سوا دوسرا گوشت دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں تو یہ سمجھا کہ یہاں گائے ہوتی ہی نہیں لہٰذا آپ کاروبار بھی مرغی کی کھالوں کا کرتے ہوں گے۔“

مولانا مودودیؒ کی شگفتہ طبعی کی یہ ساری مثالیں میں نے مختلف لوگوں سے سنی ہیں۔ اب میں کچھ ایسی باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو بالواسطہ طور پر میں نے مختلف لوگوں سے سنیں اور معنویت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

”سیاست کا گند اکھیل“

ممتاز ادیب اور دانشور اور صاحب طرز انشاء پرداز لالہ صحرائی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خاں کی دعوت پر مولانا لاہور کے گورنر ہاؤس میں تشریف لے گئے۔ ایوب خاں نے گفتگو کا آغاز یوں کیا کہ ”مولانا میں نے آپ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ماشاءاللہ آپ دین کی خوب خدمت کر رہے ہیں۔ میں بھاری فنڈز آپ کی صوابدید پر دیتا ہوں۔ آپ کوئی اکیڈمی قائم کریں اور اسلام کی تبلیغ کریں..... یہ سیاست کا کھیل بہت ہی گندا ہے۔ آپ کو اس میں نہیں آنا چاہیے۔“

مولانا حسب عادت سکون سے ایوب خاں کی بات سنتے رہے، پھر گویا ہوئے: ”تو آپ کا مطلب ہے کہ سیاست کا میدان گندا ہی رہنے دیا جائے۔ اس کی صفائی کا کوئی انتظام نہ کیا جائے؟“

ایوب صاحب لاجواب ہو گئے۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولے: ”مولانا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مذہب اور سیاست کا آپس میں کیا تعلق ہے؟“

”دیکھیے جناب۔“ مولانا نے جواب دیا: ”مذہب اور سیاست کے تعلق پر تو دو رائیں ہو سکتی ہیں مگر دنیا بھر میں کوئی ایک سیاسی مفکر بھی ایسا نہیں ہے جو فوج اور سیاست کے تعلق کو جائز سمجھتا ہو۔“

یہ سنتے ہی ایوب خاں پریشان ہو گئے..... پھر یہ گفتگو آگے نہ چل سکی۔

”دوسری بیویاں“

تعدادِ ازواج کے بارے میں مغرب پرست خواتین کے شور و غوغا پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک محفل میں مولانا نے فرمایا:

”اس احتجاج کی مہم میں زیادہ تر وہ خواتین ہیں جو اپنے شوہروں کی دوسری بیویاں ہیں۔ پکی بیویوں کو انھوں نے گاؤں میں بٹھوا دیا ہے۔ خود صاحب کے ساتھ پھرتی ہیں اور کثرت ازواج کے خلاف اس لیے واویلا مچاتی ہیں کہ صاحب کہیں تیسری نہ بٹھالیں۔“ (روایت اسعد گیلانی)

”بیوی شوہر نہ بن جائے“

ایک صاحب نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کے بارے میں سوال کیا۔ مولانا نے فرمایا:

”جائز ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک یہ کہ عورت محصنہ ہو، دوسرے یہ کہ وہ شوہر بن کر نہ رہے۔“ جواب میں حقیقت، حکمت اور ظرافت سبھی کچھ مضمر تھا۔

(روایت ڈاکٹر امر اللہ حسینی)

”معاشی یا بدمعاشی تکلۂ نظر“

پروفیسر بشیر احمد ساہی نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سرگودھا تشریف لے گئے۔ وہاں ایک محفل میں سہیل بکڈپو کے فیض صاحب (مرحوم) نے سوال کیا:

”مولانا ایک مولوی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ ضبط تولید اگر معاشی تکلۂ نظر سے نہ کیا جائے تو جائز ہے.....“

(مولوی صاحب کا اشارہ اُس حکم الٰہی کی طرف تھا کہ اپنی اولاد کو فریبی کے ڈر سے قتل نہ کرو)

”لیکن ضبط تولید کے حامیوں کا تکلۂ نظر معاشی نہیں بلکہ بدمعاشی کا ہے۔“ مولانا نے جواب دیا۔ ◆◆◆

ڈاکٹر طارق مسعود خان

گاؤں کی عید

عید کی آمد پر بچوں کی تیاریاں اور ضروری سامان کی خریداری عروج پر ہوتی ہے۔ تب شہروں میں آئے لاکھوں پردیسی اپنے اپنے علاقوں کا رخ کرتے ہیں۔ آبائی گاؤں میں رشتہ داروں کے ساتھ روایتی انداز میں عید منانا چھوٹے، بڑوں سب کی تمنا رہتی ہے۔ موجودہ دور میں ماہ رمضان اور عید الفطر کے تہوار کی مناسبت سے بہت سارے روایتی،

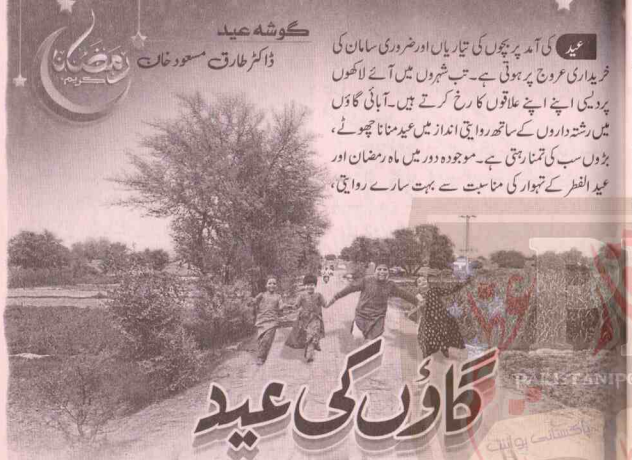

عہد رفتہ کی روح پرور یادیں جب لوگ معصومیت اور سادگی سے اپنے تہوار منایا کرتے تھے

خلوص سے بھرپور اور سادہ مگر خوشیوں سے مالا مال رسم و رواج معدوم ہو چکے۔ آج میں اپنے بچپن کے ماہ رمضان اور عیدوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو خوبصورت اور حسین ماضی میں کھو جاتا ہوں۔

اُس زمانے میں موبائل فون کا تو تصور بھی نہ تھا۔ دیہات میں ٹیلی وژن بھی شاذ و نادر ہی تھا۔ معلومات کا واحد ذریعہ ریڈیو ہوتا تھا اور وہ بھی چند لوگوں کے پاس۔ چنانچہ ماہ رمضان کا چاند لوگ کھلے میدان میں جا کر دیکھا کرتے اور پھر مقامی مسجد سے اس کی تصدیق یا تردید ہوتی تھی۔ تصدیق کی صورت میں ہر مسجد میں ''نغارہ'' بجایا جاتا تھا۔ چونکہ اُس دور میں مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر نہیں تھے چنانچہ ''نغارے'' کو ماہ رمضان میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ افطاری، تراویح اور سحری کے لیے مسجد کی چھت پر جا کر ''نغارہ'' بجایا جاتا۔ نغارہ ایک ڈھولکی نما چیز تھی جس کے اوپر چمڑا منڈھا ہوتا۔ دونوں ہاتھوں میں ڈنڈیاں پکڑ کر اُسے پیٹا جاتا تھا۔ اُس کی آواز تین چار کلومیٹر تک آرام سے سنی جا سکتی تھی۔ افطاری اور سحری میں میانوالی شہر میں نصب سائرن بھی جنہیں ہم ''گھگو'' کہتے تھے، بجائے جاتے۔ سحری کے وقت جگانے کے لیے گاؤں کا ڈھولچی بھی اونچی آواز میں کلام پڑھ کر ڈھول بجاتا مختلف گلیوں سے گزرتا تھا۔

گھریلو خواتین ماہ رمضان کی آمد سے قبل ہی ''روڑی تتی'' (مکھن سے دیسی گھی نکالنے کا عمل) کر کے دیسی گھی اور سویاں خاص طور پر تیار کر کے ذخیرہ کر لیتی تھیں تاکہ سحری اور افطاری میں پکائی جا سکیں۔ گھروں میں دو قسم کی سویاں تیار ہوتیں۔ دیسی سویاں لوہے کی مخصوص گھوڑی کے ذریعے تیار کی جاتی تھیں جو اکثر چارپائی کی پائنتی والے رخ پر نصب ہوتی۔ ایک طرف سے نیم گوندھا گندم کا آٹا ڈالا جاتا اور اوپر لگا ہینڈل گھمانے پر دوسری طرف سے باریک سوراخوں سے سویاں تیار ہو کر نکلتیں جنہیں خشک کر کے رکھ دیا جاتا۔

دوسری قسم کی کچی سویاں ہوتی تھیں جو گھڑے یا بڑے کٹورے کی پشت پر ہاتھوں سے رگڑ کر لمبی لمبی رسی کی طرح تیار کی جاتیں۔ دونوں قسم کی سویاں دیسی گھی اور دیسی گڑ کی شکر میں بہت مزے دار تیار ہوتی تھیں۔

ماہ رمضان شروع ہوتے ہی محلے کے موچی کو نئے جوتے یعنی ''کھیڑی'' کا ناپ اور رنگ برنگے بھڑکیلے نئے کپڑے خرید کر محلے کے درزی کو دینا عید کی تیاریوں کا ضروری جزو تھا۔ گاؤں میں دو ہی مواقع پر نئی جوتی اور نئے کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ ایک عید پر یا پھر انتہائی قریبی عزیز کی شادی کے موقع پر۔

ماہ رمضان میں سحری کے وقت گاؤں میں بڑا پیارا منظر ہوتا۔ موجودہ دور والے باورچی خانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ صحن میں دیواروں کے ساتھ مٹی سے بنے ''اوپن ایئر'' چولہے ہوتے۔ تقریباً ہر گھر میں سحری کی تیاری کے لیے جلائی گئی آگ نظر آتی۔ سحری کے واسطے خصوصی ایندھن ہوتا تھا جو جلد آگ پکڑ لیتا اور چولہا فوراً گرم ہو جاتا۔ سویاں، دہی، پراٹھا (ستا پڑی) اور چائے سحری کے مرغوب لوازمات تھے۔

افطاری بڑے سادہ طریقے سے کی جاتی۔ اکثر لوگ گڑ کے شربت سے افطاری کرتے۔ صرف کھاتے پیتے اور خوشحال لوگ کھجور اور پکوڑوں سے افطاری کر لیتے۔ کسی کسی گھر میں فریج ہوتا۔ لوگوں کی اکثریت شربت بنانے کے لیے برف خرید لاتی۔ گاؤں کے دو تین لوگ گدھا گاڑی پر کارخانوں سے لا کر گاؤں میں برف بیچتے تھے۔ کچھ لوگ کئی لوگ نہر کنارے لگے نلکوں کا رخ کرتے اور وہاں سے گھڑے اور بالٹیاں ٹھنڈے پانی کی بھر کر لاتے تھے۔

افطار کے بعد اکثر لوگ گھر ہی میں نماز پڑھ لیتے (اُس زمانے میں مسجدوں میں صرف بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ ہی نظر آتے تھے۔ آج کل میں نوجوان لوگوں کی

اکثریت کو مسجدوں میں دیکھتا ہوں تو خوشگوار حیرت اور خوشی ہوتی ہے) پھر تراویح کے ''نغارے'' کا انتظار ہوتا۔ شروع شروع میں تراویح پڑھنے والوں کا رش ہوتا۔ تراویح میں کچھ شرارتی بچے شرارتیں بھی کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ رش کم ہوتا جاتا اور بزرگ رہ جاتے۔ جب تراویح کی نماز ختم ہوتی تو مسجد سے نمازی نکل کر بلند آواز میں اللہ کا نام لیتے جسے ''ھانگرہ'' کہا جاتا۔ ''ھانگرے'' کی آواز سے پتا چل جاتا کہ اِس مسجد میں تراویح ختم ہو گئی۔ 8 تراویح پڑھنے والوں کے ''ھانگرے'' پہلے اور 20 تراویح پڑھنے والوں کے بعد میں لگتے تھے۔

ماہِ رمضان کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں عید کی تیاریاں زور پکڑ لیتیں۔ بچوں میں جو چیز سب سے زیادہ مقبول اور خوشی کا باعث ہوتی وہ مخصوص جھولے تھے جو گھروں اور محلوں میں بنائے جاتے۔ تین قسم کے اِن جھولوں کا نام یہ ہیں:

(۱) پینگھ
(۲) چھیتر
(۳) چچینگل

اکثریت کے گھروں میں صحن میں اُگے بڑے درخت کی ٹہنی کے ساتھ دو رسیاں باندھ کر پینگھ بنائی جاتی۔ اس کو ''پینگھ اڈراں'' بھی کہتے تھے۔ اس پینگھ پر جھولے لیے جاتے۔

چھیتر محلے میں ایک یا دو ہوتے۔ یہ گھریلو صحن میں یا گھر سے باہر بنائے جاتے۔ یہ پینگھ سے اِس طرح مختلف تھے کہ لکڑی کے دو اُونچے اُونچے مضبوط پول لے کر اُن کو چار سے پانچ میٹر کے فاصلے پہ زمین میں گاڑ دیا جاتا۔ اُن کے اوپر والے سرے ایک اور پول کے ذریعے آپس میں جوڑ دیئے جاتے اور اُس سے مضبوط دو رسیاں لٹکا کر جھولا بنا دیا جاتا۔ لڑکا یا لڑکی پینگھ یا چھیتر پر بیٹھ کر خود جھولے کھاتا یا کوئی اور اُس کو جھولا جھلاتا۔ اِس کو ''جھوٹے'' کہتے تھے۔

اگر کوئی ان کے اوپر کھڑا ہو کر جھولے کو تیزی سے جھلاتا اور بلندی تک لے جاتا تو اِس مخصوص جھولا جھولنے کو ''مچانٹری چاڑنا'' کہتے۔ چھیتر پر محلے کے بچے، بچیاں اور حتیٰ کہ بڑے لوگ کے مابین بھی ''مچانٹریاں چاڑنے'' کا مقابلہ ہوتا کہ کون جھولے کو زیادہ بلندی تک لے جاتا ہے۔

چچینگل محلے کے میدان یا بھورے (خالی پلاٹ جس پر بارش کی صورت میں باجرہ یا جوار وغیرہ کاشت کر دی جاتی۔ ویسے وہ بچوں کے کھیلنے کے میدان کے طور پر استعمال ہوتا) میں لکڑی سے بنایا جاتا۔ آج کے دور میں گول گھومنے

حکمت کی باتیں

پاؤں بے شک پھسلے مگر زبان نہ پھسلنے پائے۔
کچھ سیکھنا چاہتے ہو تو وقت سے سیکھو۔
موت، وقت اور گاہک کسی کا انتظار نہیں کرتے۔
جل کر کباب ہونے سے کھل کر گلاب ہونا بہتر ہے۔
خیرات مال میں اضافہ کرتی ہے۔
جیسے محبت تم اپنے ماں باپ سے کرو گے ویسے ہی محبت تم سے تمہاری اولاد کرے گی۔
یہ دنیا ایک بینک کی طرح ہے۔ آج اس میں جو جمع کرو گے کل قیامت والے دن اس میں سے وہی ملے گا۔
اپنی اصلاح دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔
آرام سے زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اپنے دل سے لالچ نکال دو۔
سچ بولنے والا دشمن جھوٹ بولنے والے دوست سے بہتر ہے۔

والا جھولا اِس چچینگل کی جدید شکل ہے۔ زمین کے وسط میں لکڑی کا ایک پول مضبوطی سے گاڑ دیا جاتا اور اُس کا اوپر والا سرا مخصوص شکل میں تراشا جاتا۔ لکڑی کا ایک دوسرا لمبا سا پول لے کر اُس کے درمیان میں گڑھا کھودا جاتا تاکہ وہ زمین میں گڑھے پول پر فٹ آجائے۔ اس لمبے پول کے دونوں سروں پر جھولے باندھ دیئے جاتے۔ ایک شخص اس لکڑی کو گھماتا اور کونوں پر جھولوں میں بیٹھے جھولا جھولتے۔ جھولے کی رفتار کو تیز کرنے اور موسیقی پیدا کرنے کے لیے سرسوں کا تیل اور لکڑی کے کالے انگارے دونوں پولوں کے درمیان لگا دیئے جاتے۔

شام کے وقت ان چھپتیروں اور چچینگلوں پر خوب رونق ہوتی۔ بچے اور بڑے لطف اندوز ہوتے اور بزرگ بیٹھ کر گپیں لگاتے اور یوں روزہ گزارتے۔ جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو عید کی خوشبو اور قریب آجاتی۔ آخری عشرے کی طاق شامیں اور راتیں نہ صرف مذہبی عقیدت سے منائی جاتیں بلکہ ان شاموں میں میٹھی ڈشیں بھی تیار ہوتیں۔ چاولوں کا زردہ اور حلوہ خاص کھانے تھے۔

''اکویویں'' ''ترویویں'' ''پنج ویویں'' اور ''ست ویویں'' پر ہر گھر سے بچے برتنوں میں ڈشیں لے کر اپنے رشتہ داروں، پیر خانے اور پڑوسیوں کے گھروں میں جاتے اور یہ ''بخرے'' دیتے۔ گاؤں کی بڑی مسجدوں میں موجودہ دور کی طرح ستائیسویں کو ختم قرآن کی تقریب ہوتی۔ ان مسجدوں میں اِس دن کافی رش ہوتا۔ بزرگ عبادت اور ثواب کے لیے اور ہم بچے مٹھائی کے چکر میں جو اکثر لڈو اور شیرینی پر مشتمل ہوتی تھی، مسجد میں جاتے۔ آخری تین چار سحریوں میں گاؤں کے بزرگ سحری کے وقت چاند کا سائز دیکھ کر اندازہ کر لیتے تھے کہ اس دفعہ عید 29 یا 30 روزوں کی ہوگی۔

آخری روزے شام کو لوگ کھیل کے میدانوں، چوکوں اور اونچی جگہوں پر جا کر عید کا چاند دیکھنے کی کوشش کرتے اور جو دیکھ لیتا وہ ''ھانگرہ'' لگاتا اور باقی لوگوں کو دکھاتا اور یوں پھر اُس شخص کا چرچا رہتا کہ اُس نے سب سے پہلے عید کا چاند دیکھا۔ جونہی چاند نظر آتا، خوشی سے ہوائی فائرنگ شروع ہو جاتی۔ ڈھولچی جو تمام رمضان میں سحری میں لوگوں کو جگایا کرتا تھا، ڈھول بجاتا ہوا ہر دروازے پر آتا اور عیدی وصول کرتا۔ حلوہ بنانے والا اپنے ساز و سامان (کڑاھیا اور شپیتا) لے کر پہنچ جاتا اور حلوہ بنانا شروع کر دیتا۔ خاندانوں میں چھوٹی موٹی ناراضگیوں کی صلح بھی اکثر چاند رات کو ہو جاتی۔

چونکہ عید کے بعد شادیوں کا سیزن شروع ہو جاتا چنانچہ شادی کی تاریخ پکی کرنے کی رسم جسے ''دیہاڑے رکھنا'' کہتے تھے، وہ بھی چاند رات کو کر لی جاتی۔ جن بچیوں کی منگنیاں ہوئی ہوتیں، اُن کو سسرال کی طرف سے کپڑوں، چوڑیاں، مہندی اور سویاں وغیرہ کا تحفہ بھیجا جاتا جسے ''وریڑاں'' کہتے۔ تب ہر چہرے پر خوشی نمایاں ہوتی۔

گھروں میں بڑی بہنیں چھوٹے بہن بھائیوں کو ہاتھوں میں مہندی لگاتیں۔ چاند رات خوشی کے مارے نیند نہ آتی تھی کہ صبح جلد ہو اور ہم نئے کپڑے پہنیں اور عیدی وصول کریں۔ صبح اُٹھتے تو اکثر بچوں کے چہروں پر بھی مہندی لگی ہوتی (رات سوتے میں مہندی والے ہاتھ چہرے پر لگ جانے سے) عید کے دن ہر کوئی جلدی اُٹھتا۔ نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے جاتے۔ تھوڑا سا حلوہ کھا کر مرد بچوں کے ساتھ مسجد نکل جاتے اور عورتیں چولہا سنبھال لیتیں۔ عید کی تکبیریں اور پڑھنے کی ترکیب پہ عمل کرتے ہوئے ہر دفعہ آزمائش سے گزرنا پڑتا۔ اکثر بچے غلطی کر جاتے۔

عید پڑھنے کے بعد سب لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے۔ تمام گھروں سے مرد ٹولیوں کی صورت میں نکل پڑتے اور تمام رشتہ داروں کے گھر عید مبارک کہنے

ضرورت ہی نہیں پڑتی......!!

شوہر نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا بیوی نے بڑے غصے سے کہا: ''تم کیسے شوہر ہو، ڈاکٹر ہو کر تھوڑا بھی اپنی بیوی کا خیال نہیں رکھتے۔ تم ہمیشہ باہر کے مریضوں کا ہی علاج کرتے رہتے ہو۔ کبھی تم نے میرا شوگر بی پی چیک کیا، تم نے کبھی مجھ سے میری صحت کے بارے میں دریافت کیا؟''

ڈاکٹر: ''بیگم! تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ میں تمہارا شوہر ہوں، گھر میں آتے ہی پہلے تم کو دیکھتا ہوں اور جیسے ہی تم کو دیکھا مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ تمہارا بی پی کتنا بڑھا ہوا ہے اور کتنا کم۔ اس لیے مجھے تم کو چیک کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔'' شوہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا......!!''

جاتے۔ عیدی دینے اور وصول کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ بچے برتنوں میں حلوہ اور عیدی لے کر یہ ''بخرے'' رشتہ داروں کے گھر پہنچاتے۔

بخروں کی تقسیم سے فارغ ہونے کے بعد ہم بچے دکانوں کا رخ کرتے۔ ہر بچہ اُس دن ''مالدار'' بھی ہوتا اور ''حاتم طائی'' بھی۔ ہر دکاندار نے اپنی دکان خوب سجائی ہوتی۔ بچوں کو متوجہ کرنے کے لیے نئے خوبصورت اور دلکش کھلونے اور دوسری اشیا رکھی جاتیں۔ کہیں جلیبیاں تو کہیں گرم گرم پکوڑے تیار ہو رہے ہوتے۔ گھروں میں اور بیٹھکوں پر خوب رونق ہوتی۔ جس گھر میں ماضی قریب میں کوئی ماتم ہوا ہوتا یا جوان موت ہوئی ہوتی، وہاں ماحول سوگوار ہوتا۔ تمام لوگ اُس گھر میں حاضری دیتے۔

اِدھر گاؤں میں عید کی خوشیاں جوبن پر ہوتیں تو اُدھر گاؤں سے دور کچھ فاصلے پر ٹولیوں کی صورت میں کچھ لوگ بڑے ''دھڑلے'' سے جوا بازی کر رہے ہوتے۔ بلکہ یہاں تک بعض سفید پوش اور شریف لوگوں نے بھی اِس میں شغل کے طور پر شامل ہونا عید کی خوشیوں کا حصہ بنا رکھا تھا۔ عید کا یہ دن ہنستے کھیلتے، بھاگتے دوڑتے، کھاتے پیتے، ملتے ملاتے آنکھ جھپکتے گزر جاتا۔

آج جب میں بچوں کو چالیس پینتالیس سال پیچھے ماضی میں لے جاتا اور ماہِ رمضان اور عید کی تیاریوں کے بارے میں بتاتا ہوں تو وہ بڑے غور، تجسس اور حیرت سے سنتے ہیں۔ موبائل، انٹرنیٹ، کمپیوٹر کے اس مشینی دور نے ایک ہی مکان اور ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والوں کو خاصی حد تک تنہا کر دیا ہے۔ اپنے سکون غارت کر کے ہم سکون کی تلاش میں ہیں۔ گاؤں کے پُرسکون ماحول، خوبصورت رسم و رواج اور سادہ طرزِ زندگی کو تیز رفتار، ہوس زدہ مشینی دور نے نگل لیا۔

اس کے باوجود کہ پچھلے کئی سال سے عید کے موقع پر میرے گاؤں میں گرمی اور ناقابلِ برداشت لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے۔ گو میرے گاؤں سے بہت کم اچھی اور خیر کی خبریں آتی ہیں۔ ان سب کے باوجود میرا گاؤں......اس کی گلیاں ......اس کی دیواریں......میرا آبائی گھر......وہ کمرے اور صحن جہاں میرا بچپن گزرا...... ماضی کی خوبصورت یادیں یہ سب مقناطیس کی طرح مجھے کھینچ رہی ہیں۔ میرا گاؤں، میری مٹی اور میری ثقافت ہی میری پہچان ہے۔ بچوں کی تعلیمی اور ملازمت کی مصروفیات اپنی جگہ اہم اور موجود لیکن ماضی کی طرح اس سال بھی عید الفطر اپنے گاؤں شہباز خیل میں منانے کا پروگرام ہے۔

◆●●

خصوصی کہانی

آنسوؤں کے آٹھ قطرے

جمیل اختر

دنیا ایک قرنطینہ

اس نے کھڑکی سے باہر کھلے پھولوں کو دیکھا تو ایک آہ سی سینے سے نکلی۔ اسے محسوس نہیں ہوا لیکن وہ رو رہا تھا، ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر ہاتھ پر آن گرا۔

اس نے اپنے بیٹے کو جو شہر میں تھا، میسج بھیجا:

''گھر میں رہنا اور باہر مت نکلنا۔''

تھوڑی ہی دیر میں موبائل کی اسکرین جوابی میسج سے چمکنے لگی:

''میں گھر پہ ہوں، آپ نے بھی باہر نہیں نکلنا۔'' حالاں کہ اس کا بیٹا اس وقت اپنے بینک میں موجود تھا۔ میسج

غم واندوہ میں ڈوبے وہ منفرد واقعات جنہیں وبا سے پیدا کردہ لاک ڈاؤن نے جنم دیا

بھیجنے کے بعد بیٹے نے اپنا موبائل ''سوئچ آف'' کر دیا تھا کہ اسے پانچ بجے سے پہلے بہت سا کام کرنا تھا۔

''میں بھی گھر پر ہوں، تمہارا بینک کتنے روز بند رہے گا؟'' اس نے ایک اور پیغام بھیجا اور جواب کا انتظار کرنے لگا لیکن وقت پھیلتا گیا حتیٰ کہ باہر سورج ڈوب گیا۔

وہ پریشانی کے عالم میں کمرے کے چکر کاٹنے لگا، آخر وہ جواب کیوں نہیں دے رہا؟ اس نے کئی بار فون کیا لیکن آگے فون بند تھا، ایسا کیوں؟ وہ خود سے یہ سوال پوچھتا تو گھبرا جاتا۔

''نہیں، نہیں ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے خود کو گھیرتے وسوسے سر جھٹک کر دور کیا لیکن وہ بیحد پریشان تھا۔ وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا کہ باہر وبا تھی سو وہ بیٹے کو میسج ہی کرتا رہا۔

''ٹھیک ہو؟''

''جواب کیوں نہیں دے رہے؟''

''سب خیریت تو ہے؟''

''بیٹا میں بہت پریشان ہوں''

رات گئے اس کے موبائل فون کی اسکرین چمکی۔

''بابا سوری، موبائل بند تھا، سب خیریت ہے، آپ پریشان نہ ہوں''

میسج پڑھ کر وہ قہقہے مارتے ہوئے رونے لگا۔

وبا کے دنوں میں دکھ، سکھ، ہنسی، خوشی، آنسو جیسی کیفیات اپنی حیثیت بدلنے لگتی ہیں، اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا ایک قرنطینہ ہے جس میں سب انسان قید ہیں۔

وَبا سے پہلے کا خواب

گبریل فرانسسکو وینس میں رہتا تھا۔ وبا پھیلنے سے پہلے اس کی زندگی ان دو باتوں کے گرد گھوم رہی تھی کہ وہ اِتنی رقم جمع کر لے کہ اس سے وہ ایک گاڑی اور اپنا ذاتی اپارٹمنٹ خرید لے۔ اِس کے لیے وہ بہت محنت کر رہا تھا اور دو جگہوں پر کام کرتا تھا۔

پھر شہر میں وبا پھیل گئی۔ شہر بند کر دیا گیا۔ دو سال پہلے تک اسے کبھی رقم جمع کرنے کا خیال نہیں آیا تھا لیکن پھر اس کی ملاقات اِزابیلا سے ہوئی اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اِزابیلا سے کہا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

''ایک ایسے شخص سے بھلا میں کیسے شادی کر سکتی ہوں جس کے پاس گاڑی نہیں اور وہ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے؟''

''میں یہ سب حاصل کر سکتا ہوں، مجھے کچھ وقت دو۔''

اس دن کے بعد وہ ایک مشین بن گیا، دن رات بس کام کام اور صرف کام۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ زیادہ سے زیادہ روپے بچالے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دو سالوں میں اپنے بینک اکاونٹ کو کافی بھر لیا تھا۔

وبا پھیلی تو حکومت نے شہر کا لاک ڈاون کر دیا۔ اس نے حکومتی اعلان کو نظر انداز کیا اور ایک ہفتہ مزید شہر میں پھرتا رہا حالانکہ جن دو جگہوں پر وہ کام کرتا تھا، وہ بند تھیں لیکن اس سے گھر نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک چھوٹے سے وائرس سے چھپ کر بیٹھ جانا ہرگز عقلمندی نہیں لیکن پھر ایک شام وہ گھر لوٹا تو اسے اپنے بدن میں درد محسوس ہوا۔

اگلے روز بخار اور چھینکوں سے اس کا ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہوگیا تھا۔ پہلی بار اسے حقیقتاً خوف محسوس ہوا۔

اس نے موبائل سے اپنا بینک اکاونٹ چیک کیا۔ ہاں اس کے پاس اب اتنے ''یورو'' جمع ہو چکے تھے کہ اس سے ایک گاڑی اور فلیٹ خریدا جا سکتا تھا۔ اب وہ اور اِزابیلا ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر غائب ہوگئی کہ ابھی تو وہ بیمار تھا۔

تیسرے روز اس کی طبیعت مزید خراب ہوگئی۔ اس

نے ایمرجنسی فون نمبر ملایا اور اپنی خراب صحت کے بارے اطلاع دی۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس اس کے دروازے پر تھی۔ اسے ہسپتال لے جا کر الگ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

دسویں روز اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ اگلے روز اس کو کچھ ہوش آیا تو اس نے قریب کھڑے ڈاکٹر کو اپنا آکسیجن ماسک ہٹانے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر نے سر کے اشارے سے منع کیا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، ڈاکٹر نے اس کا ماسک ہٹایا۔

اس کی آنکھوں سے مزید آنسو بہنے لگے۔ سانس اکھڑنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے بولا:

''ڈاکٹر! میں مر رہا ہوں۔ میرے موبائل میں ایک نمبر ہوگا، ازابیلا کا۔ اس پر بتا دیجیے گا۔ مرنے سے پہلے میرے پاس گاڑی اور فلیٹ خریدنے کی رقم جمع ہوگئی تھی لیکن پھر شہر میں وبا پھیل گئی۔''

وبا میں ڈوبتا منظر

وہ ایک فوٹو گرافر تھا، شہر شہر، قریہ قریہ گھوم کر قدرتی مناظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔

اسے بچپن ہی سے قدرتی مناظر سے عشق تھا، بارش ہوتی تو قطروں کی جلترنگ گھنٹوں سنتا رہتا جیسے یہ کوئی دلفریب ساز ہو، مٹی پر پڑتی بوندیں اس کے اندر خوشبو کا طوفان اٹھا دیتیں، پہاڑوں پہ جا کر اس کا جی چاہتا کہ وہ وہیں بس جائے اور صحراؤں کی راتیں اسے پاگل کر دیتی تھیں۔ وہ سوچتا یہ دنیا کس قدر حسین ہے۔ پھر جب وہ ساٹھ سال کا ہوا تو اس نے کیمرے کا استعمال ترک کر دیا کہ اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ دنیا جتنی حسین ہے اسے کسی بھی کیمرے میں نہیں سمویا جا سکتا۔ آدمی کو جتنا منظر میسر ہو، اتنا اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لے۔ وہ نگر نگر قدرت کے کرشمے دیکھنے کے لیے پھرتا رہتا۔

وہ شہر کے ان پہلے سو لوگوں میں شامل تھا جو وبا کا شکار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔

روز بروز اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ایک سہ پہر جب اسے محسوس ہوا کہ سانس کہیں اندھیرے میں گم ہونے لگی ہے تو اس نے ڈاکٹر سے کہا:

''کیا آپ میری آخری خواہش پوری کر سکتے ہیں؟ دراصل میں آخری بار سورج کو ڈوبتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وبا میں دیا گیا انٹرویو

ڈاکٹر علی مہدی تہران کے ایک سرکاری ہسپتال میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے کہ شہر کو وبا نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہاں ان کے پاس جدید آلات کی کمی تھی اور مریض تھے کہ ہزاروں کی تعداد میں اس وبا کا شکار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو رہے تھے۔

ایک شام ایک ٹی وی چینل نے ڈاکٹر علی مہدی سے انٹرویو لیا:

''ڈاکٹر صاحب، اس وبا میں آپ کے پاس مریضوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، آپ ان حالات پر کیا کہیں گے؟'' انٹرویو لینے والے صاحب نے سوال کیا۔

''ہمارے پاس اب اتنے مریضوں کو بچانے کے لیے کوئی گنجائش نہیں، حتیٰ کہ ہسپتال کے برآمدے اور صحن بھی مریضوں سے بھر گئے ہیں، ہسپتال میں صرف تین وینٹی لیٹر ہیں، ہم کتنے مریضوں کو بچائیں؟''

''تو کیا آپ عمر کے حساب سے مریضوں کو بچانے کا سوچ رہے ہیں؟'' اینکر نے پوچھا۔

''دیکھیں یہ سوال اسٹوڈیو میں بیٹھ کر پوچھنا بہت

آسان ہے لیکن آپ یقین کریں ایک ڈاکٹر کے لیے یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے، کل ہی ایک بزرگ جو اس وبا کا شکار تھے اور سانس مشکل سے لے رہے تھے، ہم نے انہیں وینٹی لیٹر پر منتقل کر دیا۔ پھر آدھے ہی گھنٹے بعد ہمارے پاس کئی نوجوان تشویش ناک حالت میں لائے گئے۔''

ڈاکٹر علی مہدی ایک لمحے کو رکے، جیب سے رومال نکال کر آنکھوں کے آگے کر لیا۔

''میں جب بوڑھے سے وینٹی لیٹر اتارنے لگا تھا تو اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جو میں وبا کے بعد بھی شاید کبھی نہ بھلا پاؤں۔''

تنہا آدمی کا المیہ

وبا کے بعد جب لاک ڈاؤن کا اعلان ہوا تو سارا شہر ویران ہو گیا، دور دور تک سڑکوں پر کوئی دکھائی نہ دیتا۔

وہ آدمی جو ساری عمر تنہا رہا تھا اور دفتر سے آنے کے بعد کتابوں میں گم ہو جاتا تھا، اب کئی روز سے کمرے میں قید تھا کہ شہر میں لاک ڈاؤن تھا۔ سوشل میڈیا، اخبارات اور ٹی وی چینلز لگاتار ان لوگوں کے انٹرویوز دکھا رہے تھے جو لاک ڈاؤن کے بعد تنہائی کا شکار ہو گئے تھے اور انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شہر کب اپنی اصل حالت میں واپس آئے گا اور وہ اپنے پیاروں سے پھر مل سکیں گے۔

کل ہی شہر کے میئر نے بیان جاری کیا تھا: ''زندگی کا اصل، ہنگامے ہی میں ہے، شور غل زندگی اور خاموشی موت ہے، جلد شہر پھر زندہ ہوگا۔''

لوگوں نے گھروں کو قرنطینہ بنا لیا تھا اور وہاں سے ویڈیوز بنا بنا کر اپ لوڈ کر رہے تھے کہ وہ اپنے کمروں سے اکتا گئے ہیں، یہ لاک ڈاؤن نجانے کب ختم ہوگا؟

وہ لوگوں کی ویڈیوز دیکھتا اور حیران ہوتا کہ آخر لوگوں کو گھروں میں رہنے سے پریشانی کیا ہے۔ دراصل لاک ڈاؤن کے بعد اس کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آنی تھی سوائے اس کے کہ اسے نو سے پانچ دفتر نہیں جانا پڑے گا۔

آبادی کے اعداد و شمار

وبا کے دوران عالمی ادارہ صحت کی ویب سائٹ پر وائرس سے متاثر ہونے والے نئے مریضوں اور پہلے سے مبتلا مریضوں کے مرنے یا صحت مند ہونے کے اعداد و شمار لمحہ بہ لمحہ اپ ڈیٹ ہو رہے تھے۔

سنتیا گو میلان کے ایک اخبار میں صحافی تھا۔ وہ شہر میں مرنے والوں کے اعداد و شمار مرتب کر کے روز اخبار کی ہیڈ لائین بناتا۔

''ستائیس مارچ کو 911 لوگ وائرس کی وجہ سے ہلاک ہوئے''

وہ یہ خبر اپنے کمپیوٹر پر لکھ کر پانی پینے کے لیے اٹھا۔

واپس آ کر اس نے ایک نظر اپنی خبر پر دوڑائی اور عالمی ادارہ صحت کی ویب سائٹ کے صفحے کو ریفریش کیا۔

اعداد و شمار بدل گئے تھے۔

پیچھا کرتی آوازیں

رات گئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کمرے کی کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جب میں سونے کی کوشش کرتا ہوں تو ایک آواز سی آتی ہے، مجھے کوئی بلا رہا ہے۔ تین دن سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے لیکن میں باہر نہیں جا سکتا۔

تین دن پہلے جب میں انجلا کو پھول دینے اسپتال گیا تو وہ ایک الگ کمرے میں بند تھی۔ اس سے ملنا منع تھا۔ میں نے شیشے کے پار کھڑے ہو کر ہاتھ ہلایا، وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اگر وہ خود کو دیکھ پاتی تو نہ پہچانتی۔

اس نے ہاتھ بلند کیا، جیسے وہ مجھے گڈ بائے کہہ رہی ہو یا شاید وہ مجھے بلا رہی تھی۔ معلوم نہیں لیکن میں اس کے پاس

نہیں جاسکتا تھا۔

بھوک کا وائرس

جب سے شہر میں وائرس نے حملہ کیا تھا لوگ گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے لیکن اَچھو کہاں جاسکتا تھا؟

وہ ایک مزدور تھا، روز شہر کے چوک پر بیٹھ کر رزق کا انتظار کرتا اور اب تو سڑکیں آدمیوں سے خالی ہوگئی تھیں۔

''حکومت مزدوروں کے لیے رقم اور راشن کا انتظام کر رہی ہے، یونین کونسل کے دفتر میں جا کر اپنا نام لکھواؤ۔'' ایک دن ایک پڑھے لکھے بابو نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس سے کہا۔

''اوہ تو نام لکھوانے سے راشن مل جائے گا؟''

''ہاں ہاں، وبا میں راشن حکومت کے ذمے ہے، فوراً جاؤ۔''

وہ اسی وقت یونین کونسل کے دفتر جا پہنچا۔ وہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ دور تک لمبی قطار، جیسے سارا شہر ہی غریب ہو، وہ قطار میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں یونین کونسل کے عملے کے علاوہ کسی نے بھی حفاظتی ماسک نہیں پہن رکھا تھا، شاید اِن غریبوں کا خیال تھا کہ بھوک سے بڑا کوئی وائرس نہیں۔ چار گھنٹے بعد اس کا نمبر آ گیا، اس نے نام اور شناختی کارڈ نمبر لکھوا دیا۔ اسے کہا گیا کہ تین دن بعد آ کر پتا کرے۔

آج آٹھواں روز ہے، راشن معلوم نہیں کہاں رہ گیا ہے۔

وَبا میں ایک شادی

ایک مہینا پہلے، ہاں بالکل ایک مہینا پہلے وہ کتنی خوش تھی۔ دن تھے کہ گزر ہی نہیں رہے تھے۔ عامر نے جو اس کا بچپن سے منگیتر تھا، دبئی سے آنا تھا اور تیئیس تاریخ کو ان کی شادی طے تھی۔ آخر پندرہ تاریخ بھی آ گئی، اس دن عامر کا جہاز لاہور اترنا تھا۔ لالا اور ان کے سارے دوست ایک گاڑی پر اسے لینے گئے تھے اور جب وہ گاؤں واپس آئے تو صفیہ نے اسے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ دو سال میں وہ کتنا بدل گیا تھا، مونچھیں لمبی لمبی اور پہلے سے کچھ موٹا بھی ہو گیا تھا۔

''شادی ہوجائے پھر تو کہوں گی روز ورزش کیا کرے۔'' وہ یہ سوچ کر مسکرادی۔

شادی کی تاریخ تیئیس طے تھی کہ ملک میں وبا پھوٹ پڑی۔ حکومت نے لاک ڈاؤن نے کا اعلان کر دیا اور لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے۔

''اب کیا ہوگا؟ کیا ہماری شادی کبھی نہیں ہوگی اور ہم ایسے ہی اپنے گھروں میں بند رہیں گے؟''

وہ بہت پریشان تھی۔ بڑے چچا ایک دن گھر آئے اور اس کے ابا سے کہا کہ شادی تیئیس کو ہی ہوگی، لوگ نہیں بلائیں گے، بس خاندان کے لوگ ہی ہوں گے۔ لیکن شادی ضرور ہوگی۔

ڈھولکی جو چند روز ہوئے رک گئی تھی پھر بجنے لگی اور تیئیس تاریخ کو وہ بیاہ کر عامر کی ڈولی میں آن بیٹھی۔

رات گئے جب وہ کمرے میں آیا تو بے تحاشا کھانس رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کھانستے کھانستے فرش پر گر گیا۔

وہ گھبرا گئی۔

''پانی دوں آپ کو؟'' لیکن وہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے تڑپ رہا تھا۔

وہ باہر کو دوڑی۔

''بڑے چچا وہ، وہ عامر کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔

سب دوڑ کے کمرے میں آئے تو وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

''ایمبولینس بلاؤ۔'' بڑے چچا چیخے۔

ایمبولینس آئی لیکن لاہور پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ ◆◆◆

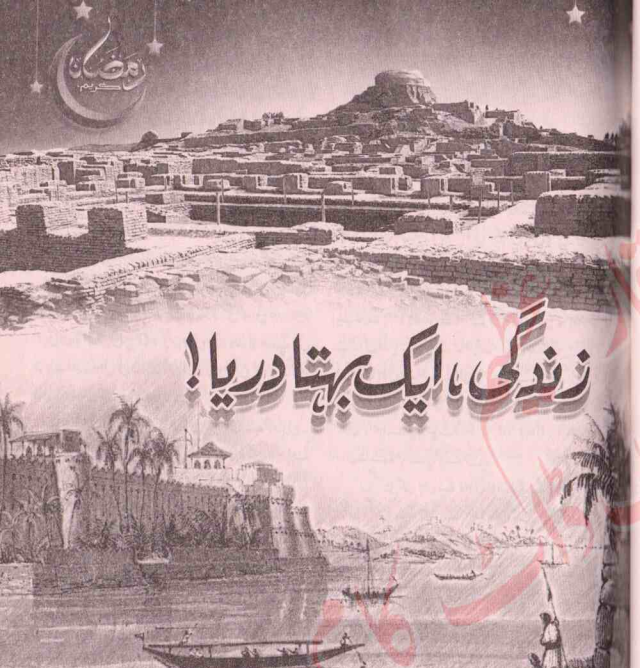

زندگی، ایک بہتا دریا!

انسانی حیات اور بہتے دریاؤں میں مماثلت و یگانگت کی کڑیاں ملاتی فکر و فلسفے میں ڈوبی یادیں

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

اب جبکہ میں زندگی کے آخری حصے کا راہی ہوں، گزری ہوئی حیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اور بہتے دریا میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں کا دورانیہ مختلف اور بدلتی ہوئی کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔

جس طرح دریا پہاڑی علاقوں سے ناتواں شاخوں کی صورت شور مچاتا، گرتا، پڑتا نمودار ہوتا ہے اور ندی نالوں سے تقویت حاصل کرتا چوڑے، چکلے دریا کی حیثیت سے میدانی علاقوں کی پیاسی زمین کو سیراب کرتا ہوا بالآخر سست روی کے ساتھ سمندر میں ضم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی روتا ہوا بے سروسامانی کے عالم میں جوانی کے دور میں داخل ہو کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے گزرتا ہے۔ پھر ڈھلتی جوانی اور ادھیڑ عمری کی ڈھلوانوں پر محتاط پیش قدمی کے بعد بڑھاپے میں نقاہت اور ناتوانی کی حالت میں اپنا مال و متاع چھوڑ چھاڑ کر خالی ہاتھ راہی مُلک عدم ہو جاتا ہے۔

انسانی آبادی کی طرح دنیا میں دریا بھی بے شمار ہیں۔ ان سب کی اپنی اپنی داستانیں ہیں۔ وہ پیاسی زمین کو سیراب کرتے ہیں اگر غیظ و غضب میں آ جائیں تو برباد بھی۔ مثال کے طور پر دریائے سندھ ہی کو لیجیے۔ دریائے سندھ کی وادی کا تمدن، دنیا کا قدیم ترین تمدن مانا جاتا ہے۔ اس دریا نے نہ صرف ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھایا بلکہ ان میں رابطہ کا ذریعہ بھی فراہم کیا اور جب طغیانی میں آپے سے باہر ہوا تو اس نے موہنجوداڑو کو نیست و نابود کر کے اپنے ساتھ لائی ہوئی مٹی میں دفن کر دیا۔

دریائے نیل جو دنیا کا سب سے لمبا دریا اور 6000 سال قبل مسیح سے رواں دواں ہے، خلافت عثمانیہ کے لوگوں کی زندگی کی مثال پیش کرتا ہے۔ جس طرح خلافت عثمانیہ میں لوگ پیدا ایک ملک میں ہوتے، تعلیم دوسرے دیس میں حاصل کرتے تھے، ملازمت کسی تیسرے ملک میں، شادی کسی چوتھے ملک میں اور مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے وفات کسی اور ملک میں پاتے تھے۔

اسی طرح دریائے نیل استوائی افریقہ میں واقع وکٹوریہ جھیل سے نیل الابیض (سفید نیل) کے نام سے جنم لیتا ہے۔ گیارہ ملکوں (مثلاً تنزانیہ، یوگنڈا، برونڈی، کانگو اور کینیا وغیرہ) کو سیراب کرتا ہوا جنوبی سوڈان میں ابی سینیا کی پہاڑیوں (Abyssinian High Lands) سے نکلے ہوئے نیل الازرق میں مل کر دریائے نیل بنتا ہے اور بالآخر ایک بہت بڑا ڈیلٹا بناتے ہوئے بحیرۂ روم میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اس دریا کے باعث نہ صرف دنیا کی قدیم ترین تمدنوں کی نشوونما ہوئی بلکہ اس نے ان کو برباد ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ سوڈان اور مصر میں اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مصری عوام اسے پدرِحیات (Father of Life) اور مادر انسانیت کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس ضمن میں دریائے راوی اور دریائے وادی الکبیر کا ذکر بھی ناگزیر ہے جنھوں نے ہندوستان میں مغلوں اور اسپین میں مسلمانوں کی حکومتوں کا عروج و زوال دیکھا۔ راوی نے اپنے کنارے کامران کی بارہ دری میں مغل شہزادوں اور شہزادیوں کا سولہ سنگھار دیکھا۔ شاہی قلعے کا کروفر اور شان و شوکت دیکھی اور شہنشاہ جہانگیر کو دفن ہوتے دیکھا۔ راوی نے اپنے کنارے علامہ اقبالؒ کو محویت کے عالم میں چہل قدمی کرتے ہوئے بھی دیکھا جنھوں نے راوی کی اس وقت کی کیفیت پر ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر مندرجہ ذیل ہے۔

سکوتِ شام میں محو سرور ہے راوی
نہ پوچھو مجھ سے جو ہے کیفیت میرے دل کی!

آج کل راوی کے پل کے نیچے پانی نہیں بہتا، یہ گدلے پانی کے جوہڑ میں تبدیل ہو گیا ہے اس میں کچھ بھینسیں نہاتی ہوئی نظر آتی ہیں اور کنارے پر جھگیاں بن گئی ہیں۔

جب اقبال مسجدِ قرطبہ میں نماز پڑھنے گئے تو مسجد کے ساتھ بہتے ہوئے دریائے وادی الکبیر سے اس طرح مخاطب ہوئے۔

آبِ رواں کبیر! کنارہ کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانہ کا خواب

اسی دریا کے پل کے درمیان جا کر میں بھی محویت کے عالم میں اس کے کٹھہرے کے ساتھ لگ کر کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ میرے دائیں جانب مسجد قرطبہ کی وسیع و عریض ویران عمارت عہد رفتہ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اس مسجد کے ایک کونے میں ایک گرجا قائم کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ بنا ہوا سلطان کا شکستہ محل مقام عبرت ہے۔ اس محل کے ایک حصے کو جیل خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اقبال اور میرے تاثرات جداگانہ تھے۔ میں حسرت و یاس کا شکار تھا لیکن اقبال رجائیت کے پیامبر تھے۔ وہ اپنی کشتِ ویران سے ناامید ہونے کے بجائے کہہ رہے تھے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

میں نے دریائے وادی الکبیر کو اشبیلیہ میں بھی بہتے دیکھا ہے۔ وہاں اس کے کنارے محل ''القصر'' کے نقش و نگار قابل دید ہیں۔ اس محل میں کبھی عرب بادشاہ معتمد رہا کرتا تھا جو شاعر بھی تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں شائع ہو کر ''وزڈم آف ایسٹ سیریز'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ معتمد کو شکست کے بعد قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اقبالؒ نے ''معتمد کی قید خانے میں فریاد'' کا بڑے مؤثر انداز میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

ایک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی!

معتمد کے بعد ملکہ ازابیلا اور شہنشاہ فرڈینینڈ نے القصر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس محل کے ساتھ ایک عالیشان گرجا ہے جو کبھی بارہویں صدی میں مسجد تھی، جس کے مینار سے کبھی اذان کی صدا آتی تھی، آج کل گرجا کی گھنٹیاں سنائی دیتی ہیں۔

دریائے وادی الکبیر کے دائیں طرف اشبیلیہ کا قدیم شہر ہے جو کبھی اپنی بل کھاتی گلیوں، اندرونی صحن والے سفید مکانوں، باغیچوں، فواروں اور بالکونیوں کے لیے مشہور تھا۔ یہ شہر ابن خلدون کو بے حد پسند تھا اور اس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ دریاؤں کی داستان، انقلابات کی داستان ہے۔

بعض دریاؤں کی خاصیت انسانی معاشرے میں ان لوگوں جیسی ہے جو مختلف کنبوں اور قبیلوں کو آپس میں جوڑتے ہیں اور بعض شخصیات تفرقہ پھیلا کر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہیں۔ جیرڈ ڈائمنڈ (Jared Diamond) اپنی کتاب، گنز، جرمز اور سٹیل (Guns, Germs, and Steel: The Fates of Human Societies) میں رقم طراز ہیں کہ چین کے دو بڑے دریاؤں ییلو دریا (Yellow River) اور دریائے یانگشی (Yangtze River) نے جو مغرب سے مشرق کی طرف بہ کر بحرالکاہل میں گرتے ہیں، چین کو جو مختلف قبائل میں منقسم ہے، سیاسی اور لسانی طور پر بٹنے نہیں دیا۔ اس کے برعکس یورپی دریاؤں نے یورپ کو نہ صرف سیاسی طور پر مختلف قومیتوں اور ملکوں میں بانٹ دیا بلکہ لسانی طور پر بھی یکجا نہیں ہونے دیا۔ ان دریاؤں کی اپنی اپنی وادیاں، پھل، پھول اور تہذیبیں ہیں۔

چنانچہ دریائے رائن (Rhine) شمال میں جینیوا کی جھیل سے نکل کر سوئٹزرز لینڈ میں جنوب کا رخ کرتا ہے، دریائے دورو (Duoro) سپین کے وسطی علاقہ سے نکل کر پرتگال کی طرف مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے۔

دریائے البی (Elbe) اور وستولا (Vistula) جرمنی اور پولینڈ میں جنوب سے شمال کی طرف بہ کر شمالی سمندر اور بالٹک میں ضم ہوجاتے ہیں۔ دریائے وولگا (Volga) یورپ کا سب سے لمبا دریا ہے اور روس کے گیارہ شہر اس کے کنارے پر آباد ہیں۔ پہلے یہ دریا شرقاً غرباً بہتا ہے پھر اس کی سمت شمالاً جنوباً ہوجاتی ہے اور بالآخر بحرہ کیپیین (Caspian Sea) میں ضم ہوجاتا ہے۔

ڈینوب (Danube) یورپ کا دوسرا سب سے لمبا دریا ہے۔ یہ جرمنی کے بلیک فورسٹ (Black Forost) نامی علاقے کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے اور نو ملکوں کو سیراب کرتا بحر اسود میں گرجاتا ہے۔

رائن (Rhine) الپس (Alps) کے پہاڑوں سے نکل کر جرمنی میں اور دریائے سین (Seine) فرانس میں مشرق سے مغرب کی طرف بہتے ہیں اور دریائے پو (Po) وینس (Vinice) کے شہریوں کی پیاس بجھاتا ہوا غرباً شرقاً بہتا ہے۔

ایک ہی سمت بہنے والے دو چینی دریاؤں کے باعث سیاسی اور لسانی یکجہتی کے ابتدائی فائدے تو ملے مگر چین کی تکنیکی نشوونما کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ اس کے برعکس مختلف سمت یورپی بہتے دریاؤں کی اپنی منفرد وادیوں اور سیاسی اور لسانی بٹوارے کی وجہ سے متعدد ملکوں اور ریاستوں میں منقسم ہونے کے باوجود یورپ تکنیکی نشوونما میں چین سے سبقت لے گیا۔ اس کی وجہ جیرڈ نے اپنی مذکورہ کتاب میں یہ بتائی ہے کہ مختلف بادشاہوں اور شہزادوں میں بٹنے کے باعث یورپ میں ایک دوسرے سے مقابلے اور سبقت لے جانے کا جذبہ بدرجۂ اتم غالب رہا۔ جبکہ چین میں ایک سیاسی حکومت کے باعث وہاں کے حکمران کا فیصلہ حتمی حیثیت رکھتا تھا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے جیرڈ رقم طراز ہے کہ ابتدائی سیاسی اور لسانی فائدے کے باعث عہد وسطیٰ میں چین تکنیکی اعتبار سے دنیا کے سب ملکوں سے سبقت لے گیا تھا۔ اس زمانہ میں یورپ تکنیکی اعتبار سے اپنے تاریک ترین عہد میں تھا۔ اس زمانہ میں کچا لوہا (Cast Iron)، کمپاس، کاغذ، چھپائی اور ایسی کئی چیزیں چین میں ایجاد ہوچکی تھیں۔ پندرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں چین نے اپنے جہازوں کے بیڑے بحر ہند کے پار دولت اور مغربی دنیا کی تلاش میں بھیجے۔ یہ بیڑے سیکڑوں 400 فٹ کی لمبائی تک جہازوں اور 28،000 ملاحوں پر مشتمل تھے۔

یہ بیڑے یورپ کی دریافت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کا مقصد افریقا کے جنوب سے گھوم کر یورپ کو اپنی کالونی بنانا تھا لیکن اسی دوران چین میں حکومت بدل گئی۔ نئے حکمران نے نہ صرف مہم کی امداد روک لی، بلکہ جہاز بنانے اور ان کی مرمت کرنے والے شپ یارڈ بند کروا دیے۔ یوں ایک کارنامہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اگر چین میں پہلے حکمران کی حکومت رہتی تو آج یورپ، چینیوں کی کالونی ہوتا۔

چینی مہم جوئی کے خاصے عرصہ بعد واسکوڈی گاما اپنے تین چھوٹے جہازوں کے ساتھ پرتگال سے افریقہ کے جنوب سے ہوتا ہوا مشرقی ایشیا کو یورپ کی کالونی بنانے کے لیے عازم سفر ہوا۔ چینیوں کی مغرب کی دریافت کی مہم کے اختتام کے کئی قرنوں کے بعد کرسٹوفر کولمبس نے مغرب کی دریافت کا بیڑا اٹھایا۔ کولمبس نے، جو اٹلی کا باشندہ تھا، پہلے فرانس کے بادشاہ سے اپنے مشن کے لیے مدد مانگی مگر وہاں سے اُسے انکار ہوگیا۔ ناکامی کے بعد پرتگال کے بادشاہ سے مدد کا خواستگار رہا۔ وہاں سے بھی ناکامی کے بعد اسپین کے بادشاہ اور ملکہ کے دربار میں درخواست گزار ہوا۔ پہلے تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، مگر اس کی دوسری التجا کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ اگر یورپ، چین کی طرح سیاسی طور پر متحد ہوتا اور اس پر انکار کرنے والے بادشاہ کی حکومت ہوتی، تو امریکا کی دریافت کا خواب کئی صدیوں بعد ہی شرمندۂ تعبیر ہوتا۔

انسانی زندگی اور دریا کے دورانیے میں ایک اور مماثلت یہ ہے کہ دونوں صرف آگے کی طرف بڑھتے ہیں، پیچھے کبھی نہیں لوٹتے۔ ان کی رفتار تیز یا دھیمی تو ہوجاتی ہے لیکن ساکت کبھی نہیں ہوئی چاہے وہ کسی جھیل یا سمندر کی نذر ہوجائیں یا اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ جس طرح دریا زمین پر بہتے ہیں، لیکن کبھی کبھی نظروں سے اوجھل ہوکر زیر زمین بلوچستان کی کاریز کی صورت بھی بہتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی شہادت کے بعد نظروں سے اوجھل ہوکر جیتے ہیں۔ جس طرح دریاؤں کا وجود پیاسی زمین کو سیراب کرنے کے لیے آیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کم نہ تھے کروبیاں! اور بقول ابراہیم بن ادھم میں اس کا بندہ بنوں گا، جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا۔

دریا اپنے دورانیے میں زمین اور لوگوں کی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ بخارات کی صورت ہوا میں تحلیل ہوتا رہتا ہے اور سمندر میں ضم ہونے کے بعد بھی سورج کی تپش کے باعث، بخارات میں تبدیل ہوکر بادل کی صورت، دوبارہ زمین کے نشیب و فراز پر برستا ہے۔ یوں یہ دائری تسلسل برقرار رہتا ہے۔ اس تناظر میں انسان اگرچہ اپنے خالق حقیقی سے جاملتا ہے، لیکن اپنی اولاد کو خدمت خلق کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اولاد کی پرورش اور اسے اپنے سے بہتر بنا کر عوام الناس کی خدمت کے لیے چھوڑ جانا بہت بڑی عبادت ہے۔

دریا کے دورانیے اور زندگی کے سفر کا جائزہ اگر ان کی ابتدا اور انتہا کے سیاق و سباق میں لیا جائے تو یہ ایک بیکسی سے دوسری بیکسی کی عکاسی پیش کرتا ہے۔ دریا کا نقاہت کی حالت میں پہاڑوں سے آغاز اور پھر نقاہت ہی کی حالت میں سمندر میں گرنا، اور انسان کا ہاتھوں میں آکر کندھوں پر راہی عدم ہونا، اس بے بسی کی منظر کشی ہے۔ اگر لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کے سیاق و سباق میں زندگی اور دریا کے دورانیے کا جائزہ لیا جائے تو یہ مادیت کے عروج و زوال کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت ہر مادیت کو زوال ہے۔ عروج صرف روحانیت کو حاصل ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ماحول، انسانی سمجھ بوجھ اور سیاق و سباق بدل جاتا ہے۔ لڑکپن کی نمازوں میں، میں سجدے میں زمین سے ٹکریں مارتا اور قرآنی آیات طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھا کرتا تھا۔ پھر میں نے آیات کا اردو میں مطلب سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تو کچھ پلے پڑا۔ لیکن اصل لطف جب آنا شروع ہوا جب آیات کا مطالعہ ان کے سیاق و سباق میں سمجھ کر پڑھا۔ اس پر مجھے سعودی عرب کا ایک طالب علم یاد آگیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں شہری منصوبہ بندی اور ماحولیات کا پروفیسر تھا۔ میں نے اپنی کلاس میں سعودی لڑکوں کو پروفیسروں کے لیے ایک ہاؤسنگ کالونی ڈیزائن کرنے کا پروجیکٹ دیا اور کہا کہ وہ ایک سوالنامہ تیار کر کے سعودی پروفیسرز سے ان کی ترجیحات معلوم کرلیں۔ تب ایک سعودی پروفیسر پانچ سے سات سال اپنے بیوی بچوں کے ساتھ انگلستان اور امریکا میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے لگا کر آئے تھے۔

ایک پسند جس کا اکثر پروفیسروں نے اظہار کیا وہ یہ تھی کہ کالونی میں خواتین کے لیے ایک کلب ہونا چاہیے۔ جب سعودی طلبہ نے ہاؤسنگ اسکیم تیار کی تو اس میں خواتین کے لیے کلب فراہم نہیں کیا گیا۔ میں نے طلبہ سے پوچھا کہ اس ہاؤسنگ کالونی میں خواتین کلب کیوں نہیں رکھے گئے؟ ایک مولوی قسم کے طالب علم نے جواب دیا: ''وللہ ھذا حرام''۔ میں نے پوچھا، حرام کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا، قرآن مجید میں لکھا ہے۔

میں نے کہا، قرآن مجید میں کہاں لکھا ہے کہ خواتین کا کلب حرام ہے؟ اس نے جواب دیا کہ عورتوں کے لیے قرآن مجید میں لکھا ہے: ''وقرن فی بیوتکن''۔ گھر میں قرار سے بیٹھو۔

میں نے کہا کہ قرآن میں تو یہ بھی لکھا ہے ''لاتقربو صلاۃ واتم سکارہ۔'' نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت پھٹکو۔ میں نے اپنے طالب علم سے کہا کہ تم ''وقرن فی بیوتکن'' سے آگے بھی پڑھو کہ یہ کس سیاق و سباق میں قرآن مجید میں آیا ہے۔ ''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیہ الولی۔'' اپنے گھروں میں قرار سے بیٹھو اور جہالت کے دنوں کی طرح اپنے بناؤ سنگھار کا اظہار کرتی نہ پھرا کرو۔ (سورۃ احزاب آیت 33)۔ میں نے اپنے طالب علم سے پوچھا کہ اگر تم کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہو اور تمہارا بچہ شدید بیمار پڑ جائے تو کیا تمہاری بیوی گھر میں قرار سے بیٹھے گی یا ڈاکٹر کے پاس بھاگے گی؟

اگر زندگی اور دریاؤں کے دورانیے کا تجزیہ عصری میزان کے سیاق و سباق میں کیا جائے تو ان کی طوالت و اختصار بے حد اضافی لگتے ہیں۔ خاندان مغلیہ کے آخری صوفی بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے زندگی کو چار روزہ قرار دیا ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا!

سیماب اکبر آبادی کا شعر ہے۔

عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کائناتی سیاق و سباق میں دنیا میں گزارے ہوئے سو سال ڈھائی گھنٹوں سے بھی کم بنتے ہیں کیونکہ سورۃ الحج آیت 47/اور سورۃ السجدہ، آیت 50 میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہمارا ایک دن، دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اگر دنیاوی انسانی عمر کا موازنہ عرشی دن کے پیمانے سے کیا جائے تو اس دنیا میں گزرے سو سال تین منٹ سے بھی کم بنتے ہیں کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے سورۃ معارج آیت 4 میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہمارا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

دنیاوی زندگی کے دورانیہ کے اختصار کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے اور جب وہ اس دنیا سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اقامت کے بغیر اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ دنیاوی قیام بس اتنا ہی مختصر ہوتا ہے۔ جتنا اذان اقامہ کے درمیان کا وقفہ!

انسانی زندگی اور بہتے دریا میں اتنی مماثلت کے ساتھ ایک تفاوت بھی ہے۔ وہ یہ کہ دریا ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بہتا ہے، لیکن اس کے برعکس انسانی زندگی میں نشیب و فراز دونوں آتے ہیں اور انسان گر گر کر اٹھتا ہے۔ انسانی زندگی باکسنگ کے کھیل کی طرح ہے۔ اس میں اگر کھلاڑی گر جائے تو اسے ہارا ہوا قرار نہیں دیا جاتا۔ وہ تب ہارتا ہے جب اُٹھنے سے انکار کر دے۔ انسانی زندگی میں ہر ناکامی ایک نئی اور بہتر کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے بشرطیکہ انسان ہمت نہ ہار دے۔

◆◆◆

مُشکل مرحلہ

کسی نے ادبی جلسوں کے ایک مقرر سے پوچھا: ''آپ کے لیے مُشکل ترین مرحلہ کون سا ہوتا ہے؟''

مقرر نے جواب دیا: ''مُشکل ترین مرحلہ میرے بعد آنے والے مقالہ نگار کو پیش آتا ہے۔ کیونکہ اُسے سامعین کو جگانا پڑتا ہے۔''

نفسیاتی ڈاکٹر

ایک مشہور نفسیاتی ڈاکٹر ایک روز سر زانو پر رکھ کر کڑھ رہا تھا۔ ایک دوست نے آ کر جھنجھوڑا تو بولا:

''ہائے۔ میں مر گیا۔ مجھے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤ۔''

دوست بولا: ''مگر تم خود بہت بڑے ماہر نفسیات ہو۔''

ڈاکٹر نے کراہتے ہوئے کہا: ''مجھے معلوم ہے مگر میری فیس بہت زیادہ ہے۔''

شکار

تحسین گل

بات شروع ہوئی تھی ایک ٹوٹے ہوئے وائپر سے اور جا رُکی شمائلہ کی این جی او تک۔ رُکیے آپ کو بات سمجھانے کے لیے مجھے ایک برس پیچھے جانا پڑے گا۔ میرے گھر چند برسوں سے نو دس برس کی ایک بچی مانگنے آتی تھی۔ میں کبھی اسے پیسے دے دیتی، کبھی پھل یا سالن۔ بہر حال یہ روزانہ کا معمول تھا۔

ایک رات اچانک میری طبیعت خراب ہوئی۔ پیٹ کے ایک طرف درد کی لہر اُٹھی۔ درد اچانک اتنا تیز ہوا کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ گھر والے مجھے ہسپتال لے کر گئے۔ پتا چلا کہ اپنڈکس کی تکلیف ہے۔ آپریشن ہوگا۔

بدگمانی کا زہر زندگی میں گھول دینے والی ایک مفاد پرست عورت کی عبرت اثر داستان

فوری طور پر آپریشن ہوا۔ دو دن بعد میری گھر واپسی ہوئی۔ دسمبر کی چھٹیاں تھیں لہٰذا بچے گھر پر تھے۔ کام کاج کا کوئی مسئلہ نہ تھا مگر دس دن بعد بچے کالج جانا شروع ہوگئے۔

میرے گھر میں کام کاج کے لیے کوئی ماسی نہ تھی۔ میں سارا کام خود کرتی ہوں۔ اب میرے بچے پریشان تھے کہ ماما گھر کا کام کیسے کریں گی۔ اچانک مانگنے والی بچی آ گئی۔ میں نے اپنی بیٹی سے کہا:

"فاطمہ! اس بچی کو اندر بلاؤ۔"

وہ اس کو اندر لے آئی۔ میں نے اس سے پوچھا: "بیٹا میرے گھر صفائی کا کام کرو گی؟"

وہ بولی: "جی باجی! میں اس گلی میں ایک اور گھر میں بھی کام کرتی ہوں۔ وہ باجی مجھے ڈیڑھ سو روپیہ دیتی ہے۔ میں آپ کا کام بھی کر دیا کروں گی۔ کتنے پیسے آنا ہوگا؟"

میں نے اس سے کام کے اوقات طے کیے اور کہا: "کیا آج تم کام کر دو گی؟"

"جی باجی کر دوں گی۔" وہ فوراً بولی۔

"فاطمہ بیٹا، اس سے ذرا کام کروا لو اور ذرا طریقہ بھی سمجھا دو کہ کس طرح کام کرنا ہے۔"

"جی ماما ٹھیک ہے۔" میری بیٹی بولی اور اس کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ کام کاج کرنے کے بعد چلی گئی تو میری بیٹی آئی اور بولی: "ماما بچی ذہین ہے، کام جلدی سیکھ گئی ہے۔ ایک بار ہی بتانا پڑا۔ اب مجھے آپ کی طرف سے بے فکری ہوگئی ہے۔"

"چلو بیٹا شکر ہے کہ اللہ نے سب بنا دیا۔"

اگلے دن بچوں کے جانے کے بعد قریباً گیارہ بجے وہ بچی چلی آئی۔ اب میری حالت اتنی سنبھل گئی تھی کہ میں چل پھر اور ہلکا پھلکا کام کر سکتی تھی۔ بچی کا نام عابدہ تھا۔ کام تو وہ بہت اچھا کرتی مگر بولتی بہت تھی۔ بہرحال مجھے اس کے آنے سے بہت آرام ہوگیا۔

شائلہ کون ہے؟ اب اس کا تعارف بھی ہو جائے۔ وہ میری ایک پرانی اور قریبی دوست ہے۔ ہماری دور پار کی رشتہ دار بھی ہے۔ اتفاق کی بات میرے گھر کی ایک گلی چھوڑ کر اس کا گھر ہے۔ لہٰذا ہفتے میں ایک دو دن بعد میری اور اس کی ملاقات ضرور ہو جایا کرتی۔ شائلہ عورتوں کے حقوق کی ایک این جی او کی نائب چیئرمین ہے اور بہت سرگرم رکن ہے۔ جہاں عورتوں کے حقوق کی بات ہو وہاں سرفروشانہ انداز میں مقابلہ کرتی ہے۔ یہ بات الگ کہ گھر میں شوہر اس کے سرفروش کردار کی تاب نہ لا کر اکثر زیر دام آتا اور عورتوں کے حقوق کے لیے رضا کارانہ طور پر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہے۔

ایک صبح شائلہ کی میرے گھر آمد ہوئی تو عابدہ لاؤنج میں پوچا لگا رہی تھی۔ بچی کو کام کرتے دیکھ اس کی چیخ نکل گئی۔ میرے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ گھبرا کر بولی: "شائلہ کیا ہوا؟"

مجھے دیکھ کر وہ بولی: "ماجدہ تم اتنی ظالم ہو، اتنی سی بچی سے صفائی کروا رہی ہو۔ یہ معصوم بچوں کے ساتھ زیادتی ہے۔"

میں نے گہرا سانس لیا اور بولی: "شائلہ اس معصوم بچی کے نو بہن بھائی ہیں۔ باپ بیمار ہے۔ بڑی بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کو پیسوں کی اشد ضرورت ہے جو بغیر کام کے نہیں ملتے۔ دوسری بات یہ کہ اس کو یہاں صرف ایک گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اچھا کھانا ملتا ہے۔ چائے ملتی ہے۔ میں فارغ ہونے کے بعد اس کو سکول کا سبق پڑھاتی ہوں۔ قرآن پاک پڑھا دیتی ہوں۔ جبکہ گھر پر یہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالتی ہے۔ ابا، اماں کی جھڑکیاں کھاتی ہے اور پڑھائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہاں وہ جو وقت گزارتی ہے وہ بہت بہتر ہے بہ نسبت اس سے جو وہ اپنے گھر گزارتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ یہاں

عارضی کام کر رہی ہے۔ جب میں تندرست ہو جاؤں گی تو اس سے کام نہیں کرواؤں گی۔ البتہ قرآن اور پڑھائی جاری رہے گی۔"

یہ باتیں سن کر شائلہ ہونٹ سکیڑ کر بیٹھ گئی اور بولی: "ذرا اچھی سی چائے تو پلواؤ۔"

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑی اور بولی: "کیا عابدہ سے منگواؤ گی؟"

شائلہ زور سے ہنس پڑی اور میں چائے بنانے چل دی۔ عابدہ کی ایک بری عادت تھی وہ واپر چلاتے ہوئے اس کو بہت زور سے دبا کر فرش پر پھیرتی تھی۔ میں نے اسے کئی بار ٹوکا "اس طرح واپر پر زور مت ڈالا کرو۔ یہ جلدی ٹوٹ جائے گا۔" مگر وہ ہمیشہ سنی ان سنی کر دیتی۔

آخر کار ایک دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ واپر ٹوٹ گیا۔ میں نے اسے گھر کا، "دیکھا میں کہتی تھی کہ اس کو زور سے مت دباؤ۔ اب دوسرے واپر سے کام چلاؤ۔ میں اس کو ٹھیک کروا لوں گی۔"

عابدہ بولی: "باجی آپ کی گلی کے اگلے موڑ پر ایک ویلڈنگ والا ہے۔ میں اس سے ٹھیک کروا لوں گی۔"

"نہیں نہیں۔" میں فوراً بولی، "تم مت جانا، میں اپنے بیٹے کو دوں گی وہ ٹھیک کروا لے گا۔"

اگلے دن میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ واپر ٹھیک کروا لائے۔ وہ واپر اٹھا کر چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد واپس آیا تو بولا: "ماما وہ واپر ٹھیک نہیں کر رہا۔ کہتا ہے کہ اسے پھینک دیں۔ یہ اگر جڑ بھی گیا تو دوبارہ جلد ٹوٹ جائے گا۔" میں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ واپر کو باہر رکھ دے۔ صبح عابدہ آئے گی تو باہر کوڑے کے ڈرم میں پھینک دے گی۔

میری بیٹی نے واپر اٹھا کر باہر پورچ میں رکھ دیا۔ دن کو شائلہ آئی۔ بازار جانے کا ارادہ تھا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئی۔ قریباً تین گھنٹوں کے بعد ہماری واپسی ہوئی۔ میں اندر لاؤنج میں آئی تو سیڑھیوں پر واپر دھرا تھا۔ میں نے کوفت سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور بولی: "گڑیا میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے عابدہ کو دے دینا۔ وہ کوڑے کے ڈرم میں ڈال آئے گی۔ تم نے پھر اس گند کو سجا کر رکھ دیا۔"

بیٹی بولی: "عابدہ واپر ٹھیک کروا لائی ہے۔"

"کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارے بھائی کو تو اس نے انکار کر دیا تھا۔"

میری بات سن کر شائلہ ایک دم چونک کر بولی: "کیا کہا تم نے؟ اس نے علی کو انکار کر دیا تھا اور تمہاری کام والی بچی کو ٹھیک کر کے دے دیا۔"

میں ہڑبڑا گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ شائلہ کی این جی او والی روح جاگ اٹھی ہے۔ میں ایک دم بولی: "ارے نہیں ایسی بات نہیں۔ اس نے بچی سمجھ کر ٹھیک کر دیا ہوگا۔"

"اوہوں نہیں۔" شائلہ نے شکار گھیرنے والی نظریں اُوپر نیچے گھماتے ہوئے کہا: "بی بی! ہوش میں آؤ۔ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ ہم ایسے ہی تو نہیں شور مچا رہے۔ جہاں لڑکی دیکھی، چاہے وہ معصوم بچی ہی کیوں نہ ہو، یہ درندے تاک میں بیٹھے ہیں۔ تم عابدہ کو بلاؤ میں ابھی اس سے پوچھتی ہوں۔ پھر یہ خبر اپنی این جی او کو دیتی ہوں۔ ہمیں ایسی بچیوں کی

مودی سرکار سے.....

اس زمانے کے قلم و دوات کہاں سے لائیں
دادا پردادا کے کاغذات کہاں سے لائیں
ہے کوئی جو سمجھائے اس ناداں سرکار کو
ہم اپنے دادا کی بارات کہاں سے لائیں

(قطب الدین قطب، نئی دہلی)

حفاظت کرنی چاہیے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو تم بھی رگڑے میں آؤ گی۔''

''شمائلہ خدا کے لیے بس کرو۔'' میں کراہی۔

''عابدہ... عابدہ.....'' شمائلہ نے زور سے عابدہ کو آواز دی۔

''جی باجی۔'' عابدہ اس کے سامنے آ کر بولی۔ ''آپ نے مجھے بلایا۔''

''ہاں۔'' شمائلہ بولی۔ ''ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو اور میری بات کا جواب ذرا اچھی طرح سے سوچ اور صحیح طرح سے یاد کر کے بتانا۔''

عابدہ نے گھبرا کے میری طرف دیکھا، میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''یا اللہ میری مدد کرنا۔'' میں دل ہی دل میں بولی۔

''عابدہ! یہ وائپر آپ نے ٹھیک کروایا ہے؟'' شمائلہ نے عابدہ سے سوال کیا۔

''جی باجی!''

''کہاں سے؟''

''گلی کے اگلے موڑ پر ویلڈنگ والا ہے، اس سے۔''

''تمھیں پتا ہے کہ علی بھائی بھی وائپر لے کر گیا تھا۔ اسے تو اس نے انکار کر دیا تھا مگر تمھیں ٹھیک کر دیا۔ کیا وجہ ہے؟''

عابدہ ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

''اچھا بتاؤ۔'' شمائلہ نے اگلا سوال کیا، ''کیا کبھی اس نے تمھیں اپنے پاس بیٹھنے کو کہا؟''

''کس نے باجی؟'' عابدہ نے سوال کیا۔

''ویلڈنگ والے نے۔''

''جی باجی۔''

شمائلہ نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر بولی۔ ''کیا کبھی اس نے تمھیں الگ جگہ پر بیٹھنے کو کہا؟''

''جی باجی، وہ کہتا ہے کہ ادھر مردوں سے ذرا دور ہو کر بیٹھا کرو۔''

شمائلہ کی آنکھوں میں اپنا شکار پکڑ لینے کی چمک لہرائی اور میری گردن دھیرے دھیرے جھکتی گئی۔

''کیا کبھی اس نے تمھیں پیسے دیے؟''

''اکثر دیتا ہے۔''

شمائلہ نے میری طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے کہہ رہی ہو دیکھا میں نہ کہتی تھی۔

میں نے اپنی نظریں نیچے کر لیں۔ دل چاہتا تھا کہ کہیں منہ چھپا کر بیٹھ جاؤں۔

شمائلہ نے اس سے اگلا سوال کیا، ''کیا کہتا ہے جب پیسے دیتا ہے؟''

''کچھ نہیں، کبھی کہتا ہے کوئی چیز لے لینا اور کبھی کہتا ہے اماں کو دے دینا۔''

''اماں...! کیا مطلب؟'' شمائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اماں کو کیوں کس لیے؟ کیا تمھاری اماں بھی اس سے ملتی ہے؟'' شمائلہ نے تیزی سے پے در پے سوالات کیے۔

یا اللہ میں کس گرداب میں پھنس گئی۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

''ہاں...'' اماں کو۔

''کیوں... کیوں...'' شمائلہ تڑپ کر بولی، ''تمھاری اماں اس کی کیا لگتی ہے؟''

''اماں اس کی اماں لگتی ہے۔''

''کیا مطلب...؟'' شمائلہ نے الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اماں اس کی اماں ہی لگتی ہے۔ وہ میرا بڑا بھائی ہے۔''

اس کی بات سن کر شمائلہ کی حالت ایسی ہوگئی جیسے شکاری کے ہاتھ سے شکار نکل جائے اور میرا دل کر رہا تھا کہ اسی وائپر سے شمائلہ کا سر پھوڑ دوں...... بڑی آئی این جی او والی۔

◆●●

مزاح

سرکار کا ہر فن مولا

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ایک بیوروکریٹ صبح صبح میدان میں جاگنگ کر رہے تھے کہ ایک گڈریے کو دیکھا جو اپنے بڑے سے ریوڑ کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ بیوروکریٹ جانوروں کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر آگے بڑھے اور گڈریے سے کہنے لگے:

''اگر میں تمھارے ریوڑ کی تعداد ٹھیک بتا دوں تو کیا میں ان میں سے اپنی پسند کا ایک جانور لے سکتا ہوں؟'' گڈریے نے یہ سوچ کر کہ اتنے بڑے ریوڑ کی صحیح تعداد بھلا کون بتا سکتا ہے، یہ شرط قبول کر لی۔ بیوروکریٹ نے کہا:

''تمھارے پاس 289 بھیڑیں ہیں۔''

گڈریا حیران رہ گیا۔ یہ بالکل صحیح تعداد تھی۔ چنانچہ شرط کے مطابق اس نے بیوروکریٹ کو ریوڑ کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

بیوروکریٹ نے اپنی مرضی کی بھیڑ اُٹھائی اور اسے کندھے پر ڈال کر جانے لگے۔ ''ایک منٹ'' گڈریے نے انھیں روکتے ہوئے کہا:

''اگر میں آپ کا پیشہ ٹھیک بتا دوں تو میں اپنا جانور واپس لے سکتا ہوں؟'' بیوروکریٹ نے سوچا، ایک ان پڑھ

جو چاہے تو چٹکی بجائے سفید کو سیاہ بنا دے اور من کرے تو سیاہ کو سفید

گڈریا بھلا میرے پیشے کا اندازہ کیسے لگا سکتا ہے؟ وہ بھی اس شرط پر راضی ہو گئے۔ گڈریے نے کہا:

''آپ بیوروکریٹ ہیں۔'' اب ان کے حیران ہونے کی باری تھی۔ گڈریے سے پوچھا:

''تم نے یہ کیسے جانا؟'' اس نے جواب دیا: ''اس پر بعد میں بات ہو گی، پہلے میری بھیڑ واپس ریوڑ میں رکھو۔''

بیوروکریٹ کا المیہ یہ ہے کہ وہ خود کو ہرفن مولا سمجھتا ہے۔ تاہم ''ہرفن مولائیت'' اب صرف بیوروکریٹ کی تخصیص نہیں رہی۔ فوجی افسران بھی اس کی ہمسری کرنے لگے ہیں۔ وہ کرکٹ بھی کھلا رہے ہیں، واپڈا، کے ای ایس اور واٹر بورڈ بھی چلا رہے ہیں۔ سیاحت کا محکمہ بھی ان کی دسترس میں ہے اور بوقت ضرورت کسی جامعہ کی وائس چانسلری بھی سنبھال لیتے ہیں۔ صحیح معنوں میں انھوں نے علامہ اقبالؒ کے اس مصرعے کی تجسیم کی ہے:

صحرا است کہ دریا ست، تہِ بال و پر ماست

بات بیوروکریٹس کی ہو رہی تھی جو ہر مسئلے میں ٹانگ اڑانا اپنا آئینی حق سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ بولنے کے بڑے شوقین ہیں۔ آٹھ آٹھ گھنٹے کی میٹنگوں میں اکیلے ہی بولتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک باس کو اتنا بولتے دیکھ کر دفتر کے جہاندیدہ آفس سپرنٹنڈنٹ ان سے اظہار ہمدردی کیا کرتے تھے۔

ایک روز ہم جھلا گئے۔ ہم نے ان سے کہا: ''آپ بڑے کٹر قسم کے خوشامدی ہیں۔ باس کے غلط کاموں پر تنقید کے بجائے پیٹھ پیچھے بھی اُلٹا اس ہی کے لیے پریشان رہتے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے سر۔'' انھوں نے وضاحت کی:

''خوشامد تو میں حسب توفیق آپ کی بھی کر لیتا ہوں لیکن بڑے صاحب واقعی ہمدردی کے مستحق ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' ہم نے جاننا چاہا۔

موصوف سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے: ''میرے ان بالوں کی سفیدی بتا رہی ہے کہ بڑے صاحب کو گھر پر بولنے کا موقع نہیں ملتا۔''

یہی سپرنٹنڈنٹ جس روز صبح سویرے صاحب کے کمرے سے ڈانٹ کھا کر نکلتے تو ماتحتوں کو بلا کر کہتے:

''بڑے صاحب کے لیے اجتماعی دعا کرو۔ یہ آج اپنی بیگم سے ڈانٹ کھا کر آئے ہیں۔ یاد رکھو جو افسر دفتر میں شیر ہوتا ہے وہ گھر پر بلی ہوتا ہے اور ڈانٹ کھایا ہوا افسر آفس میں زخمی شیر ہو جاتا ہے۔ آج باس کے کمرے میں جانے میں احتیاط برتنا: ع

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

بیوروکریٹ کو بعض بدگمان قسم کے لوگ ''بیوروکریک'' بھی کہتے ہیں جسے ہم ذاتی طور پر صحیح نہیں سمجھتے۔ ہماری اس رائے کا اس حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں کہ ہم خود بھی ایک عرصے تک اس دشت کی سیاحی کر چکے۔

تاہم ملازمت کے دوران اپنے ایک باس کے بارے میں ایک بات ہماری سمجھ میں کبھی نہ آئی۔ انھیں تاش کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر کھانے کے وقفے/نماز کے وقفے میں لنچ سے جلد فارغ ہو کر وہ اپنی میز ہی پر بازی جما لیتے اور ماتحت افسران ان کے سامنے پوزیشنیں سنبھال لیتے تھے۔

ان کے کمرے میں ہزاروں روپے اِدھر اُدھر ہو جاتے لیکن انھوں نے اس جوئے کو ''اِن ڈور گیم'' کا نام دے رکھا تھا جسے وہ دفتر کا ''بوجھل ماحول'' ہلکا کرنے کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اس ''اسپورٹ'' کے خاموش تماشائیوں میں ہم جیسے چھٹ بھیے بھی شامل تھے جنھیں آج تک تاش کی گڈی میں موجود پتوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہو سکا...... جب گنا مختلف تعداد سامنے آئی۔

باس کی دیکھا دیکھی یہ شوق ان کے ماتحتوں نے بھی اپنا لیا۔ جس دن باس چھٹی پر ہوتے یا لنچ کے وقت کسی ''اہم میٹنگ'' میں شرکت کے لیے دفتر چھوڑ دیتے تو چھوٹے افسر مل کر ماحول ہلکا کرنے کے نام پر اپنی جیبوں کو ہلکا یا بھاری کر لیتے تھے۔

ناقابل فہم بات یہ تھی کہ ہمارے ساتھی آپس میں کھیلتے تو ایسے ایسے ہاتھ دکھاتے تھے کہ سامنے والے کے پہلے پسینے چھوٹتے اور پھر پیسے لیکن یہی مشاق پتے باز جب باس کے سامنے بیٹھتے تو سارے داؤ پیچ بھول کر ہارتے ہی چلے جاتے۔ مزید یہ کہ جو زیادہ ہارتا تھا، وہ باس کے کمرے سے زیادہ خوش خوش نکلتا۔

کبھی کبھار جب لنچ میں وقت نہ ملتا اور باس کو بوجوہ تاش کھیلنے کی زیادہ شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تو وہ چھوٹے افسروں کو دفتر کے بعد ایک بریف تیار کرنے کے بہانے روک لیتے۔ جس دن آفس میں یہ سرکلر نکلتا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اس پر یہ تبصرہ کرتے ''آج بڑے صاحب کی بیگم صاحبہ نے کوئی خاص فرمائش کی ہے۔''

یوں بھی ہوا کہ کھانے کے وقفے میں وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے تو کوئی ماتحت فرمائش کرتا: ''سر، آج آفس کے بعد خصوصی بازی جمے گی۔'' یہ ماتحت وہ ہوتا جس کی چھٹی، ترقی یا انکریمنٹ کا کیس باس کی میز پر ہوتا۔ باس اس کی فرمائش کبھی نہیں ٹالتے تھے۔ بقول سپرنٹنڈنٹ ''ان سے زیادہ قانونی طریقے پر رشوت کھانے والے شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔''

بیوروکریٹ دفتر میں اپنی موجودگی ہی کو باعثِ رحمت قرار دیتا ہے۔ یہ موجودگی بھی کل وقتی ضروری نہیں۔ کام وہ ہمیشہ اپنے نیچے والوں سے لیتا ہے۔ سابق مغربی پاکستان کے ایک چیف سیکریٹری (سی ایس) کے بارے میں ان کے پرائیویٹ سیکریٹری نے ہمیں بتایا تھا کہ کوئی فائل سیکشن آفیسر (ایس او)، ڈپٹی سیکریٹری، جوائنٹ سیکریٹری، ایڈیشنل سیکریٹری اور سیکریٹری کے مراحل سے گزر کر جب سی ایس تک پہنچتی تو وہ اس میں پیش کردہ تجویز کو پڑھے بغیر صرف What? (کیا؟) لکھ کر اسی اہتمام سے نیچے بھیج دیتے۔

سب سے نچلی سطح پر دوبارہ تجویز کی چھان پھٹک ہوتی اور جب فائل درجہ بدرجہ سب سے اونچی سطح پر پہنچ جاتی تو سی ایس صاحب اس پر Why? (کیوں؟) لکھ کر پھر لوٹا دیتے۔

اب اس پر نئے سرے سے کام ہوتا اور جب فائل زینہ بہ زینہ ایک بار پھر سی ایس تک آتا تو وہ اس پر How? (کیسے؟) لکھ کر نیچے ڈال دیتے۔

فائل میں پیش کردہ تجویز پر چوتھی بار غور ہوتا اور اسے پھر مرحلہ وار اس کی آخری منزل پر بھیجا جاتا۔ اب کی بار سی ایس صاحب As proposed (جیسا کہ تجویز کیا گیا ہے) لکھ کر اس سے پیچھا چھڑا لیتے تھے۔

بیوروکریٹ کا اصل کام صرف دستخط کرنا ہوتا ہے۔ کام کرنے کے لیے اس کے پاس ملازمین کی فوج موجود رہتی ہے جن کی روزی حلال کرنے کی خاطر وہ خود کچھ نہیں کرتا۔ کبھی مجبوراً کام کرنا پڑ جائے تو ایک دو الفاظ سے زیادہ نہیں لکھتا (جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے۔) بعض بیوروکریٹ یہ دو الفاظ بھی کسی اور سے لکھوا کر اپنے دستخط کر دیتے ہیں۔

ایک بار خود ہمارے سامنے ایسا ہوا کہ سندھ کے ایک سابق چیف سیکریٹری سیکریٹری داخلہ کی معیت میں ایک نجی طبی مرکز کے دورے پر تشریف لائے۔

دورے کے اختتام پر میٹنگ روم میں میزبان نے مہمانوں کی کتاب (Vistors' Book) ان کے سامنے اس درخواست کے ساتھ رکھی کہ اس پر اپنے تاثرات رقم کر دیں۔

سی ایس صاحب نے ملتجی نظروں سے سیکریٹری داخلہ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے جھٹ ایک بڑا سا نوٹ لکھ کر باس کے سامنے رکھ دیا اور موصوف نے دستخط کر دیے۔

◆◆◆

روڈرک وِل کِنسن

تصویر کا راز

جلد یا بدیر ایسا ہوکر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ کسی روز اچانک مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ مجھے گرفتار کرسولی پر چڑھا دیں گے۔ میں ذہنی طور پر اس انجام کے لیے تیار ہوں۔ بس کچھ شکوک وشبہات ہیں جن سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔ میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ میں کسی سحر وغیرہ کے زیر اثر تو نہیں! میرے دماغ میں کوئی خلل تو واقع نہیں ہوا......؟ کیونکہ دو میں سے ایک بات ہی درست ہے۔ یا تو اس دوپہر وہ واقعہ حقیقتاً پیش آیا تھا...... یا پھر میری ذہنی حالت مشکوک ہے۔ مجھے فوراً اپنے دماغ کا معائنہ کرانا چاہیے۔

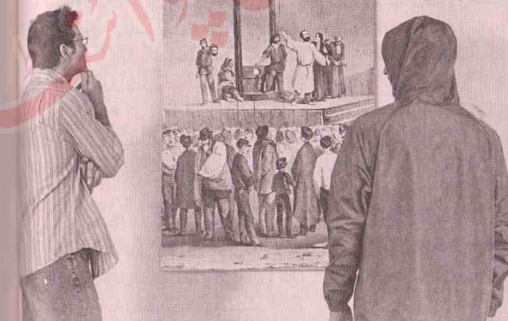

جو بھی صورت ہو، اب یہ واقعہ زیادہ دیر تک چھپائے پھرنا میرے لیے محال ہو چکا۔ مشکل یہ ہے کہ یہ بات میں جسے بھی بتاؤں گا، وہ بالکل یقین نہیں کرے گا۔ اور تو اور مجھے اپنی بیوی تک سے اسی ردعمل کی توقع ہے کہ وہ میری دماغی کیفیت پر شبہ کرے گی۔

موسم گرما کی اس دوپہر اسے ایسے حیرت انگیز واقعے سے گذرنا پڑا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکا

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اپنی بھڑاس نکالنے کی یہی راہ نکالی ہے کہ واقعہ من وعن لکھ دوں۔ اب یہ پڑھنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ اس پر یقین کریں یا نہ کریں، میں تو ہلکا ہو جاؤں گا۔

جولائی کی اس گرم دوپہر میں گھر جانے کے لیے دفتر سے جلد اٹھ گیا۔ راستے میں پیاس سے بیتاب ہوکر میں نے کولڈ کارنر سے یخ مشروب پیا۔ اسی دوران میری نظر سامنے واقع آرٹ گیلری پر پڑی۔ وہاں آویزاں بینر کسی غیرمعروف آرٹسٹ کی پینٹنگز کی نمائش کا اعلان کر رہا تھا۔ جھلسا دینے والی گرمی سے عارضی نجات کے لیے میں نے کچھ وقت آرٹ گیلری کے ٹھنڈے اور فرحت بخش ماحول میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ گرمی سے قطع نظر میں فنون لطیفہ کا قدردان بھی ہوں۔ تصویروں کی نمائش تو بطور خاص دیکھتا ہوں۔

گیلری میں حسب توقع کوئی نہ تھا۔ ایک غیرمعروف مصور کے لیے اپنے گھر یا دفتر کی ٹھنڈی چھاؤں چھوڑ کر کون اس گرمی میں آرٹ گیلری کا رخ کرتا؟ میں اطمینان اور تفصیل سے باری باری ہر تصویر کا معائنہ کرتا آگے بڑھتا رہا۔ تب ایک ستون کے پیچھے سے اچانک وہ شخص نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے حلیے میں ایک عجیب بات تھی جو دیکھنے والے کو دوبارہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی۔ اس بلا کی گرمی میں بھی وہ گرم کپڑے پہنے ہوا تھا۔ اور یہی نہیں! اس نے اوپر سے برساتی بھی چڑھائی ہوئی تھی، حالانکہ اس وقت بارش کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ ہاتھ میں ایک چھتری سی پکڑ رکھی تھی۔

میں نے اخلاقی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف

دیکھا پھر بات بڑھاتے ہوئے کہا: ’’باہر کے مقابلے میں اندر کتنا سکون ہے، اتنا کہ سردی محسوس ہو رہی ہے۔‘‘

میں نے لطیف پیرائے میں یقیناً اس کے لباس کا مذاق اڑایا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا...... اور میں کیا بتاؤں کہ اس کے دیکھنے سے مجھے کیسا لگا! بے اختیار میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ کاش میں نے کچھ نہ کہا ہوتا۔ اس کی نظروں میں برہمی یا ناپسندیدگی نہیں تھی۔ بس مجھے شدت سے اپنے بیوقوف اور احمق ہونے کا احساس ہوا۔

’’تم اسی لیے اندر آئے کہ یہاں ٹھنڈک کا احساس ہوگا......؟‘‘ بالآخر اس نے کہا۔

’’ہاں، بات تو یہی ہے، مگر مجھے تصویروں سے بھی دلچسپی ہے۔ اب یہ مت سمجھ لینا کہ میں کوئی آرٹسٹ وغیرہ ہوں۔ مم...... مگر میرا ایک سالا بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ اس کی ایک شاہ کار پینٹنگ ہم نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگائی ہوئی ہے......‘‘ آخری جملہ میں نے اسے ہنسانے اور اپنی خجالت مٹانے کے لیے کہا تھا۔ وہ ہنسا تو نہیں، لیکن میری خجالت میں ضرور اضافہ ہوا اس کا جواب سن کر۔

’’عنوان کیا ہے اس کا......؟‘‘ میری بات کاٹ کر اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا: ’’غروب آفتاب کا منظر......؟‘‘

’’ہاں، ہاں!‘‘ اس کے درست اندازے نے غصے میں بدلتی میری خجالت کو حیرانی میں تبدیل کر دیا۔ ’’تمھیں کیسے پتا......؟‘‘ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

’’عامیانہ آرٹسٹ ایسے ہی نام رکھتے ہیں، اپنی ’’شاہ کار‘‘ تصویروں کے!‘‘ اس نے لفظ شاہ کار پر بالخصوص زور دے کر طنزیہ انداز میں کہا۔ اس کے ہونٹ عجیب انداز میں پھیل گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ مسکرایا تھا۔

اس نے پھر فن مصوری، تصویروں اور مصوروں پر ایسی پرمغز اور سیر حاصل گفتگو کی کہ میرے دماغ کی نازک رگیں تک جھنجنا اٹھیں۔ مصوری اور مصوروں کے حوالے سے

اس کے نازک اور بار یک انکشافات سے کئی مصوروں کے لیے میری پسندیدگی، ناپسندیدگی بلکہ بغض میں بدل گئی۔ اس کی تقریر دل پذیر کے اختتام تک میں اس سے مرعوب ہو چکا تھا۔ آرٹ کے اس عظیم نقاد نے اپنا نام گرفتہ بتایا تھا۔ ''تم تصویروں میں کیا دیکھتے ہو.....؟'' اس نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

''مم..... میں سب سے پہلے تو یہ دیکھتا ہوں کہ بنایا کیا گیا ہے۔'' میں اس کے اچانک اور عجیب سوال کا جواب دیتے ہوئے ہکلا گیا۔

''مثلاً..... یہ تصویر ہے'' میں نے قریبی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اس تصویر کو میں نے تمام دوسری تصویروں کے مقابلے میں زیادہ توجہ سے اور دیر تک دیکھا۔ اس میں مختلف رنگ کے پھولوں سے سجا گلدان پینٹ کیا گیا ہے۔ اور چونکہ پھول مجھے بے حد پسند ہیں لہٰذا.....''

''بس! یہ دیکھتے ہو تم.....؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ پوچھ بیٹھا۔

میں چکرا کر رہ گیا ''ہاں..... مم..... میرا خیال ہے، تصویر میں یہی کچھ ہے۔ خوبصورت گلدان اور بس۔''

''تمہیں یہی نظر آرہا ہوگا..... اس لیے تم نے یہی دیکھا۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا: ''گویا تم اب تک تصویریں دیکھنے کے حقیقی لطف سے محروم ہو۔ تمہاری ذہنی سطح اتنی نہیں کہ تم تصویروں کی حقیقت جان سکو۔ ایک ایک تصویر کے آگے ٹھہرنا، اس پر نظر ڈالنا اور آگے بڑھ جانا..... تم اسے تصویریں دیکھنا سمجھتے ہو۔ اب اس تصویر کو لے لو۔ اس نے ایک پینٹنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں تمہیں کیا نظر آتا ہے.....؟''

اس کی تحقیر آمیز گفتگو، مضحکہ اڑانے والا روپ اور بد لحاظی مجھے سخت گراں گزر رہی تھی۔ پھر بھی میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا: ''اس تصویر میں درخت کا ایک تنا نظر آرہا ہے اور درختوں کے درمیان ایک بڑا سا مکان بنا ہوا ہے۔ اگر تمہیں اس کے علاوہ بھی کچھ دکھائی دے رہا ہے، تو یہ تمہاری آنکھوں کا قصور ہے''۔ میں اپنی تلخی چھپا نہ سکا۔

میرا آخری جملہ اسے یقینی طور پر بہت برا لگا تھا۔ اس بات کا اظہار اُس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''بات وہی ہے جو میں ہمیشہ کہتا آیا ہوں۔'' اس نے پھر زہر افشانی کی۔ ''کوئی عام آدمی اپنی معمولی ذہنی سطح سے بڑھ کے بلند خیالی اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیسے کر سکتا ہے!

اس کے اس بے رحمانہ تبصرے نے تو جیسے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟ تمہارا مطلب ہے کہ اس تصویر میں تمہیں اس کے علاوہ بھی کچھ نظر آرہا ہے جو مجھ اندھے کو دکھائی نہیں دے رہا.....؟'' میں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

اس نے صدمے کی سی کیفیت میں مجھے دیکھا، افسردگی سے سر ہلایا پھر اچانک ہی ہنس پڑا۔ ''ناراض مت ہو، دوست۔'' ہنسی روکی تو وہ بولا: ''میں تصویروں کا باسی ہوں، تصویروں میں رہتا ہوں۔ پھولوں کی جس تصویر کی تم تعریف کر رہے ہو، تم نے اسے صرف دیکھا ہے جبکہ میں ان پھولوں کو سونگھنے، انہیں چھونے پر بھی قادر ہوں۔''

''کیا.....؟'' میں نے بے یقینی سے کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا جہاں مکمل سنجیدگی تھی، مذاق کا شائبہ تک نہ تھا۔

''ہاں اور یہی نہیں..... اس دوسری تصویر میں درختوں کے درمیان بنے مکان تک بھی جا چکا اور کھڑکی سے اندر جھانک کر آیا ہوں۔''

وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ دماغی طور پر کچھ کھسکا ہوا تھا۔ اب میں کسی بہانے اس سے

اسکاٹ لینڈ کے ممتاز ادیب اور کہانی نویس، روڈرک ول کنسن (Roderick Wilkinson) 1917ء میں گلاسگو میں پیدا ہوئے۔ آپ معروف کہانی نویس ہیں، جو اپنی کہانیوں اور سیاحتی تحریروں کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ روڈرک ول کنسن نے اپنے ادبی کیریئر کی شروعات تھرلر، سسپنس اور ڈراونی کہانیاں لکھنے سے کی۔ 1947ء تا 1960ء کی دہائی تک وہ بی بی سی اسکاٹ لینڈ ریڈیو میں بطور اسکرپٹ رائٹر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی کئی فکشن کہانیاں 1950ء میں دہائی میں مشہور سسپنس اور مسٹری میگزین میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے کئی ناول بھی لکھے۔ 1960ء کی دہائی میں انہوں نے اسکاٹ لینڈ کی سیاحت اور ماہی پروری کے موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں میں، Murder Belongs To Me، Memories of Everything Goes Dead، The Big Still، The pressure men اور Fishing the Scottish Islands، Maryhill Stories شامل ہیں۔

چونکارا پانے کی فکر میں تھا۔ اسے شاید یہ اندازہ ہو گیا۔ میرے ارادے کا ہی نہیں، میرے تاثرات کا بھی۔ اس نے میری کلائی تھام لی اور بولا: ''تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آرہا.....؟''

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔ اب مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کے سوا گیلری میں اب تک کوئی متنفس نظر نہیں آیا تھا۔ ''نہیں نہیں! مجھے یقین ہے۔'' میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ ''بس ذرا حیرانی کی بات ہے۔ مگر تم کہہ رہے ہو تو یونہی نہیں کہہ رہے ہو گے.....؟''

''حیرانی کی کیا بات ہے اس میں!'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑا۔ ''تمہیں اس بات پر یقین کیوں نہیں آتا کہ میں تصویروں کے اندر جا سکتا ہوں۔''

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بس اس کا منہ حیرانی سے تکتا رہا۔ اس نے شدید برہمی کے عالم میں میرا بازو پکڑا اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر مجھے ایک تصویر کے سامنے لے جا کھڑا کیا۔ گرفتہ کی آنکھیں جیسے چنگاریاں برسا رہی تھیں۔ ایک لمحے کو مڑ کر اس نے داخلی دروازے کی سمت دیکھا پھر راز دارانہ انداز میں مجھ سے سرگوشی کی۔ ''یہ تصویر دیکھ رہے ہو.....؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا: ''غور سے سنو۔ اس تصویر کا عنوان ہے..... چاکسی گھاٹ! یہ پینٹنگ آرٹ گیلری کی سجاوٹ کا مستقل حصہ ہے، اس کا نمائش سے کوئی تعلق نہیں۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اب اگر تم چاہو تو میں تمہیں بھی اس منظر میں لے جا سکتا ہوں۔''

مجھے اس کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ حیرت کی زیادتی سے میرا منہ بھی بے اختیار کھلا ہوا تھا۔

''یوں بیوقوفوں کی طرح مت دیکھو۔ جلدی بتاؤ، اس وقت یہاں کوئی نہیں۔ تمہیں میرے ساتھ اس منظر میں چلنا ہے تو یہ اچھا موقع ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ اس جگہ اور اس شخص سے چھٹکارا پانا تب میری زندگی کی سب سے

بڑی خواہش بن گئی تھی۔ اس نے جیسے میری سوچ پڑھ لی۔ میرے بازو پر اس کی گرفت مزید سخت ہوگئی۔ آخرکار میں نے فیصلہ کرلیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانا چاہیے۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

یہ سنتا تھا کہ اس کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''یہ ہوئی نا بات! اب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ۔ یہ کرسی تصویر کے سامنے لے آؤ اور اس پر بالکل آرام دہ حالت میں بیٹھ جاؤ۔'' اس نے قریب پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''تصویر کو دیکھتے رہو اور اپنا جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دو۔''

میں اس کی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ گرفتہ مجھ سے دھیمی مگر بھاری آواز میں مختلف سوالات کرتا رہا۔

''تمہیں تصویر میں کیا نظر آرہا ہے.....؟''

''مجھے لکڑی کے دو.....نہیں تین چوکھٹے نظر آرہے ہیں۔ ارے! یہ تو پھانسی گھاٹ ہے۔''

''یہ دن کا کون سا وقت ہے.....؟''

''چھٹپٹے کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ ہاں.....اور..... یہ سردیوں کی شام ہے۔''

''کیا تمہیں سب کچھ واضح نظر آرہا ہے.....؟''

گرفتہ کی بوجھل آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ ''کچھ فاصلے پر بنا قید خانہ نظر آرہا ہے تمہیں.....؟''

''آں..... یہ سرمئی سی عمارت.....؟ مگر یہ کچھ دھندلاتا جارہا ہے۔ روشنی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ شاید رات ہو رہی ہے۔''

''آؤ، اب میرے ساتھ پھانسی گھاٹ کی طرف چلو۔{{

.....اور میں واقعی وہاں موجود تھا۔ صرف میں ہی نہیں، گرفتہ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس وقت میں کیا محسوس کررہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں اور کسی بھی لمحے چیخ مار کر اٹھ بیٹھوں گا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ وہاں پہنچنے سے پہلے کافی دیر اور دور تک میں کہنیوں کے بل رینگتا رہا ہوں۔ میرا سانس بے تحاشہ پھولا ہوا تھا۔ گرفتہ کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو.....؟'' گرفتہ نے مجھ سے سرگوشی میں پوچھا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی مگر میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پھر بے یقینی سے زمین کے اس چھوٹے غار نما سوراخ کو دیکھنے لگا جس سے رینگ کر ہم باہر آئے تھے۔

''میرا خیال ہے، ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے۔'' میں نے مضبوطی سے گرفتہ کا بازو تھام کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: ''میں سمجھ رہا تھا کہ تم یونہی مذاق کررہے ہو۔ مجھے یقین آگیا، تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بس بہت ہوگیا، یہ پاگل پن۔ فوراً واپس چلو۔'' میں اس وقت جتنا خوفزدہ تھا، زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

''خاموش ہوجاؤ!'' میرے شانے پکڑ کر گرفتہ نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر کہا۔ اس کا جھنجھوڑنا جیسے مجھے ہوش میں لے آیا اور میں خود کو خاصا پرسکون محسوس کرنے لگا۔

''ہم جب چاہیں گے، اس سوراخ سے واپس چلے جائیں گے۔'' اس نے سوراخ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گویا مجھے تسلی دی۔ اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔ ''ہر تصویر میں، ہر منظر میں اس قسم کا کوئی نہ کوئی سوراخ، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوا کرتا ہے..... جہاں سے تصویر میں داخل ہوا جاسکے۔ بہرحال فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ۔ ہم بالکل محفوظ ہیں۔''

اس کے لہجے میں بے نام سا تحکم تھا اور اس کی آنکھیں..... خدا کی پناہ! عجیب کشش تھی ان میں، لگتا تھا،

میرے آر پار دیکھ رہی ہیں۔ میں خود کو اس کی ہر بات کی تعمیل کرنے پر مجبور پارہا تھا۔ اشارہ کرنے پر میں اس کے پیچھے ہولیا۔

''تمہیں میری بات پر پوری طرح یقین آگیا نا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا.....؟'' چلتے چلتے اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا: ''ہوسکتا ہے کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں..... مگر تم نے جو کچھ کہا وہ کردکھایا۔''

''خواب!'' وہ مربانہ انداز میں ہنسا اور ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے قریبی درخت کے تنے پر ضرب لگائی۔ ''یہ درخت، یہ ماحول..... انہیں چھوؤ، محسوس کرو اور مجھے بتاؤ کہ کیا خواب ایسا ہوتا ہے..... اتنا حقیقی.....؟''

میں نے ایک بار پھر اردگرد کا جائزہ لیا اور اس سے پوچھا: ''تم یہاں پہلے بھی آچکے ہو.....؟''

''یہ میرا تیسرا چکر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ہم بدستور چل رہے تھے۔ ''اس پینٹنگ نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ یہ اذیت کے اظہار کا بے مثال شاہکار ہے۔''

''ہاں واقعی، یہ عجیب سی پینٹنگ ہے۔'' میں نے اپنی دانست میں اس کی تائید کی تھی مگر وہ تو جیسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں مجھ پر پھٹ پڑا۔

''کیا کہا.....؟ عجیب سی! اس پینٹنگ کا خالق خوف اور اذیت پینٹ کرنے میں اپنی مثال آپ تھا..... ایک ایسا فنکار جو انسانی زندگی کے تمام آلام و مصائب کو اپنے برش کی ایک ہی جنبش سے، ایک ہی کینوس پر ابھار سکتا تھا۔''

''یہ تصویر اس نے کتنے سال پہلے بنائی ہوگی.....؟'' میں نے بس کچھ نہ کچھ بولنے کی خاطر یہ سوال کیا تھا۔

''1803ء میں!''

اس دوران میں ہم پھانسی کے پھندوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''تت..... تمہارا مطلب ہے کہ اس وقت ہم 1803ء میں.....؟''

''بالکل۔'' اس نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے جواب دے دیا۔ ''جب ہم کسی منظر میں داخل ہوں تو دراصل اس دور اور اس وقت میں قدم رکھتے ہیں جس دور کی عکاسی تصویر میں کی گئی ہو۔''

اس کا انکشاف سنتے ہی میری ٹانگوں سے گویا جان نکل گئی اور انہوں نے میرا یہ بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا۔ ٹانگوں کی لرزش پر قابو پانے کے لیے میں جلدی سے قریب پڑے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ گرفتہ نہایت اطمینان سے پھانسی کے پھندوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ وہ اپنی چھڑی سے پھندوں کو جھلا رہا تھا۔

''ان پھندوں سے کسی کو کبھی پھانسی دی بھی گئی ہے.....؟''

''ہاں، بے شمار مجرموں کو، وہ جرم جو اس قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کرتے تھے۔'' اس نے چھڑی کی مدد سے دور نظر آنے والی عمارت کے ہیولے کی طرف اشارہ کیا جو اس کے کہنے کے مطابق قید خانہ تھا۔ ''اردگرد کا علاقہ بھاگنے والوں کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوتا تھا۔ وہ کچھ وقت یہاں روپوش رہ کر گزارتے۔ اس دوران قریبی آبادی کے لوگ یا گزرنے والا کوئی مسافر ان کے بھتے چڑھ جاتا تو وہ اسے لوٹ کر قتل کردیتے۔''

''تو یہاں ان لوگوں کو پھانسی.....''

''شش!'' میری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود جیسے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بھی اپنی سماعت پر زور دیا اور تب میری رہی سہی طاقت بھی جواب دے گئی۔ مجھے بھی کچھ آدمیوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں واضح طور پر سنائی دی تھیں۔

''چلو، جلدی کرو!'' گرفتہ نے تشویش زدہ لیکن دبی دبی آواز میں کہا۔ ''ہم ان سے جتنا دور رہیں اتنا ہی اچھا ہے کہ اس وقت ہم 1803ء میں.....''

''بالکل۔'' اس نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے جواب دے دیا۔ ''جب ہم کسی منظر میں داخل ہوں تو دراصل اس دور اور اس وقت میں قدم رکھتے ہیں جس دور کی عکاسی تصویر میں کی گئی ہو۔''

اس کا انکشاف سنتے ہی میری ٹانگوں سے گویا جان نکل گئی اور انہوں نے میرا یہ بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا۔ ٹانگوں کی لرزش پر قابو پانے کے لیے میں جلدی سے قریب پڑے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ گرفتہ نہایت اطمینان سے پھانسی کے پھندوں کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ وہ اپنی چھڑی سے پھندوں کو جھلا رہا تھا۔

''ان پھندوں سے کسی کو کبھی پھانسی دی بھی گئی ہے.....؟''

''ہاں، بے شمار مجرموں کو، وہ جرم جو اس قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کرتے تھے۔'' اس نے چھڑی کی مدد سے دور نظر آنے والی عمارت کے ہیولے کی طرف اشارہ کیا جو اس کے کہنے کے مطابق قید خانہ تھا۔ ''اردگرد کا علاقہ بھاگنے والوں کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوتا تھا۔ وہ کچھ وقت یہاں روپوش رہ کر گزارتے۔ اس دوران قریبی آبادی کے لوگ یا گزرنے والا کوئی مسافر ان کے بھتے چڑھ جاتا تو وہ اسے لوٹ کر قتل کردیتے۔''

''تو یہاں ان لوگوں کو پھانسی.....''

''شش!'' میری بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود جیسے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بھی اپنی سماعت پر زور دیا اور تب میری رہی سہی طاقت بھی جواب دے گئی۔ مجھے بھی کچھ آدمیوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں واضح طور پر سنائی دی تھیں۔

''چلو، جلدی کرو!'' گرفتہ نے تشویش زدہ لیکن دبی

ہے۔"

میں جلدی سے تنے سے اترا اور جیسے تیسے اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتے ہوئے اسی طرف بڑھنے لگا جدھر سے ہم لوگ آئے تھے۔

"ادھر نہیں..... ادھر!" گرفتھ کی نپی تلی مگر کرخت آواز آئی۔ "اس وقت ان لوگوں کا رخ اسی سوراخ کی طرف ہے جس سے ہم لوگ آئے ہیں۔"

میں پلٹا اور اس کی تقلید میں اس کے برابر گھاس پر لیٹ گیا۔ خوف سے میری حالت بری ہو رہی تھی۔ میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں نے اس کے ساتھ تصویر میں آنے کی ہامی بھری تھی۔ "یہ کون لوگ ہیں.....؟" میں کوشش کے باوجود آواز کی لرزش پر قابو نہ رکھ سکا۔

شاید میری کیفیت کے پیش نظر اس نے نرمی سے جواب دیا: "اپنی آوازوں سے تو یہ مفرور مجرم ہی معلوم ہوتے ہیں۔ شش..... سنو! یہ لوگ کچھ کہہ رہے ہیں۔"

آنے والوں میں سے ایک کی آواز آئی۔ "آوازیں تو یہیں سے سنائی دی تھیں۔"

"تمہارے کان بجے ہوں گے۔ یہاں تو کوئی نہیں۔ اپنے کانوں کا علاج کراؤ۔" دوسری آواز سنائی دی۔

"میں تمہارا سر توڑ دوں گا اگر تم نے آئندہ مجھ سے اس طرح بات کی!" پہلے والے کی آواز سن کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے تیور نہایت خراب ہیں۔ "میں نے خود ان کی آوازیں سنی ہیں۔ وہ شاید دو افراد ہیں۔"

"اگر ہم ان کے بتھے چڑھ گئے تو موت یقینی سمجھو۔" گرفتھ نے سرگوشی میں تشویش کا اظہار کیا۔ "جب میں کہوں تو فوراً بھاگ لینا۔"

"جنہیں جگہ تو یاد ہے نا..... جدھر سوراخ ہے.....؟" میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

اس کے اثبات میں سر ہلانے سے مجھے خاصا حوصلہ ہوا۔ میں نے اس پر نظریں جما دیں۔ میری کوشش تھی کہ پلکیں بھی نہ جھپکیں، مبادا اس مختصر سے عرصے میں وہ بھاگنا شروع کردے اور میں وہیں رہ جاؤں۔

"بھاگو!" اچانک آواز آئی۔

میں نے بے تحاشہ گرفتھ کے تعاقب میں بھاگنا شروع کردیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم کس سمت میں دوڑ رہے ہیں۔ میں بس اس پر نظریں جمائے اندھا دھند بھاگے چلا جارہا تھا۔ اس وقت مجھے جیسے بجلی کا شدید جھٹکا سا لگا جب ان میں سے ایک کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ چیخ رہا تھا۔

"یہ رہے وہ لوگ..... یہ رہے!" یہ آواز وہی تھی جس نے پہلے ہماری آوازیں سننے کا دعویٰ کیا تھا۔

"رک جاؤ! تم لوگ بچ کر نہیں جاسکتے۔" دوسرے نے للکارا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کب تک بھاگتا رہا۔ جھاڑیوں کو پھلانگتا، درختوں کے درمیان بس گرفتھ کی اندھا دھند تقلید کرتا رہا۔ ایک مقام پر پہنچ کر گرفتھ دیوانہ وار زمین پر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ سوراخ کی جگہ بھول گیا ہے اور اسی کو تلاش کررہا ہے۔

"ملا.....؟" قریب پہنچ کر میں نے بیقراری سے پوچھا۔

"پتا نہیں کہاں چلا گیا! نہیں مل رہا۔" آواز سے اس کے شدید ذہنی کرب کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دہشت کی وجہ سے میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔

"کہاں چلا گیا.....؟" میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بے بسی سے منمنایا۔ تعاقب کرنے والوں کے دوڑتے قدموں کی آوازیں واضح سنائی دے رہی تھیں جو لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھیں۔ اسی وقت غیر ارادی طور پر میری نگاہ ایک سمت اٹھ گئی اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔

"مل گیا..... مل گیا!" میں نے فرط مسرت سے

ایک سے بڑھ کر ایک.....!

ایک صاحب جو جعلی نوٹ چھاپنے کا کام کرتے تھے، انہوں نے ایک دفعہ غلطی سے 10 کی بجائے 15 روپے کے نوٹ چھاپ دیئے۔ اب انہوں نے سوچا کہ شہر میں تو یہ چلیں گے نہیں، تو انہوں نے ایک پسماندہ دیہہ کا رخ کیا۔ ایک چھوٹی سی دکان دیکھی، وہاں پر ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے 15 کا نوٹ اسے دے کر کہا کہ کھلا دے دیں۔

بڑھیا نے نوٹ دیکھا اور کہا: "آپ کو 14 روپے ملیں گے۔"

اس نے سوچا کہ 14 ہی غنیمت ہیں۔ کہنے لگا: "چلو 14 ہی دے دو۔"

بڑھیا اندر گئی اور سات سات کے دو نوٹ لاکر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

☆☆

مریض: آج کل ہر چیز مجھے دو دو دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ جو ٹیوب لائیٹ ہے، دو دو دکھائی دے رہی ہے۔ آپ بھی دو دکھائی دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے مریض کا حال سن کر کہا: "آپ چاروں کو یہ شکایت کب سے ہے.....؟"

چلاتے ہوئے گڑھے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ "جلدی کرو، ادھر آؤ۔" میں مسلسل چیخ رہا تھا۔ اس دوران گڑھے تک پہنچ کر میں نے اپنا سر اور کندھے اس چھوٹے غار نما سوراخ میں داخل کردیے تھے۔ "مجھے اپنی لکڑی پکڑاؤ..... میں تمہیں کھینچ لوں گا۔" میں موت سے بھاگنے اور زندگی تک پہنچنے کی جنونی کوشش کرتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا۔

یہ کوشش کتنی طویل اور کٹھن تھی اور بعد میں کیا ہوا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں بیہوش ہوگیا تھا۔ حواس بحال ہونے پر میں نے سب سے پہلے جو کچھ دیکھا وہ میرے گرد آلودہ کپڑے تھے۔ میرے کپڑوں سے جھڑی کچھ مٹی آرٹ گیلری کے فرش پر بھی پڑی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، گرفتھ نظر نہ آیا۔ میں بمشکل وہاں سے اٹھا اور پینتگ کو قریب سے دیکھنے لگا۔ جو کچھ میرے مشاہدے میں آیا، اس نے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں نے پہلے وہ پینتگ دیکھی تو پھانسی کے تمام پھندے خالی تھے مگر اب تیسرے پھندے میں ایک لاش لٹک رہی تھی۔ میں نے اور قریب سے بغور اس لاش کا معائنہ کیا تو میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہوگئی۔ وہ گرفتھ تھا!

میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کسی کو قائل نہیں کرسکتا کہ یہ عالم جنوں ہے یا ہوش مندی۔ اسے ہوش و حواس کے عالم میں پیش آنے والا واقعہ ثابت کرنے کے لیے میرے پاس صرف ایک ثبوت ہے..... خود مجھے بھی اس ثبوت کی بدولت ہی یقین آتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ وہ ثبوت ہے گرفتھ کی چھڑی..... جو اس نے سوراخ میں میری طرف بڑھائی ہوگی کہ میں اسے کھینچ لوں! ◆◆◆

طب و صحت

ڈاکٹر آصف محمود جاہ (ستارۂ امتیاز)

وبا کے مریض وقت کیسے گزاریں؟

کورونا کے نظر نہ آنے والے وائرس نے پوری دنیا کو زیر کر کے رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے سورما اور سپر پاور کا زعم رکھنے والے اس نظر نہ آنے والے جرثومے سے زیر ہو چکے۔ دُنیا بھر کے نوبل انعام یافتہ اور جغادری ڈاکٹر، سائنسدان، کیمسٹ، فارماسسٹ کورونا کے زہر کا تدارک ڈھونڈنے میں لگے ہیں۔ کورونا کی دہشت اور وائرس سے ایک طرف تو لوگ مر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس نے دُنیا بھر کے کروڑوں انسانوں کو گھروں میں نظر بند کر کے ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ گھر میں بند رہنے سے نفسیاتی، معاشرتی اور ذہنی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ آپس میں قربتیں بڑھنے کے بجائے ذہنی طور پر دُوریاں زیادہ ہوتی رہی ہیں۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ سب بے زار ہیں۔

چین میں کورونا کی وجہ سے بے شمار طلاقیں ہو چکیں۔ ایک دوسرے پر گھریلو تشدد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خاتون خانہ کو روزمرہ سے کہیں زیادہ گھریلو اُمور انجام دینے پڑ رہے ہیں، اس وجہ سے کئی خواتین ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار ہو گئی ہیں۔ لاک ڈاؤن کے باعث معاشرتی مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔ بیروزگار افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پرائیویٹ نوکریاں کرنے والوں کی ابھی تک مالکان نے مارچ کی تنخواہ نہیں دی اور اگر لاک ڈاؤن ماہ اپریل کے آخر تک جاتا ہے تو پھر اپریل کی تنخواہ بھی نہیں ملے گی۔ غریب لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اگرچہ غریبوں کی شنوائی کے لیے بہت ساری فلاحی تنظیمیں مصروف عمل ہیں۔ الخدمت، اخوت، کاوش ویلفیئر فاؤنڈیشن، سیلانی اور ہماری اپنی تنظیم کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی گزشتہ ایک ماہ سے غریبوں کی دادرسی کر رہی ہے۔ کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی نے ملک بھر میں مختلف جگہوں پر دو ہزار سے زیادہ غریب خاندانوں میں راشن پہنچایا ہے۔ اس طرح دوسری فلاحی تنظیمیں بھی مصروف عمل ہیں۔ پاکستان میں خیر کا جذبہ بہت ہے۔ کئی مخیر حضرات اپنے طور پر غریبوں اور بے روزگاروں کی مدد کر رہے ہیں۔ مخیر حضرات روزانہ ہزاروں بیکیں پکوا کر غریبوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

وزیراعظم پاکستان کا احساس پروگرام بھی شروع ہو گیا ہے جس کے تحت غریبوں میں بارہ بارہ ہزار روپے تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ یہ وقت قربانی اور ایثار کا وقت ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ انشاء اللہ ایک دوسرے کی مدد کر کے ہم اس مشکل گھڑی سے نکل آئیں گے اور مصیبت کا یہ وقت گزر جائے گا۔

اس لیے ضروری ہے کہ اس مشکل وقت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔ اللہ پہ یقین رکھیں۔ اللہ سے لو لگائیں۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ زیادہ سے زیادہ وقت ذکر و اذکار، قرآن پاک کی تلاوت میں گزاریں۔ اگر آپ نے خود کو قرنطینہ میں رکھا ہوا ہے تو پھر پریشان ہونے کے بجائے اپنا وقت مثبت سرگرمیوں میں گزاریں۔ متوازن غذا کھائیں۔ روزانہ وقت گزارنے کا ایک شیڈول بنائیں اور اس بات کو ذہن نشین رکھیں کہ انشاء اللہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ اگر خدانخواستہ آپ کا ٹیسٹ مثبت بھی آ گیا ہے تو گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کورونا وائرس سے متاثر ہونے والے لاکھوں لوگ صحت یاب ہو چکے ہیں۔

اس بیماری سے صرف 2% فیصد لوگ مختلف وجوہ کے باعث موت کا شکار ہوتے ہیں۔ قرنطینہ میں رہتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ آپ متوازن خوراک لیں۔ اگر آپ ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، فالج یا گردوں کی بیماری میں مبتلا ہیں تو ضروری ہے کہ آپ ڈاکٹر کے مشورہ سے جو ادویات لے رہے ہیں، ان کا باقاعدگی سے استعمال کریں۔ اگر آپ کا ٹیسٹ مثبت آ بھی گیا ہے تو آپ نے اپنی دواؤں کو نہیں چھوڑنا اور بہت زیادہ احتیاط کرنی ہے۔ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کریں، چند دنوں کی بات ہے، انشاء اللہ آپ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اس بیماری پر قابو پالیں گے۔

قرنطینہ میں آپ نے سادہ مگر متوازن غذا لینی ہے۔ آپ 15 دنوں کے لیے روزانہ اپنا ایک ٹائم ٹیبل بنالیں۔ صبح سویرے فجر کے وقت اُٹھیں، وضو کریں۔ نہار منہ آپ نے چار گلاس نیم گرم پانی پینا ہے۔ اس کے ساتھ دو چمچ زیتون کا تیل پی لیں۔ اس سے آپ کے معدے اور گردوں کی صفائی ہو جائے گی۔ آپ کے پھیپھڑوں اور دل کو تقویت ملے گی۔ فجر کی نماز کے بعد تلاوت کریں۔ کمرے کے اندر ہلکی چہل قدمی یا ورزش کریں۔ صبح سات بجے آپ نے دو گلاس اسٹرابری کا ملک شیک لینا ہے۔ وائرس انفیکشن کے دوران زیادہ سے زیادہ پینے والی چیزوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان سے قوت مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

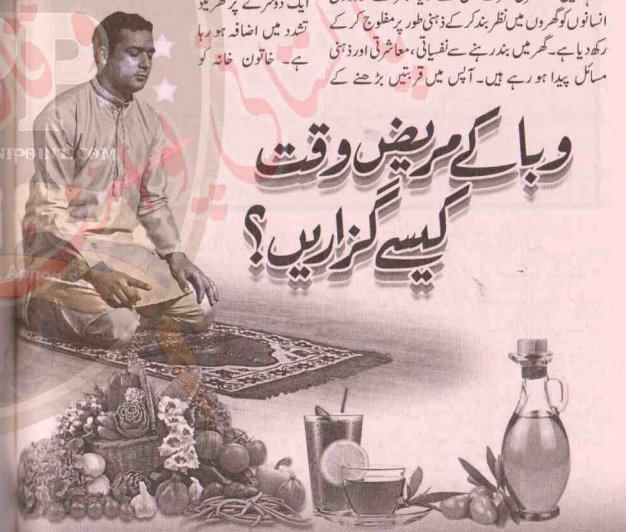

دورِ ابتلا میں جسمانی و روحانی مسائل سے نمٹتے ہوئے مدد دینے والے مفید مشورے

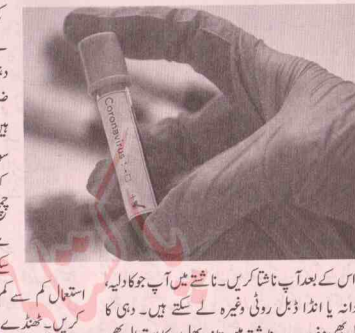

کھانا ہے۔ رات کے کھانے میں چپاتی بھی لے سکتے ہیں یا چاول/بریانی کی ایک پلیٹ دہی اور سلاد کے ساتھ۔ سلاد کا استعمال ضروری ہے۔ ایک سیب دو کیلے بھی لے سکتے ہیں۔

سونے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ ایک کپ گرم دودھ میں دو چمچ زیتون کا تیل، دو چمچ شہد اور ایک چمچ ہلدی ڈال کر ضرور لینا ہے۔ روزانہ ظہرانہ اور عصرانہ آپ تبدیل کر سکتے ہیں۔ کھانے میں مرچ اور نمک کا استعمال کم سے کم کریں۔ مرغن غذاؤں سے مکمل پرہیز کریں۔ ٹھنڈے پانی اور کولا ڈرنکس کا استعمال بالکل نہ کریں۔ گھی اور تیل کا استعمال بھی کم سے کم کریں۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ بلاؤں اور بیماریوں کو ٹالتا ہے۔ صدقہ کرنے سے آپ بلاؤں، حادثات اور آفتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ کرونا کا ٹیسٹ پازیٹو ہونے کی صورت میں مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کریں۔ انشاء اللہ آپ چند دنوں میں شفا ملے گی۔

☆سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ ہر بیماری کا علاج ہے اور شفاء اللہ تعالیٰ نے دینی ہے۔

☆صدقہ بلا کو ٹالتا ہے۔ جب دوا کارگر نہ ہو تو پھر ''صدقہ'' دینا شروع کریں۔ صدقہ دینے سے پہلے اچھی طرح وضو کریں اور دو رکعت نماز صلوٰۃ الحاجات پڑھ کر عاجزی وانکساری سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگیں اور صدقے کے لیے رقم نکال لیں۔ یہ عمل روزانہ کرنا ہے۔

ہر دوسرے دن صدقے کے پیسے پہلے دن سے دُگنا کرتے جائیں۔ یعنی پہلے دن دس، دوسرے دن بیس، تیسرے دن چالیس اور چوتھے دن اسی۔ اسی طرح پندرہ

اس کے بعد آپ ناشتا کریں۔ ناشتے میں آپ جو کا دلیہ، ساگودانہ یا انڈا ڈبل روٹی وغیرہ لے سکتے ہیں۔ دہی کا استعمال بھی مفید ہے۔ ناشتے میں تازہ پھلوں کا استعمال بھی قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ ناشتے کے بعد غسل فرمائیں۔ لباس تبدیل کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ کسی کتاب کا مطالعہ کریں۔ 10 بجے آپ ایک کپ چائے یا لیمن گراس قہوہ لے سکتے ہیں۔ اس دوران آپ وقتاً فوقتاً نیم گرم پانی کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی اثناء میں دوپہر کا وقت ہو جائے گا۔ ظہر کی نماز ادا کریں۔ اللہ سے خوب باتیں کریں۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا لیں۔

کھانے میں متوازن غذا ضروری ہے۔ دو چپاتیوں کے ساتھ ایک سالن کی پلیٹ لیں۔ سلاد کا استعمال ضروری ہے۔ سالن میں گوشت بھی لے سکتے ہیں اور سبزیاں بھی۔ دن میں ایک بار چاول بھی لے سکتے ہیں۔ عصر کی نماز ادا کریں۔ کچھ دیر ذکر واذکار میں گزاریں۔ تیسرا کلمہ، درود شریف اور استغفار کی تسبیح کریں۔ عصر کے بعد آپ دو گلاس نمکین لسی، شکر شربت، تخم ملنگاں شربت وغیرہ لے سکتے ہیں۔ مغرب کی نماز ادا کریں۔ اللہ سے پھر دُعا کریں۔ ذکر واذکار میں وقت گزاریں۔ رات کا کھانا آپ نے سونے سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل

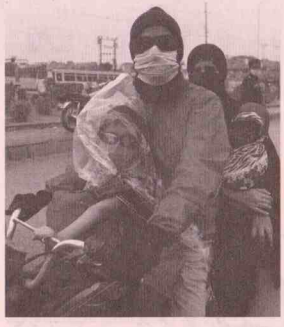

دن تک عمل جاری رکھیں۔ سات دن کی رقم اکٹھی ہو جائے تو صدقہ کر دیں۔ روزانہ بھی صدقہ کسی کو دے سکتے ہیں۔

☆اس دوران علاج کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے شفاء کی اُمید رکھیں۔ لمبی اور جان لیوا بیماری کی صورت میں یہ عمل چھے ماہ تک ہر مہینے چاند کی پہلی تاریخ سے دس تاریخ تک کریں اور مختصر بیماری کی صورت میں انشاء اللہ یہ عمل پندرہ دن یا ایک ماہ کرنا ہی کافی ہے۔

☆ دکھوں، تکالیف، ناگہانی آفتوں اور حادثات سے بچنے کے لیے بھی یہ عمل کافی کارگر ثابت ہوتا ہے۔ روزانہ صدقہ چاہے کتنا ہی کم ہو حادثات اور ناگہانی آفتوں سے بچنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔

☆☆☆

قرنطینہ میں رہنے والوں کے لیے کھانے کا نظام

☆صبح نہار منہ فجر کی نماز کے بعد..... چار گلاس گرم پانی + دو چمچ زیتون کا تیل۔

☆صبح سات بجے..... دو گلاس تازہ رس (اسٹرابری)۔

☆ناشتا..... ایک گلاس دودھ + دو سلائس + ایک ابلا ہوا انڈہ یا آملیٹ + دو چمچ شہد۔

☆دس بجے..... ایک کپ چائے + تین چار بسکٹ۔

☆بارہ بجے..... دو کپ گرم پانی۔ ایک کپ لیمن گراس قہوہ۔

☆ دوپہر کا کھانا..... دو چپاتی/ ایک پلیٹ گوشت/ سبزی سالن + ایک کپ دہی + تازہ پھل اور سلاد۔

☆ شام کی چائے/ لسی..... دو گلاس نمکین لسی/ ایک کپ چائے/ ایک گلاس فروٹ جوس۔

☆رات کا کھانا..... (سونے سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے) دو چپاتی + ایک پلیٹ سالن گوشت/ سبزی یا ایک پلیٹ چاول + ایک پیالی دہی + تازہ پھل اور سلاد۔

☆ سونے سے آدھ گھنٹہ پہلے..... ایک گلاس دودھ + دو چمچ زیتون کا تیل + دو چمچ شہد + آدھا چمچ ہلدی۔

ضروری ہدایات:

☆مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔

☆مرچ، مسالا اور گھی کم استعمال کریں۔

☆ پانچ وقت نماز ادا کریں۔

☆ فجر کے بعد اور سونے سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت کریں۔

☆ ہمیشہ بھوک رکھ کر کھانا کھائیں۔

☆ روزانہ صدقہ دیں۔

●●●

☆کسی سے نیکی کر تو یہ سمجھ کر کرو کہ نیکی تم اپنی ذات سے کر رہے ہو۔

☆کم بولنے والے اور دوسروں کی خوب سننے والوں کا ہر جگہ استقبال ہوتا ہے۔

اِنتقام

سعادت حسن منٹو

ایک حساس ڈائرکٹر کی کتھا، اچانک اسے ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ دم بخود رہ گیا

ڈائریکٹر کرپلانی اپنی بلند کرداری اور خوش اطواری کی وجہ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بعض لوگ تو حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ ایسا نیک اور پاکباز آدمی فلم ڈائریکٹر کیوں بن گیا۔ کیونکہ فلم کا میدان ایسا ہے جہاں جا بجا گڑھے ہوتے ہیں ان دیکھے گڑھے، بے شمار دلدلیں، جن میں آدمی ایک دفعہ پھنسا تو عمر بھر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔

وہ کامیاب ڈائریکٹر تھا۔ اس کی ہر فلم باکس آفس ہٹ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سب فلم ساز اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بیتاب رہتے۔ مگر وہ لالچی نہیں تھا۔ ایک فلم بنا کر وہ دو تین مہینے کے لیے پنج گنی یا رونا ولہ چلا جاتا اور اپنی آئندہ فلم کی کہانی اور منظر نامے بڑے اطمینان سے تیار کرتا رہتا۔ وہ رہنے والا سندھ حیدر آباد کا تھا۔ سفید ٹول کی قمیص اور سفید زین کی پتلون کے علاوہ اور کوئی لباس نہیں پہنتا تھا۔

شام کو چھ بجے ایک بوتل بیئر کی پیتا۔ لیکن اگر شوٹنگ رات کو ہو تو بوتل اس کے کمرے میں پڑی رہتی۔ وہ نشے کی حالت میں کام کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ نشہ انسان کے ذہنی اعصاب کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ فلمی دنیا میں عشق معاشقے عام ہوتے ہیں۔ آج اگر ایک ایکٹرس کسی ڈائریکٹر کے پاس ہے تو دوسرے روز وہ کسی اور ڈائریکٹر کی بغل میں ہو گی۔ وہاں سے پھسل کر وہ شاید کسی نواب یا راجا کی گود میں چلی جائے۔

سیلولائڈ کی یہ دنیا بڑی نرالی

ہے۔ یہاں دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت رہتی ہے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں، ایک ہی دن میں کئی وارداتیں ہوئی۔ ایک ایکٹرس اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ پتی دیو صاحب جس سے ملتے اس کے سامنے اپنی بدقسمتی کا رونا روتے۔ ایک ڈائریکٹر نے اپنی بیوی کو زہر دے کر مار ڈالا۔ دوسرے نے محبت کی ناکامی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے خودکشی کر لی۔ ایک ایکٹرس کے حرامی بچہ پیدا ہوا۔

ڈائریکٹر کرپلانی یوں تو اسی دنیا میں رہتا تھا مگر سب سے الگ تھلگ۔ اس کو صرف اپنے کام سے غرض تھی۔ شوٹنگ ختم کی اور اپنے خوبصورت فلیٹ میں واپس چلا آیا۔ اسے کسی ایکٹرس سے تعلقات پیدا کرنے کی کبھی خواہش ہی نہیں تھی۔

ایک مرتبہ مس دلربا نے اس سے رغبت کا اظہار کیا۔ کرپلانی اس کو علیحدہ کمرے میں ڈائلاگ کی ریہرسل کرا رہا تھا کہ ایکٹرس نے اس سے بڑے دلبرانہ انداز میں کہا:

''کرپلانی صاحب! آپ پر سفید کپڑے بہت پھبتے ہیں۔ میں بھی اب سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز پہنا کروں گی۔''

کرپلانی نے جس کے دماغ میں اس وقت فلمائے جانے والے سین کے ڈائیلاگ گھسے ہوئے تھے، اس سے کہا:

''ہاں۔ مگر سفید چیزیں بہت جلد میلی ہو جاتی ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟''

''ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن تمھیں کم از کم چودہ پندرہ ساڑھیاں اور اسی قدر بلاؤز بنوانے پڑیں گے۔''

ایکٹرس مسکرائی، بولی: ''بنوالوں گی۔ آپ ہی لے دیں گے۔''

کرپلانی چکرا گیا۔ پوچھا: ''میں...... میں آپ کو کیوں لے کر دوں گا؟''

ایکٹرس نے کرپلانی کی قمیص کا کالر جو کسی قدر سمٹا ہوا تھا، بڑے پیار سے درست کیا اور کہا: ''آپ میرے لیے سب کچھ کریں گے۔ اور میں آپ کے لیے۔''

قریب تھا کہ وہ ایکٹرس کرپلانی کے ساتھ ہو جائے کہ اس نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور غصے سے کہا: ''خبردار جو تم نے ایسی بے ہودہ حرکت کی۔''

دوسرے روز اس نے ایکٹرس کو اپنی فلم سے نکال باہر پھینکا۔ وہ دو ہزار روپے ایڈوانس لے چکی تھی۔ کرپلانی نے سیٹھ سے کہا کہ وہ روپے اس کے حساب میں ڈال دے۔

سیٹھ نے پوچھا: ''بات کیا ہے مسٹر کرپلانی؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔ واہیات عورت ہے۔ میں اس کو پسند نہیں کرتا۔''

اتفاق کی بات ہے کہ وہ ایکٹرس سیٹھ کی منظورِ نظر تھی۔ سیٹھ نے جب زور دیا کہ وہ فلم کاسٹ میں موجود رہے گی تو کرپلانی دفتر سے باہر چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ کرپلانی کی عمر یہی پینتیس برس کے قریب ہو گی۔ خوش شکل اور نفاست پسند تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اپنے خوبصورت فلیٹ میں اکیلا رہتا، جہاں اس کے دو نوکر تھے۔ باورچی اور ایک دوسرا نوکر جو گھر کی صفائی کرتا تھا اور آرام آسائش کا خیال رکھتا۔ وہ ان دونوں سے مطمئن تھا۔

اس کی زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی۔ اسے عورت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر اس کے ہم عصر فلم ڈائریکٹروں کو سخت تعجب تھا کہ وہ عموماً رومانی فلم بناتا تھا جس میں مرد اور عورت کی پرجوش محبت کے مناظر ہوتے۔ اس کے دوست گنتی کے تھے۔ ان میں سے ایک میں تھا جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا:

''کرپ۔ یہ کیا بات ہے کہ تم کبھی عورت کے نزدیک نہیں گئے، پر تمھاری فلموں پر عشق و محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تجربے کے بغیر تم ایسے مناظر کیوں کر لکھتے ہو، جس میں کیوپڈ ہوتا ہے یا اس کے تیر۔''

PAKISTANIPOINT.COM

یہ سُن کر وہ مسکرایا۔ کہنے لگا: ''آدمی تجربے کی بنا پر جو سوچے وہ ٹھس ہوتا ہے۔ پر تخیل کے زور سے جو کچھ سوچے، اُس میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ فلم سازی فریب کاری کا دوسرا نام ہے۔ جب تک تم اپنے آپ کو فریب نہ دو، دوسروں کو نہیں دے سکتے۔''

اس کا یہ فلسفہ عجیب وغریب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ''کیا تم نے تخیل میں کوئی ایسی عورت پیدا کر لی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو؟''

کرپلانی پھر مسکرایا۔ بولا: ''ایک نہیں سینکڑوں۔ ایک عورت سے میرا کام کیسے چل سکتا ہے۔ مجھے عورت نہیں اس کے کردار سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ میں ایک عورت اپنے تخیل میں پیدا کرتا اور اس کو اُلٹ پلٹ کرتا رہتا ہوں۔''

''اُلٹ پلٹ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''یار تم بڑے کم سمجھ ہو۔ عورت کا جسمانی ڈھانچہ تو ایک ہی قسم کا ہے۔ پر اس کا کیریکٹر جداگانہ ہوتا ہے۔ کبھی وہ ماں ہوتی ہے کبھی چڑیل، کبھی بہن، کبھی مردانہ صفات رکھنے والی۔ سو ایک عورت میں تم سو روپ دیکھ سکتے ہو۔ اور صرف اپنے تخیل کی مدد سے۔''

میں نے ایک روز کرپلانی کی غیر موجودگی میں اُس کے میز کا دراز کھولا کہ میرے پاس ماچس نہیں تھی۔ مجھے کاغذات کا ایک پلندہ نظر آیا، جو غالباً اس کے تازہ فلم کا منظر نامہ تھا۔ میں نے اُس کو اُٹھایا کہ شاید اس کے نیچے ماچس کی کوئی ڈبیا ہو۔ لیکن اس کے بجائے مجھے ایک فوٹو دکھائی دی جو ایک خوبصورت سندھی لڑکی کی تھی۔ میں فوٹو نکال کر غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کرپلانی آ گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں فوٹو دیکھی تو دیوانہ وار آگے بڑھ کر چھین لی اور اُسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے اُس سے معذرت طلب کی:

''معاف کرنا کرپ۔ میں دیا سلائی تلاش کر رہا تھا کہ یہ فوٹو مجھے نظر آئی اور میں اسے دیکھنے لگا۔ کس کی ہے؟''

اس نے یہ کہہ کر معاملہ گول کرنا چاہا: ''کسی کی ہے۔''

میں نے پوچھا: ''آخر کس کی؟ اس لڑکی کا کوئی نام تو ہوگا۔''

کرپلانی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا: ''اس کے کئی نام ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ رادھا تھی۔ ناموں میں کیا پڑا ہے۔ یہ وہ لڑکی ہے جس سے میں نے عرصہ ہوا محبت کی تھی۔''

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ''تم نے؟...... تم نے محبت کی تھی؟''

''کیوں؟ میں کیا محبت نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب محبت کے نام ہی سے دُور بھاگتا ہوں۔ لیکن جوانی کے دنوں میں ہر انسان کو ایسے لمحات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جب وہ دوسری صنف میں بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے۔''

میں جاننا چاہتا تھا کہ کرپلانی کو اس لڑکی سے کیسے عشق ہوا۔

''یہ کب کی بات ہے کرپ؟ تم نے آج مجھے حیرت زدہ کر دیا کہ تم کسی سے عشق لڑا چکے ہو۔ تمہارے عشق کا انجام کیا ہوا۔''

کرپلانی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ''بہت افسوسناک۔''

''کیوں؟''

''میں اس سے محبت کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ میں دلچسپی لیتی ہے۔ آخر ایک دن جب میں نے اسے ٹٹولا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا لیکن میں نے اپنے دل میں اس بت کو بھی توڑ ڈالا جس کی میں پوجا کیا کرتا تھا۔ میں نے اُس کو بے شمار بددعائیں دیں کہ وہ مر جائے۔''

میں نے پوچھا: ''کیا وہ مر گئی؟''

گدھے کہاں گئے؟

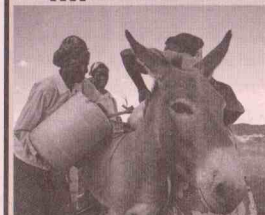

افریقی ملک نائیجر نے ایشیا میں گدھوں کی بڑھتی مانگ کے پیشِ نظر ملک سے گدھوں کی برآمد پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایک حکومتی اہلکار کہتا ہے کہ اگر برآمد جاری رہی تو نائیجر میں گدھوں کی آبادی کو شدید قلت کا سامنا ہو جائے گا۔ یاد رہے، چین بڑی مقدار میں گدھوں کی کھالیں درآمد کرتا ہے، جن کے مختلف اجزا کو ادویات اور کریمیں بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نائیجر کے ہمسایہ ملک، برکینا فاسو نے بھی انھی خدشات کے پیشِ نظر گدھوں کی برآمد پر پابندی لگا دی تھی۔ نائیجر میں مویشیوں کے امور کی وزارت نے بتایا کہ اس سال تقریباً 80 ہزار گدھے برآمد کیے جا چکے۔ گذشتہ سال یہی تعداد 27 ہزار تھی۔ حکومت ملک میں گدھوں کو ذبح کرنے پر بھی پابندی لگا چکی۔

گدھوں کا کاروبار ملک میں اس وقت اس قدر منافع بخش ہے کہ لوگ دیگر جانوروں کا کاروبار چھوڑ کر اس کا رخ کر رہے ہیں۔ اب ایک گدھے کی قیمت تقریباً ایک سو ڈالر کے قریب پہنچ گئی ہے جو کچھ عرصہ قبل 34 ڈالر کے قریب تھی۔ گذشتہ چند سالوں میں ہمسایہ ملک برکینا فاسو میں بھی گدھوں کی کھالوں کی قیمت میں ایسا ہی اضافہ دیکھا گیا جہاں ایک کھال کی قیمت تقریباً چار ڈالر سے بڑھ کر 50 ڈالر تک جا پہنچی تھی۔ دونوں ممالک میں گدھوں کو بار برداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم کچھ برادریوں میں گدھوں کا گوشت بطور خوراک بھی مستعمل ہے۔

گدھوں کی کھال سے بننے والے جیلاٹن کو چین میں بطور طاقت کا شربت استعمال کیا جاتا ہے۔ وہاں خیال ہے کہ اس سے خون اور مدافعتی نظام کی افزائش ہوتی ہے۔ اسے کبھی کبھی جنسنگ اور نوجوان ہرنوں کے سینگوں سمیت تین خوراکی خزانوں میں سے ایک تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چینی اس کو خشک میوہ جات کے ہمراہ بھی کھاتے ہیں۔ چین میں بہت سے لوگ صحت اور لمبی عمر پانے کے لیے بہت سی مختلف اور نایاب غذائیں کھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی اشیا کو بطور تحائف بھی دیا جاتا ہے۔

''ہاں اُسے مرنا ہی تھا، اس لیے کہ اُس نے مجھے مار ڈالا تھا۔ اُس کو ٹائیفائیڈ ہوا اور ایک مہینے کے اندر اندر چل بسی۔''

''تمھیں اس کی موت کا افسوس نہیں ہوا؟''

''مجھے افسوس کیوں ہوتا؟ میری آنکھوں میں چند آنسو آئے، بہنے والے تھے کہ میں نے اُن سے کہا، بے وقوفو کیوں خود کو ضائع کر رہے ہو۔ اور وہ میرا کہا مان کر واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے۔''

یہ کہتے ہوئے کرپلانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ شاید وہی جو اس کا کہا مان کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب اس معاملے پر اور زیادہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے چنانچہ میں اس سے رخصت لیے بغیر چلا گیا۔ میرا خیال

تھا کہ وہ تنہائی میں رہ کر اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے روز اُس سے ملاقات ہوئی تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ مجھے اپنے ساتھ اسٹوڈیو میں لے گیا وہاں چہک چہک کر مجھ سے اور اپنے ٹیکنیکل سٹاف سے باتیں کرتا رہا۔

یہ اس فلم کی شوٹنگ کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد کرپلانی ایڈیٹنگ میں قریب قریب ایک ماہ تک مصروف رہا۔ ریکارڈنگ ہوئی۔ پرنٹ تیار ہوئے، فلم ریلیز ہوئی۔ اور بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ حسبِ دستور وہ پنج گنی چلا گیا اور ڈیڑھ مہینے تک وہاں بڑی پُرسکون اور صحت افزا فضا میں اپنی آئندہ فلم کے لیے کہانی اور اُس کا منظر نامہ تیار کرتا رہا۔ اس کا ایک نئی فلم کمپنی سے کنٹریکٹ ہو چکا تھا۔ کہانی بہت پسند کی گئی۔ اب کاسٹ چننے کا مرحلہ باقی تھا۔

سیٹھ چاہتا تھا کہ ہیروئن کے لیے کوئی نیا چہرہ لیا جائے۔ دراصل وہ پہلے ہی سے ایک خوش شکل لڑکی منتخب کر چکا تھا۔ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ لڑکی کو ایک دم ہیروئن بنا دے۔ پر جب اس نے کہانی سنی تو اس کی ہیروئن میں اسے ہو بہو اُسی لڑکی کی شکل و شباہت اور چال ڈھال نظر آئی۔ اُس نے کرپلانی سے کہا:

"میں نے ایک لڑکی کو ملازم رکھا ہے۔ آپ اسے دیکھ لیجیے۔ آپ کے فلم کے لیے بڑی مناسب ہیروئن رہے گی۔"

کرپلانی نے کہا: "آپ اُس کو بُلایئے۔ میں دیکھ لُوں گا، کیمرہ اور ساؤنڈ ٹیسٹ لینے کے بعد اگر میرا اطمینان ہو گیا تو مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا کہ اُسے ہیروئن کا رول دے دوں۔"

دوسرے روز صبح دس بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ کرپلانی کی یہ عادت تھی کہ صبح سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اسٹوڈیو آجاتا اور ادھر اُدھر ٹہلتا رہتا۔ دس بجے تک وہ نئے اسٹوڈیو کی ہر چیز دیکھتا رہا۔ ساڑھے دس بج گئے۔ اس نے بوتل منگوائی مگر اسے نہ کھولا۔ اُسے یاد آ گیا کہ اُس نئے چہرے کو دیکھنا ہے۔ گیارہ بج گئے، مگر سیٹھ کا دریافت کیا ہوا نیا چہرہ نمودار نہ ہوا۔

کرپلانی اُکتا گیا۔ اس نے اپنی کہانی کے منظر نامے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس میں کچھ ترمیم کی۔ اس دوران میں بارہ بج گئے۔ وہ صوفے پر لیٹ کر سونے ہی والا تھا کہ چپڑاسی نے کہا: "سیٹھ صاحب آپ کو سلام بولتے ہیں۔"

کرپلانی اُٹھا۔ سیٹھ کے دفتر میں گیا جہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ جب وہ سیٹھ کی کرسی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تو دم بخود ہو گیا۔ اس کی شکل و صورت بالکل اسی لڑکی کی سی تھی جس سے اُس نے عرصہ ہوا محبت کی تھی۔ سیٹھ باتیں کرتا رہا مگر کرپلانی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بہر حال اُس لڑکی کو ہیروئن کے رول کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کرپلانی اُس لڑکی کو قریب قریب ہر روز دیکھتا اور اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔ ایک دن اُس نے ہمت سے کام لے کر اس سے پوچھا: "آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

لڑکی نے جواب دیا: "سندھ حیدر آباد کی۔"

کرپلانی چکرا گیا۔ "سندھ حیدر آباد کی؟ آپ کا نام؟" اس نے پوچھا۔

لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا: "دیشو دھرا۔"

"آپ کی کوئی بہن ہے؟"

"تھی۔ مگر اس کا دیہانت ہو چکا۔"

"کیا نام تھا ان کا؟"

"رادھا!"

کرپلانی نے یہ سنتے ہی اپنا دل پکڑ لیا اور بے ہوش ہو گیا۔ دوسرے روز وہ اچانک مر گیا۔

◆◆◆

کار رجسٹریشن کا پُل صراط

ایک "بے کار" کو جب اپنی گاڑی رجسٹر کراتے ہوئے ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑا کہ توبہ ہی بھلی

بریگیڈیئر محمد اسماعیل صدیقی

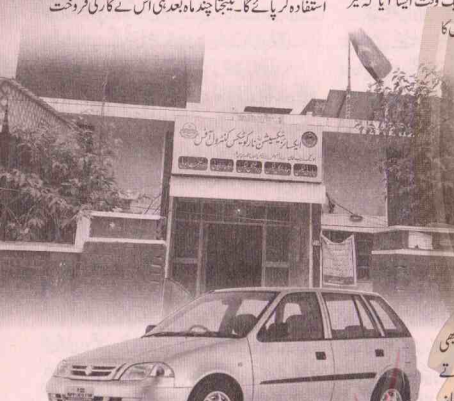

پرانے روایت پسندوں کی مانند ہم بھی ایک عدد کار ماڈل 1967ء کے تقریباً اسّی سن ء سے مالک تھے۔ اس کار نے خاصا ساتھ دیا اور بڑی دُور دُور تک۔ بس یوں سمجھیے کہ ملک کے ایک سرے، مری سے لے کر ملک کے دوسرے کنارے، تفتان بلوچستان تک براستہ کراچی دیا اور کبھی بری طرح وجۂ پریشانی نہیں بنی لیکن تابہ کے۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ خیر خواہوں نے مشورہ دیا، اس میں ڈیزل کا انجن ڈلوا لو۔ اخراجات [illegible] کم ہو جائیں گے۔ یہ نہیں بتایا کہ دردسری میں کس حد تک اضافہ ہوگا کیونکہ اب اس کی دیکھ بھال ایک اور مسئلہ بن رہی تھی۔ اسی دوران فرزند ثانی کی شادی ہو گئی۔ [illegible] اپنی آمدورفت میں دشواری ہونے لگی تو اس نے بھی ایک معصومانہ سی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اپنی طرف سے ایک مخلصانہ مشورہ بھی داغ دیا۔

"ابو جی! آپ یہ گاڑی مجھے دے دیں۔ اور اپنے لیے ایک نئی کار خرید لیں۔"

جیسے یہ کوئی آسان اور سہل کام تھا۔

یہی آنے والے وقت نے ثابت بھی کیا اور اسی طرح اس کا اپنا اندازہ بھی غلط ثابت ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ میری پرانی کار سے استفادہ کر پائے گا۔ نتیجتاً چند ماہ بعد ہی اس نے کار کی فروخت

کا اشتہار دے دیا۔ اس طرح نہ صرف اس سے اپنی بلکہ میری جان بھی خلاصی کروا دی۔ اب نہ صرف وہ خود بلکہ میں بھی...... بے کار...... یہاں وہاں پھر رہے تھے۔ اسی دوران اس کا اپنا تو ایسے مقام پر تبادلہ ہو گیا کہ جہاں کار تو درکنار بے کار بھی نہیں گھوم پھر سکتے تھے۔

اب ہمارے لیے صرف ٹیکسیوں پر انحصار، ان کا انتظار اور بھاؤ تاؤ پر تکرار گراں گزرنے لگی۔ سارے خاندان کے بلاقیمت دیے گئے قیمتی مشوروں کی تان ہمیشہ اس پر ٹوٹتی۔

''نئی کار خرید لو۔''

البتہ یہ مشورہ دینے کو کوئی تیار نہ ہوتا کہ یہ کیونکر اور کیسے ممکن ہو گا؟ کیونکہ کہنے والے نے شاید اسی لیے کہا تھا:

کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی ''بینکار'' ہوتا

نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی چارہ سازی خود ہی کرنا پڑی اور ''بینکاری'' بھی۔ کچھ جائیداد کو ٹھکانے لگانا پڑا۔ کچھ جمع جوڑ کو خانۂ خاص سے نکالنا پڑا اور کار کے حصول کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ پہلے تو ''Kia'' والوں کو درخواست داغی۔ پھر پیلی ٹیکسی سے ملنے والی گاڑیوں کی سکیم میں درخواست دی۔ ''کیا'' والوں نے کہا، تم نے اچھا کیا مگر اب ذرا انتظار کرو۔ یہی کوئی دو تین سال۔ خوش قسمتی ضرور تمہارا در چومے گی۔ لیکن خوشخبری اور کہیں منتظر تھی۔ وہ یہ کہ ییلو کیب سکیم میں خوش قسمتی سے ایک اپنے نام اور ایک بیٹے کے نام گاڑی کا پرمٹ نکل آیا۔

مگر دو تو درکنار اس وقت تو ادائیگی کے لیے ایک کنار، میرا مطلب ہے ایک کار کے لیے بھی پوری رقم پاس نہ تھی۔ اس لیے وہ دونوں ''جھاڑی والے پرندے'' ثابت ہوئیں۔

''کیا'' سے پیسے واپس لیتے لیتے ''پیلی ٹیکسی'' گاڑیوں کی تاریخ بھی نکل گئی اور ہم بے کار کے بے کار رہے۔ تمام تگ و دو بھی بیکار ثابت ہوئی۔

اس دوران ایک مشتہر کار پر نظر جمی جو سب کی اس فہمائش پر پوری اُترتی تھی کہ: ''نئی ہو، زیرو میٹر ہو۔ تا کہ چار پانچ سال تک تو ورکشاپوں کی سلامتی اور سرپرستی سے جان خلاصی رہے۔''

فی الحال موضوع محدود رکھتے ہوئے نو واردانِ عشق یا اشک کی داستان سنیے۔ اگر ممکن ہے تو اشک شوئی کیجیے وگرنہ...... دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

قصہ مختصر کہ کار آ گئی۔ اب مسئلہ تھا اس کی رجسٹریشن کا تا کہ نمبر مل سکے لیکن رجسٹریشن سے پہلے محکمہ انکم ٹیکس سے ایک عدد این او سی یعنی نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ پہلے تو آپ ہماری آبجیکشن سنیے کہ یہ اصطلاح ہی غلط ہے۔ اسے تو ہونا چاہیے تھا سرٹیفکیٹ برائے آبجیکشن کہ اس کام کو کرنے سے پہلے کیا ممکنہ ''اعتراضات'' اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ آیئے اور سمجھیے۔

حصولِ سرٹیفکیٹ سے پہلے ایک اور چھوٹی سی داستانِ درد سن لیجیے۔

ہم کار پر Applied For Registration کا سٹیکر لگا کر ایک دن دردِ دل کا علاج کرانے سوئے اسپتال رواں دواں تھے کہ ناکہ لگائی ٹریفک پولیس نے روک لیا اور پوچھا کہ آپ غیر رجسٹرڈ شدہ گاڑی سڑک پر کیوں لے آئے؟ اب ہم لاکھ کاغذات دکھائیں کہ دیکھیے درخواست دے چکے ہیں۔ اپنے اسپتال کے کاغذات دکھائے۔ کہ دیکھیے دل کے مریض ہیں۔ وہ سامنے اسپتال ہے۔ وہاں جا رہے ہیں لیکن وہ پولیس کے اعلیٰ آفیسر مُصر کہ چالان ہو گا۔ ''ہمیں اُوپر سے آرڈر آئے ہیں۔''

اور ہمیں یہ ڈر کہ اس بحث میں ہی کہیں ہمارے ''اوپر'' سے آرڈر نہ آ جائیں لیکن وہ کہ اپنی بات پر اڑے رہے اور چالان کر کے چھوڑا۔ ہم وہاں سے یہ دعا کرتے ہوئے رخصت ہوئے: ''کہیں تمہارے یا تمہارے بزرگ کے ان حالات میں ''اوپر'' سے آرڈر آ گئے تو کیا کرو گے؟'' لیکن

ایسی باتیں کون سوچتا ہے۔ شاید کبھی کوئی سوچ ہی لے۔

دوبارہ ایسی صورت حال سے بچنے کے لیے نئے سرے سے تگ و دو شروع کی۔ ہمارے ایک دوست کے کارندے نے ازراہ ''ہم۔ در۔ دی'' ہمارا کام جلد از جلد کروانے کا بیڑا اُٹھایا کیونکہ ان کی متعلقہ دفاتر میں خاصی یاد اللہ تھی۔ بس اسی حد تک کہ جتنی ہونی چاہیے۔

سو جب ہماری درخواست یا بالفاظ دیگر کاغذات برائے درخواست اس دفتر تک پہنچے تو ان کی رضامندی کے ساتھ ساتھ ایک جوابی درخواست بھی مجھے موصول ہو گئی کہ جب تک میں یہ کام کرواتا ہوں آپ تب تک مہربانی فرما کے جلدی سے اپنے ذاتی رسوخ اور تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے ذرا ہمارے نواسے کو اسکول میں داخلہ تو دلوا دیجیے۔

اب اس معاملے میں یہ تیسری داستان بے مہار آ گئی۔ ''بے مہار'' اس لیے کہ ''نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ مہار پر'' سو اسے کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ پرانے شہسوار ٹھہرے تو دو چار دوڑیں اب بھی لگا سکتے ہوں گے۔

چند دن تک آج کل کے وعدے کے بعد ان صاحب نے دل کی بات (اپنے نہیں کسی اور کے دل کی) ہم تک پہنچائی کہ جناب کچھ چائے پانی کا بندوبست ہو جائے تو کام دو چار روز میں ہو سکے گا۔ اب ہم جو ہمیشہ اس بات کے قائل رہے کہ بڑی خوشی سے آیئے اور ہماری مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئیے۔ وہاں شرم مانع تھی کہ یہ چائے پرائیویٹ میں پی جائے گی، مجلس میں نہیں۔ جب بل کا پوچھا تو کہا یہی کوئی دو سو روپے کی چائے اور پچاس روپے کا پانی یعنی ڈھائی سو روپے۔

جو کام زندگی بھر نہ کیا تھا۔ آئندہ کے لیے ''اُوپر سے آرڈر'' کا خمیازہ بھگتنے سے بچنے کے لیے اُسے کرنا مناسب جانا اور بادل ناخواستہ ہامی بھر لی۔ پھر سوچا، رسم دنیا بھی ہے، دستور بھی ہے۔ کون جانے یہ دستور ملک کی پہچان نہ بن جائے؟

لیکن حضرتِ دل کسی طور اجازت ہی نہیں دے پاتے تھے۔ اس لیے دل اور دماغ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ہمیں ایسے ناروا جھمیلوں سے دو چار نہ ہی کیا جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ کون جانے دونوں یا دونوں میں سے ایک یکدم جواب ہی دے جائے اور لوگ باگ چائے پانی کے بجائے پلاؤ کھائیں گے اور فاتحہ ہو گا کی عملی تصویر بنے بخوشی افسوس کر رہے ہوں۔

مگر جلد ہی پتا چل گیا کہ نہ تو میری بیل منڈھے چڑھ رہی تھی۔ (وجوہ آگے آئیں گی) اور نہ ہی ان کے نواسے کے داخلے کی۔ اس لیے اپنے اپنے کاغذات کا بہ حسرت و یاس تبادلہ کر لیا گیا۔ جیسے آپ نے اکثر ٹیلی وژن پر ملکی معاہدات کا تبادلہ ہوتے دیکھا ہو گا۔ چونکہ صورت حال قطعی نئی کروٹ لے چکی تھی، اس لیے معاملہ قطعی نئے سرے سے اُٹھایا گیا۔

اب ایک محکماتی دوست سے تعلقات کو واسطہ بنایا۔ انھوں نے اپنے ایک دوسرے کولیگ کا نام اور حوالہ دیا۔ کہا جائیے، ان سے ملیے، آپ کا کام ہو جائے گا لیکن شاید وہ بھی ''انشاء اللہ'' کہنا بھول گئے تھے۔ ویسے سفارش تو سفارش ہی ہوتی ہے۔ وہاں نعوذ باللہ اللہ کی مرضی شامل کر کے کیوں مفت کا گنہگار بنتے۔ اس لیے لوگ سب گور گردن دوسروں کے شانے پر ہی بھلی سمجھتے ہیں۔ بہرکیف میں نے پوچھا:

''میرا دل؟''

کہنے لگے، ''فکر نہ کریں۔ چوتھی منزل ضرور ہے مگر لفٹ کا انتظام ہے۔ آپ دلجمعی سے جائیے اور دل کھول کر بات کیجیے اور بلا دل تھامے اپنا کام کروا کے واپس آیئے۔''

مگر کیا معلوم تھا کہ واہ نہیں بلکہ مقاماتِ آہ و فغاں پتا نہیں کتنے اور تھے؟

دوست کے دوست بلکہ کولیگ تک پہنچے۔ انھوں نے بلاشبہ عزت و احترام بخشا اور پھر بتایا کہ ہمارے کام کے نہ ہو

سکنے میں کتنی رکاوٹیں ہیں اوران کی کیا کیا مجبوریاں ہیں۔

بات یوں کھلی کہ اگر چہ میں ٹیکس گزار ہوں بلکہ دولت ٹیکس گزار بھی۔ یہی کوئی دو ہزار کے لگ بھگ۔ یہ بتانے کی یوں ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ناپسندیدہ شخصیت ہماری دولت کے بارے غلط مفروضات نہ قائم کرلے۔ لیکن بدقسمتی نے یوں گھیرا کہ ہم ایک محکماتی مثلث میں پھنس گئے تھے۔ شروع میں تو یہ وضاحت سمجھ میں نہ آئی پھر عقدہ کھلا۔

میری مستقل رہائش گاہ مقام (بلکہ سیکٹر) ''الف'' میں ہے۔ اس لیے میں سیکٹر (1) میں آتا ہوں مگر جس جائیداد پر میں ٹیکس ادا کرتا ہوں، وہ مقام ''ب'' پر ہے۔ اس لیے میرا واسطہ سیکٹر نمبر 2 سے پڑنا چاہیے لیکن سابقہ سرکاری ملازم اور پنشنر ہونے کی حیثیت میرے کوائف سیکٹر نمبر 3 میں ہیں۔ اس لیے یہ سرٹیفکیٹ دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری فائل تین سیکٹروں میں سرگرداں ہے۔ اب یہ طے ہونا تھا کہ این۔او۔سی جاری کرنے کا اصل مجاز کون ہے؟ چونکہ تینوں مجاز ٹھہرے تھے، اس لیے تین ''اسرار الحق مجاز'' سامنے آ گئے۔ مجال تھی کہ ذمہ داری کا جواز لا پاتے۔

ظاہر ہے کہ ہمیں یہ سوال کرتے بن پڑی ''تو پھر کیا کیا جائے۔ آخر راہ نجات کیا ہوگی؟''

جواب ملا: ''بہتر ہے۔ کمشنر صاحب سے مل لیجیے۔''

یوں ایک ذرا سی پرزہ رسائی کے لیے اتنے اونچے افسر تک جانا پڑ گیا مگر اس کے سوا اور کوئی ''چارۂ کار'' نہ تھا، سو یہی کرنا پڑا۔

خاصے انتظار (اور جائز انتظار) کے بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھیں خاصا شفیق، ہمدرد اور معقولیت پسند پایا۔ اگر چہ میں نے بات شروع میں ذرا تلخ انداز میں کی ''ایک کار خریدنے کی غلطی کر لی ہے اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔''

پھر اپنا مسئلہ بتایا اور محکمانہ اعتراضات مگر انھوں نے بڑی خوش خلقی سے کہا: ''لیکن یہ تو ہمارا اپنے محکمے کا اندرونی معاملہ ہے۔ اس میں آپ کو کیوں تکلیف دی جارہی ہے۔''

انھوں نے پھر فوراً اپنے ایک ماتحت افسر کو فون پر حکم دیا اور کہا: ''ان صاحب کا کام کر کے مجھے رپورٹ دیں۔''

ماتحت افسر نے متعلقہ افسر کو فون پر پیغام دیا اور ہمیں پھر پہلے والے صاحب کی جانب بھیج دیا۔ انھوں نے مجھے تو اپنے پاس بٹھایا اور کہا، آپ کا بیٹا جا کر یہ کام کروا لائے گا اور اس کے ساتھ دفتر کے ایک اہلکار کو مع فائل کے ساتھ کر دیا۔ اب جن کے پاس بیٹا پہنچا تو اس نے ان کا رویہ بڑا معاندانہ پایا۔ یہی ''تمھاری ہمت کیسے ہوئی؟'' حالانکہ میرے صاحبزادے امریکا پلٹ گزیٹڈ آفیسر تھے۔ اور ان سے برتر گریڈ میں سروس کر رہے تھے۔

پہلے تو انھوں نے فون پر بیٹے کو بھجوانے والے صاحب سے تکا فضیحتی کی اور پھر میرے بیٹے سے پوچھا۔

''تم کمشنر صاحب تک کیسے پہنچ گئے؟''

اس نے کہا۔ ''وقت لے کر۔''

جب خود کو لاجواب پایا تو پوچھا: ''پہلے تو کوئی اور آیا تھا۔''

اس نے کہا: ''جی ہاں، وہ میرا چھوٹا بھائی تھا لیکن اس نے تو بتایا تھا کہ آپ کا رویہ تو بڑا ہمدردانہ تھا۔''

اس پر سوال کیا: ''تو وہ اب کیوں نہیں آیا؟''

بتایا۔ ''اسی تگ و دو میں اس کی چھٹی ختم ہو گئی۔ اور وہ اپنی ڈیوٹی پر واپس لوٹ گیا ہے۔''

تنک کر کہا: ''ایک ٹیکس گزار اپنی فائل اُٹھائے ایک دفتر سے دوسرے دفتر...... دفتری بے ضابطگی کا کیوں مرتکب ہوا ہے؟''

بیٹے نے بتایا: ''فائل مَیں نہیں بلکہ میرے ساتھ آنے والا آپ کے محکمے کا آدمی لایا تھا۔'' جب خود کو قطعی لاجواب پایا تو ایک اور لاجواب جواب دیا: ''چونکہ یہ سال کا آخری

مہینہ ہے جس کے بارے میں محکمے کے بڑے واضح احکامات ہیں۔ اس لیے فائل ایک دفتر سے دوسرے دفتر منتقل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم نے اس معاملے میں بے بس ہیں۔'' اور اسے پھر سے خانۂ اوّل کی طرف لوٹا دیا۔

خیر صاحب اوّل نے حجت پوری کر لینے کے بعد یہی بہتر جانا کہ تعلقات کو نبھایا جائے اور اگلے روز آنے کے لیے کہا۔ سو اگلے روز انھوں نے کام کر دیا۔ یوں چائے پانی کے خرچے سے بچ گئے بلکہ پانی بھی ان کے کولر سے پیا لیکن اب ایک صاحب کا کہنا تھا کہ آپ کو تو اس سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ یہ کار ضابطے کے اس زمرے میں ہی نہیں آتی تھی۔ لیکن ہمارے علم اور تجربے میں اضافہ تو ہوا اور شاید ہماری داستانِ غم پڑھنے کے بعد بہتوں کا بھلا ہوگا۔

اب مرحلہ آیا کار کی اصل رجسٹریشن کا کہ جہاں سے کار نمبر ملنا تھا۔ اس کے لیے محکمہ ایکسائز ٹیکسیشن کا کواڑ کھٹکھٹانا تھا۔ وہاں گئے۔ کہا گیا، فارم بھرو۔ اسٹیٹ بینک میں مقررہ فیس جمع کرواؤ۔ وہ کام بھی ایک دوست کے توسط سے جلد ہو گیا۔ ایسے لمحے دل کو تسلی ہوئی کہ یہ بھی کتنی اچھی بات ہے کہیں نہ کہیں مہربان، قدردان مل جاتا ہے۔ یوں کام پہیے لگائے بغیر ہو جاتا ہے لیکن اگر بیساکھیوں کا سہارا لینا ہی پڑ جائے تو جس معذوری کا احساس ہے، اسے کیونکر بیان کیا جائے؟ بس صرف یہی خیال آتا ہے کہ ہم سڑک کی غلط جانب کیوں پیدا ہوئے؟ کہ ابھی تک اسے پار کرنے کے لیے منتظر کھڑے ہیں۔

بہرحال اس دفتر میں بھی ایک پرانے کرم فرما تک پہنچے تاکہ مزید تردّد نہ ہو۔ انھوں نے کہا: ''آپ میرے دفتر میں بیٹھیں۔ آپ کا بیٹا نچلی منزل پر جا کے کام کروا لے گا۔ میں فون کیے دیتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد برخوردار منہ لٹکائے واپس آ گئے۔ بتایا اس دفتر والوں نے تو کاغذات لینے سے انکار کر دیا۔ ان کرم

فرما نے پھر فون کیا تو جواب ملا، جناب فکر کیوں کرتے ہیں؟ میں ان کے لیے ایک عمدہ (نوٹ کیجیے گا) نمبر تلاش کر رہا ہوں، کل آ جائیں اور ایک اچھا سا نمبر لے جائیں۔ (ضروری نہیں کہ اس پر انعام نکل آئے۔)

دوسرے روز گئے تو بتایا، آج ہڑتال ہے، اگلے روز آئیں۔

اسی دوران دوسرے بیٹے کی بھی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ بھی اپنے مقام تعیناتی کو سدھارے۔ یوں اب تمام تر ذمہ داری اپنے شانۂ ناتواں پر آن پڑی۔

تیسرے دن بہ نفس نفیس گئے تو یقین جانیے، دیکھا کہ دو تین حضرات اس دفتر سے بلا مبالغہ نعرے لگاتے برآمد ہو رہے تھے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ انھیں ان کا گوہر مقصود یعنی پسندیدہ نمبر مل گیا ہے۔ اس متوقع خوشی کے ساتھ ہم بھی چک اُٹھا کے ''داخل مے خانہ'' ہو گئے۔ ان صاحب نے ہماری عرضداشت سننے کے بعد ہمارے سامنے (خدا جھوٹ نہ بلوائے) اسکول کے بچوں کی ایک بوسیدہ سی رف کاپی کے مماثل نوٹ بک رکھ دی اور کہا، جو بلینک نمبر ہیں، ان میں سے کوئی ایک چن لیں۔

جب دسترخوان کے ان ٹکڑوں میں نوالۂ مطلوب تلاش کرنے کی کوشش کی تو اردگرد موجود حضرات نے بلاتکلف ہمدردانہ مشوروں سے نوازنا شروع کر دیا: یہ نمبر اچھا ہے۔ نہیں یہ اس سے بہتر ہے۔ نہ نہ ناں۔ اس نمبر کا جواب نہیں۔ قسمت والا نمبر ہے۔ گویا کار کا نمبر نہ ہوا، پرائز بانڈ کا انعام نکلنے والا نمبر ہو گیا۔ خیر نگاہِ انتخاب ایک نمبر پر پڑی تو متعلقہ حضرت

(اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے) نے کہا۔ یہ چن لیجیے۔ اس کے پیچھے میں نے نمبر لکھ دیا ہے۔ پندرہ دن بعد آکر رجسٹریشن بک لے جائیے۔ اب ضبطگیٔ کار کے خوف سے بچنے کے لیے کار کی نمبر پلیٹ لکھوا کر ''اپلائیڈ فار'' کا کارڈ غرق دریا کیا اور قدرے زیادہ طمانیت سے گھومنے پھرنے لگے لیکن دھڑکا ہی لگا رہا کہ ضابطے کی کارروائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ادھر اس پولیس آفیسر نے ہمارا لائسنس بھی ضبط کر رکھا تھا، انھوں نے کہا تھا۔ مجھے فون پر اطلاع دینا، لائسنس دوپہر سے پہلے واپس ہو جائے گا۔ لیکن ان کے فون پر جواب ندارد رہا اور نہ ہی کبھی رابطہ ہو سکا۔ آخر عدالت میں جرمانے کی ادائیگی کے بعد لائسنس واپس ملا مگر ابھی تک رجسٹریشن کی کتاب کے بجائے کاغذ کے ایک ورق کو بطور اتھارٹی لیے پھر رہے تھے۔ شکر ہے۔ ''اوپر سے حکم'' والے صاحب سے دوبارہ ٹاکرا نہیں ہوا۔

پندرہ دن بعد دوبارہ بلکہ سہ بارہ ایکسائز کے دفتر سے رجوع کیا۔ کہا گیا، پندرہ دن مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں؟ یہ سوال کرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ محکمانہ راز تھا۔

آخر وہ پندھرواڑہ بھی طوعاً و کرہاً برداشت کیا مگر ''دلی ہنوز دور است'' تھی۔ بھئی اب کیا ہوا؟ جا کر ملے تو متعلقہ حضرت نے فرمایا:

''معاف کرنا'' پتا نہیں کہا تھا کہ نہیں لیکن میں نے التزاماً لکھ دیا ہے۔ وہ نمبر جو ہم نے آپ کو الاٹ کیا تھا، وہ تو ایک موٹر سائیکل والا لے گیا۔ اب تک یہی سنا تھا کہ موٹر سائیکل والے خصوصی نوعیت کی وارداتیں کرنے کے ماہر ہیں۔ اب ہمارے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ وہ دوسروں کے نمبر بھی لے بھاگتے ہیں۔ خیر صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا: ''پھر اب کیا کیا جائے؟''

''نیا نمبر تلاش کر لیں۔ اسی (رف) کاپی میں ہے۔

یہ صورت حال جان کر لمحہ بھر کو تو اپنے فرشتے کوچ کر گئے۔ گویا ہم ایک ایسے جرم کی سزا بھگتنے کو تھے جو کیا کسی اور نے تھا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کرے عیسیٰ بھرے موسیٰ۔

گویا بالفرض محال ہم اپنی چار پہیے والی گاڑی اور دوسرے صاحب اپنی دو پہیے والی گاڑی پر، ایک جیسے نمبروں کے ساتھ اچانک سامنے آ جاتے اور ''اوپر سے حکم پانے والے صاحب'' پکڑ لو، ضبط کر لو کے نعرے کے ساتھ کارروائی ڈال کر ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھتے تو کیا ہوتا؟ اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے، بیان کرنے کی تاب نہیں۔

خیر نیا نمبر چُنا۔ اب ذرا رعایت کے ساتھ آٹھ دس روز میں آنے کے لیے کہا گیا۔ اس دوران ہم دست بدعا رہے کہ یہ نمبر لے کر کوئی اور نہ مفرور ہو جائے۔ اس دفعہ گئے تو حسب وعدہ بُک مل گئی۔ دل میں شکرانے کے نفل ادا کیے۔

لیکن جب کتاب کی ورق گردانی کی تو یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ کتاب کے چھ صفحوں پر تو نیا عطا کردہ نمبر لکھا تھا۔ ساتویں صفحے پر وہی پرانا موٹر سائیکل کا نمبر درج دکھائی دیا۔ تصحیح کے لیے ایک بار پھر دوڑ لگانی پڑی۔ چونکہ اب کی بار صریحاً ان کی غلطی تھی جسے تسلیم کیے بغیر سر تسلیم خم کیا۔ اور اسے قلم زد کر کے اصلی نمبر لکھ دیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ داستان تمام ہوئی۔ نہیں جناب، یہ ہمارا ملک ہے۔ یہاں ہر موڑ پر ایک نیا مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا ہوتا ہے۔ ہم نے ایک سانس پتا نہیں خوشی کا یا طمانیت کا لیا کہ چلو ہم رجسٹریشن بک والے تو ہوئے لیکن کون جانتا تھا کہ 'مس' فارچون Mis-Fortune ہمارے پیچھے اپنا ڈوپٹا دانتوں میں دبائے ہنس رہی تھی۔ ایک مرحلہ...... بظاہر آخری مرحلہ رہ گیا تھا کہ اب کتاب کو ساتھ لے جا کر ڈاکخانے میں اس کو پانے کی رپٹ درج کروائی جائے تاکہ سڑک پر چلنے کا جرمانہ بشکل روڈ ٹیکس ادا کیا جائے۔

پس جب وہاں پہنچے تو حسب روایت ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز لیکن پھر بھی بندہ نواز آگے بڑھ رہے تھے اور ہماری کتاب انتظار گاہ میں نگاہ کرم کی منتظر تھی۔ ایک آدھ بار چھوٹا موٹا احتجاج بھی کیا تو جواب ملا، دیکھیے، آپ ہی کا تو کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارا کام حبس اور گرمی سے ناتمام ہو رہا تھا۔ ایک آدھ جان پہچان والے مہربان نے اپنی باری کی جگہ دے کر ہمیں آگے ہونے کے لیے کہا بھی لیکن روایتی رواداری آڑے آ گئی۔ بالآخر ہماری باری آ ہی گئی۔

کاغذات کا پہلے تو بنظر غائر مطالعہ کیا گیا۔ کرنا بھی چاہیے تھا کیونکہ یہ ان کے فرائض میں شامل تھا۔ پھر بڑے حاکمانہ انداز میں گویا ہوئے: ''آپ یہاں کیوں آئے؟''

جواب میں کہا: ''جس کے لیے یہ سب ہم سے آگے ہو گزرنے والے اور ہمارے پیچھے کھڑے لوگ آئے ہیں۔''

ہمارے جواب کے لفظ لفظ سے تلخی ٹپک رہی تھی مگر پلڑا ان کا بھاری تھا۔ پھر بھی جواب غیر متوقع تھا۔

بولے: ''آپ کا کام نہیں ہو سکتا۔''

لمحے بھر کو تو فلمی سکتہ ہو گیا، ایسے ہی جیسے آخری وقت پر فلموں میں کوئی بڑھک مارتا آتا ہے: ''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔''

اپنی بھرّائی آواز کو ممکنہ حد تک خوشگواری میں تبدیل کرتے ہوئے پوچھا: ''لیکن کیوں؟''

بولے: ''کوئی ایک ہو تو بتائی جائے۔''

''پھر بھی۔''

تو کہا: ''دل تھام کر سنیے۔ (پتا نہیں انھوں نے کیسے جان لیا کہ یہاں بھی معاملہ دل کا ہے) سب سے پہلے تو یہ کہ رجسٹریشن بک ملنے کے پندرہ دن کے اندر اندر آپ کو اسے متعلقہ ڈاکخانے میں درج کروانا ہوتا ہے تو جناب وہ تاریخ گزر چکی۔ دوسرے یہ کہ اب جب تک آپ متعلقہ افسر سے دوبارہ تاریخ بدلوا کر نہیں لائیں گے اگلی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ تیسرے...... ابھی تیسری وجہ رہنے دیں۔''

اس پر سب سے پہلے ہم نے تاریخوں کی تاخیر کی وجوہ بتائیں اور یہ کہ اس میں قطعی ہمارا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی متعلقہ آفیسر سے دستخط کروا کے لا دیں گے۔ آپ یہ بتائیے، پھر بھی کام ہو گا کہ نہیں؟

کہنے لگے: ''نہیں۔''

ہمارا تڑپنا جائز تھا۔ اس کے باوجود بڑے تحمل سے پوچھا: ''وہ کیوں؟''

بولے: ''یہ آپ کا متعلقہ ڈاکخانہ نہیں۔ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں۔ اس مقام کے ڈاکخانے میں جائیے۔''

پوچھا: ''اور سالانہ تجدید کے لیے؟''

جواب ملا: ''وہ بھی وہیں۔''

پھر پوچھا: ''بفرض محال اگر ہمارا تبادلہ کوئٹہ ہو جائے تو اس صورت میں بھی پرانے ڈاکخانے جانا ہو گا؟ یہ تو ایک بہت مشکل کام ہے۔''

اس پر بولے: ''جانب عالی! یہ آپ کی دردسری ہے، ہماری نہیں۔'' پھر پکارا: "Next" اور ہم سے کہا: ''آپ براہ مہربانی راستہ دے دیجیے اور پچھلے صاحب کو آنے دیجیے ورنہ وہ اعتراض کرنے لگیں گے۔''

نکلے تو وہاں سے بڑی بدمزگی کے عالم میں لیکن اب دل میں یہ تہیہ کر کے کہ ان تمام قباحتوں کے باوجود رجسٹریشن یہیں کروانی ہے کیونکہ اسی میں ہمارے لیے سہولت تھی اور پھر یہ کہ ٹیکس بھی ادا کریں، ہر متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگوں کے نخرے بھی برداشت کریں تو یہ ہمارا مقدر ہے۔

آخر میں حسب منشا کام ہوا۔ بالآخر رجسٹریشن بک مکمل ہو کر ملی۔ کس طرح؟ یہ بتانے بیٹھے تو داستان اور طویل ہو جائے گی۔ مختصراً ڈاک خانے والے ہمارے ایک عزیز کے کرایہ دار تھے اور یوں کام بن گیا، لیکن اکثر خیال آتا ہے کہ اگر مختلف مراحل پر کوئی دوست، مہربان، کسی روشن خیال کمشنر، عزیز، رشتے دار کی حمایت و ہمدردی نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ وہی ہوتا جو سب کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ ہر روز ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ کون جانے...... کب تک؟ ◆◆◆

ڈاکٹر محمود فیضانی

یہ 1938ء کا سال تھا جب مجھے گورنمنٹ پرائمری سکول چوبرجی کوارٹرز، لاہور میں داخلہ ملا۔ میں نے پرائمری تک یہیں تعلیم حاصل کی۔ حاجی فضل الٰہی عارف اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ہمیں بچپن میں ان کی صلاحیتوں کا کیا علم ہوتا، ہم لوگوں کو تو خاصے طویل عرصے بعد پتا چلا کہ وہ منشی فاضل ہیں اور بی اے بھی۔ وہ عین نوجوانی کے عالم میں فریضہ حج بھی ادا کر چکے تھے۔ ان کی خوبیوں اور علمی خدمات کا جب علم ہوا تو ان کا احترام دل میں جاگزیں ہوگیا۔

وہ 11 مارچ 1903ء کو پیدا ہوئے۔ تمام سرکاری ملازمت پرائمری سکول کی نذر کردی اور بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی زبان میں بہت دسترس رکھتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کے علمی جوہر کھلے تو علم کے جویا ان سے استفادہ کرنے لگے ورنہ

دُنیائے اردو کا درویش

ممتاز ماہر زبان دانی کا ذکرِ خیر جن کے علم سے قارئینِ اردو ڈائجسٹ بھی استفادہ کرتے رہے

پہلے تو وہ ان کو محض پرائمری سکول کا اُستاد ہی خیال کرتے رہے۔ ایچیسن کالج کے طلبہ و طالبات تک اردو اور فارسی زبان کے لیے ان سے استفادہ کرتے تھے۔

علمی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے ان کی کتب ہی کافی ہیں:

1) اردو کی لغت ’’فرہنگ کارواں‘‘: بڑی محنت سے ترتیب دی۔ اس کا تعارف پروفیسر سید وقار عظیم نے لکھا۔ اس میں ہر لفظ کے معنی، تذکیر و تانیث کے علاوہ ہر لفظ کے استعمال کے ضمن میں مستند شاعروں کے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔

2) ’’زبان دانی‘‘: یہ کتاب اُردو زبان کے متعلق ضروری اور مفید معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اس کی قدر افزائی معروف ادیبوں نے کی جن میں علامہ تاجور، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اختر اور حاجی لق لق شامل ہیں۔

اس سے مجھے نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا یہ قول یاد آتا ہے جو اُنھوں نے دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں فرمایا تھا۔ ’’اُردو کی جس قدر خدمت پنجاب اور دکن نے کی ہے اتنی یوپی نے نہیں کی۔‘‘

3) ’’تلمیحاتِ اقبال‘‘: اس میں علامہ اقبال کے کلام میں شامل تلمیحات کی وضاحت کی ہے تاکہ قارئین اس کلام کی گہرائی تک رسائی حاصل کر سکیں۔

4) ’’ادیب فارسی‘‘: یہ فارسی زبان کی مشق، ترجمہ، مضمون نویسی اور مفید ادبی معلومات کا ذخیرہ ہے۔

5) ’’گلزار تبسم‘‘: اس میں ادبی لطائف اکٹھے کیے گئے ہیں۔ اس کا تعارف مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی نے لکھا۔

6) ’’متاعِ اقبال‘‘: اس میں علامہ اقبال کے تمام کلام کو عنوانات کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے، مثلاً توحید، عشق رسولؐ، قرآن، نماز، وحدت الوجود، جہاد، عشق، جنوں، تقدیر وغیرہ۔

7) ’’اسلام احکام و مسائل‘‘: یہ اسلامی معلومات کے لیے حوالہ جاتی کتاب ہے۔ جن مسائل کے جزیات مختلف کتابوں اور مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں، انہیں یکجا کر دیا گیا تا کہ ایک مسئلے کے مختلف پہلو سامنے آ جائیں۔

8) ’’مثنوی ارمغان معراج‘‘: یہ ان کی شعری کاوش ہے۔ اس میں نبی کریمؐ کے واقعہ معراج کو منظوم کیا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور تصنیفات بھی ہیں جو ابھی طبع نہیں ہو سکیں۔

1) نسیم اللغات کی از سرنو ترتیب و ترمیم

2) اردو ڈائجسٹ میں اصلاح زبان کے سلسلے میں سالہا سال تک لکھتے رہے۔ الطاف حسن قریشی صاحب کی فرمائش پر یہ سارا ذخیرہ اکٹھا کر کے ترتیب دیا۔ لیکن اس کی ضخامت دیکھ کر قریشی صاحب نے اسے دو حصوں میں مرتب کرنے کی تجویز دی۔ وہ اسے دو حصوں میں ترتیب دے کر قریشی صاحب کے حوالے کر آئے۔ چند دن بعد حاجی فضل الٰہی صاحب انتقال کر گئے۔ یہ کتاب اب تک نہیں چھپ سکی۔

3) انسان کہاں: اس کے متعلق حاجی صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے لیکن انسان ان میں خال خال ہیں، پس جو خال خال ہیں ان کے خدوخال کی تعریف کے لیے میں نے قلم اُٹھایا تاکہ اُن کے کردار کے آئینے میں ہم اپنا کردار دیکھ سکیں۔ لکھتے ہیں کہ کتاب کا نام میں نے جگر مرادآبادی کے اس شعر سے لیا ہے:

ہر چند کائنات دو عالم میں اے جگر
انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

PAKISTANIPOINT.COM

اس کتاب میں انسانی عظمت کے جتنے نمونے پیش کیے ہیں، اُنہیں سامنے رکھ کر اپنے گردو پیش نظر دوڑائیں۔ اگر واقعی کوئی انسان نظر آئے تو غنیمت ہے۔

4) ایک مسودہ: درس و مطالعے کی اہم یادداشتیں۔ یہ غالباً ان کی مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا غلام مرشدؒ کے درسوں میں بیٹھنے کا ثمر ہے۔ اس مسودہ میں اُنہوں نے اختلاف تفاسیر، قصص انبیاءؑ اور مضامین قرآن کے خلاصے پیش کیے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی وہ بہت سے مسودات چھوڑ گئے ہیں۔ وہ مختلف رسائل میں بھی مضامین اور نظمیں 1934ء سے بھجواتے رہے۔

حاجی صاحب خاصے کم گو تھے۔ وہ بولتے کم اور لکھتے زیادہ تھے۔ ان کی ایک نظم ''وارداتِ دل'' کے یہ اشعار اس عادت کا اظہار ہیں:

جب بھی ہوتا ہے خیالاتِ پریشاں کا ہجوم
کرتا ہوں باتیں قلم سے جو مرا دمساز ہے

بوجھ ہلکا دل کا کرتا ہوں بہ امدادِ قلم
میرے اشکِ غم کا کچھ معلوم اس کو راز ہے

ان کے اوقات کار کی تقسیم میں نیکی کا وقت عام لوگوں سے بہت زیادہ رہا۔ تمام زندگی رزقِ کے حصول کے لیے محنت کی۔ نوخیز طالب علموں کو بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے پرائمری کی تعلیم کے دوران ان کے ہاتھ سے کسی لڑکے کو پٹتے نہیں دیکھا، شاید دوسرے اساتذہ یہ کمی پوری کر دیتے ہوں گے۔

عین جوانی میں حج کیا جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا۔ کبھی اس کا اظہار کیا نہ اپنے نام کے ساتھ حاجی کا لاحقہ استعمال کیا۔ ان کے شب و روز نہایت سادگی اور قناعت سے گذرتے۔ نماز باجماعت کے پابند تھے۔ تہجد پڑھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ نماز کے بعد درس قرآن میں شامل ہوتے۔ پھر گھر آ کر جس قدر قرآن یاد تھا، وہ تلاوت کرتے۔

اردو و فارسی کے علاوہ عربی میں بھی وافر استعداد تھی۔ سعودی عرب میں مقیم ایک عزیز کے ساتھ عربی میں خط کتابت کیا کرتے۔ سنجیدہ ہونے کے باوجود شستہ مذاق پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ عیدالاضحیٰ کی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک دوست کو ملنے کے لیے اُس کے گھر پر دستک دی۔ پتا چلا کہ وہ خود بکرا ذبح کرنے میں مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلے تو خون آلود چھری ابھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ حاجی صاحب نے برجستہ یہ فقرہ چست کر دیا۔ "Caught red handed" (رنگے ہاتھوں پکڑے گئے)

حاجی صاحب کے لقب سے میں اُنہیں اس لیے یاد کر رہا ہوں کہ اپنے چند دیگر اساتذہ کے لیے میں استاد مکرم کا لقب استعمال کر چکا اور بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ وہ تمام عمر اپنے حج کا ذکر کرنے سے گریزاں رہے اور میں اپنی شوخی کی عادت کی وجہ سے اس کا مداوا کرنے پر مجبور ہوں۔

اُنہیں اس لحاظ سے بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی کہ اکثر لوگوں کا ذکر خیر ان کے مرنے کے بعد ہی کیا جاتا ہے لیکن حاجی صاحب موصوف زندگی بھر عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ اس کی وجہ ان کی چھوٹوں اور خاص طور پر اپنے شاگردوں پر شفقت اور بڑوں کا احترام تھی۔ بطور شاعر وہ معروف نہ ہوئے اور جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا وہ مشاعروں میں بھی حصہ نہ لیتے تھے۔

ان کی عادات میں ایک حسن اور باقاعدگی تھی۔

ہر کام میں وقت کی پابندی ملحوظ خاطر رکھتے۔ یہ عادت اُنہیں اپنے والد سے ملی تھی جن کے معمولات سے لوگ اپنی گھڑیوں کا وقت درست کیا کرتے۔ ہمیشہ صاف اور سادہ لباس پہننا۔ سر پر ٹوپی استعمال کرتے۔ طہارت اور صفائی کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ اگر بیت الخلا یا غسل خانہ صاف نہ ہوتا یا اس کی طہارت میں شک ہوتا تو اسے استعمال نہ کرتے۔ لاہور میں مکان کی تعمیر کے دوران ہم لوگ ان کے گھر بطور کرایہ دار چند ماہ مقیم رہے۔ گھر کی تعمیر سادہ ہونے کے باوجود اس طرح کی تھی کہ اسے صاف رکھنا آسان تھا۔

ان کا دینی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُنہوں نے مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا غلام مرشدؒ کے درس قرآن سے فیض پایا۔ صحابہ کرام کی سیرت سے اتنے متاثر تھے کہ اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھالنے کے لیے تمام عمر کوشاں رہے۔ ان کی عادات میں اس کا پرتو تھا۔ اخلاقی معیار اس قدر بلند رکھا کہ غصے کی حالت میں ان کو بہت کم دیکھا گیا۔ ان کی طبیعت صرف اُس وقت قدرے درشت ہو جاتی جب خلاف معمول کبھی نماز باجماعت سے محروم ہو جاتے۔

آخری عمر میں انہیں کچھ دُکھ بھی پہنچے لیکن صبر سے کام لیا اور کبھی یہ پسند نہ کیا کہ اپنے دُکھ کا حصہ دوسروں کے حوالے کر کے انہیں بھی مبتلائے غم کریں۔ لیکن آخر انسان ٹھہرے۔ دُکھ اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش چہرے کے آئینے میں اندرونی کرب کی تصویر نمایاں نظر آ جاتی۔

جھوٹ سے اس حد تک پرہیز کرتے تھے کہ جب کسی ملنے والے سے نہ ملنا چاہتے تو کبھی گھر کے کسی فرد سے یہ نہ کہلواتے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں، فرمایا کرتے کہ اپنی عدم موجودگی دوسروں کی زبانی ثابت کرنے سے یہ بہتر ہوگا کہ خود جا کر اپنی مصروفیت کا حال صاف صاف بیان کر دو اور اُس سے معذرت چاہ لو۔ اپنی اس روش سے وہ خود بھی جھوٹ سے بچ گئے بلکہ دوسروں کو بھی اس برائی سے بچا لیا۔

نمود و نمائش سے اُنہوں نے ہمیشہ اجتناب کیا۔ اگر وہ کسی محفل میں ہوتے اور نماز کا وقت ہو جاتا تو نہایت خاموشی سے وہاں سے کھسکے، نماز باجماعت ادا کی اور پھر سے مجلس میں آ شامل ہوئے۔ کسی کو یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ نماز پڑھنے گئے تھے۔ اعلانِ نماز سے دانستہ پہلوتہی کرتے کہ اس میں خودستائی کا پہلو ہوتا جو انہیں کبھی گوارا نہ ہوا۔

ان کی وفات کے بعد نظم و نثر کی ایسی ایسی معیاری چیزیں ان کے گھر سے دستیاب ہوئیں جن کا اُنہوں نے اپنی زندگی میں کسی کو علم ہی نہیں ہونے دیا۔ بے نیازی اور درویشی اسی کو کہتے ہیں کہ اتنے بے بہا خزانوں کا مالک ہو اور اپنے تئیں مفلس ہی ظاہر کرے۔

مارچ 1973ء شروع ہوا۔ وہ باجماعت نماز پڑھ کر گھر آئے۔ گھر میں ایک اونچی جگہ سے کوئی چیز نیچے اُتارنے کے لیے بانس کی سیڑھی لگائی۔ اوپر چڑھے تو گر پڑے۔ سر میں ایسی چوٹ آئی کہ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ ہسپتال لے جائے گئے۔ طبی عملے نے بہت کوشش کی لیکن ہوش میں نہ آ سکے۔ 4 مارچ 1973ء کو وفات پا گئے۔ ●●●

نہ کر.....

صدقہ دینے کے لیے مصیبت کا انتظار نہ کر۔
نعمتوں کا شکر ادا کرنے کو چھننے کا انتظار نہ کر۔
جس چیز سے تجھے مطلب نہ ہو، اس کی طرف توجہ نہ دے۔
جانے والی چیز کا غم نہ کر۔

پانچ میل دُور!

اشفاق احمد

محبت کی دھیمی آگ میں سُلگتا دلآویز فسانہ، البیلے کہانی کار کے رومانوی قلم سے

طاہر کو کارڈ ملے کوئی ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے سیکڑوں مرتبہ پڑھا تھا۔ ہر وقت جیب میں پڑے رہنے سے اس میں بیسیوں شکنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دفتر کے بڑے بڑے کہنہ رجسٹروں میں شرح پیدائش و اموات کی خانہ پُری کرتے ہوئے اس نے اکثر کارڈ کو بڑے آرام سے نکال کر پڑھا تھا اور بے خیالی میں ہر بار روشنائی کے دو تین دھبے اس پر گرا پھر جیب میں ڈال لیا تھا۔ آج بھی یہی کارڈ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اس پر سیاہی کے دھبے اور تیل کے داغ تعداد میں حروف سے بازی لے گئے تھے۔

شور مچاتی، سڑک چاٹتی ہوئی بس پہاڑیوں پر چڑھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس نے کیڈیٹ اجمل کی عمر کا جھوٹا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے جو دس روپے کی رشوت لی، وہ جائز تھی یا ناجائز؟ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بس رکوا کر اتر جائے اور اپنے شہر جا کر میونسپلٹی کے سیکرٹری سے کہہ دے کہ میں نے دس روپے رشوت لے کر جھوٹا سرٹیفکیٹ بنایا تھا۔ میرے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو دیگر رشوت لینے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

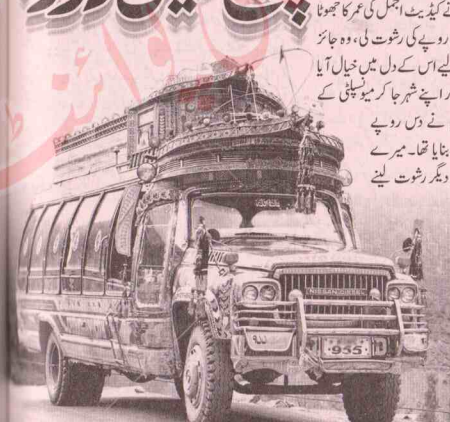

فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو یہ سمجھا کر تسلی دے لی کہ یہ میری پہلی اور آخری رشوت ہی تو ہے۔ اس کے بعد نہ ایسا کارڈ آئے گا نہ میں ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا۔ پھر میں یہ دس روپے تنخواہ ملتے ہی غریبوں میں تقسیم بھی تو کر دوں گا۔ کیا ہوا جو میں نے ایک امیرزادے سے چند روپے لے کر اس کا کام کر دیا۔ میں نے خود تو نہیں مانگے تھے۔ اس نے آپ ہی آپ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ طاہر نے بانی کے کارڈ پر آخری نگاہ ڈالی اور پھر اسے اپنی اچکن کی جیب میں ڈال لیا جس میں ایک روپے والے پانچ نوٹ پڑے تھے۔

غل مچاتی بس مری کی اُونچی پہاڑیاں چڑھ رہی تھی۔ گہری سرسبز وادیوں میں سفید دھوئیں جیسے بادل اِدھر اُدھر بے مقصد تیر رہے تھے۔ طاہر نے ایک نظر ننھے منے صنوبروں والی عمیق وادی پر ڈالی اور پھر سامنے کے شیشے میں سے بل کھاتی کروٹیں بدلتی سرمئی سڑک کو دیکھنے لگا جو چند گزوں کے فاصلے پر کسی پہاڑی کے قدموں سے لپٹ کر ختم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ مری سے صرف پانچ میل دور رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ڈرائنگ روم کے دروازے کو انگلی سے بجایا اور کندھے پر پڑے کمبل کو ٹھیک کر کے انتظار کرنے لگا۔

بانی نے آ کر پوچھا: ''کون ہے؟''

''میں ہوں۔ طاہر۔'' اور اس کی آواز حلق میں ویزلین کے ملغوبے کی طرح جم گئی۔

بانی دروازہ کھولے بغیر نعیم کو آوازیں دینے لگی۔

''اِدھر آؤ نعیم۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ابا جان کو پوچھنے آیا ہے۔''

اور جب نعیم نے دروازہ کھولا تو وہ خوشی سے چلا اٹھی: ''یہ تو طاہر بھائی ہیں۔ میرے طاہر بھیا۔'' اور وہ طاہر کو یونہی حیران و پریشان دروازے میں چھوڑ امی امی پکارتی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ بانی دروازے کی اوٹ میں چھپی رہی۔ اس نے جھری میں سے طاہر کو دیکھا۔ وہ پہلے سے دبلا دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر اب وہ لڑکوں والی بات نہ رہی تھی۔ آنکھوں کی شرارت بھری چمک دھندلا سی گئی تھی۔ چہرے پر خط کا نشان گہرا سرمئی ہو گیا تھا اور ماتھے پر ایک دو نئی سلوٹوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

سامنے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہوئے خالہ ننگے پاؤں ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بولیں:

''یہاں مہمانوں کی طرح کیوں ٹھٹھک گئے۔ اندر آؤ۔ اب خالہ سے بھی شرمانے لگے ہو۔'' انھوں نے آگے بڑھ کر طاہر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''نعیم، بھائی کا بیگ تو ہاتھ سے لے لو۔ تمھیں تو بس تالیاں بجانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔''

جب وہ دوسرے کمرے میں پلنگ پر بڑے تکلف سے بیٹھ کر چھالیا کترتی خالہ سے باتیں کرنے لگا تو بانی دروازے کی اوٹ سے کھسک کر غسلخانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ چینی کے بیسن میں پانی کی دھار شور مچاتی گر رہی تھی۔ اس میں چوڑیاں بجنے کی مدھم جھنکار سنائی دیتی تھی۔

بس ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور طاہر نے چونک کر ڈرائیور سے پوچھا: ''بس ٹھہر کیوں گئی؟''

''ریڈیئیٹر کھول رہا ہے۔'' ڈرائیور نے سٹیئرنگ پر ماتھا رکھتے ہوئے کہا: ''چشمے کا ٹھنڈا پانی ڈال لیں تو پھر چلتے ہیں۔'' پھر اس نے کلینر کو پکار کر کہا: ''جلدی کر علیہ جلدی! پہلے ہی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔''

ریڈیئیٹر شدت سے کھول رہا تھا۔ اس میں سے گرتے پانی اور چوڑیوں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ طاہر نے کھلے ڈھکنے سے بھاپ کے دودھیا دھوئیں کو باہر نکلتے دیکھ کر کہا:

''ہاں خالہ اماں! آپ لوگوں سے کچھ ناراض ہی ہیں۔ انھیں ہر گھڑی یہی شکوہ رہتا ہے کہ آپ انھیں بالکل بھول گئی ہیں اور وہ یہ شکایت کرنے میں کسی قدر حق بجانب بھی ہیں۔ آپ لوگ ڈھاکے میں تین سال رہے اور اس مدت میں ہمیں صرف دو خط لکھے۔ اگر میں بھی خالو جان کی طرح کوئی بڑا افسر ہوتا تو یوں ہوتا کیا؟''

اگر مصیبت آجائے تو......!

سلطان محمود غزنوی کے پاس کوئی شخص ککڑی لے کر حاضر ہوا۔ سلطان نے ککڑی قبول فرمائی اور پیش کرنے والے کو انعام دیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے ککڑی کی ایک پھانک کاٹ کر ایاز کو عطا فرمائی۔ ایاز مزے لے لے کر وہ تمام پھانک کھا گیا۔ پھر سلطان نے دوسری پھانک کاٹی اور خود کھانے لگا۔ وہ اتنی کڑوی تھی کہ زبان پر رکھنا مشکل تھا۔ سلطان نے حیرت سے ایاز کی طرف دیکھا اور فرمایا:

’’ایاز اتنی کڑوی تو کیسے کھا گیا کہ تیرے چہرے پر ناگواری کے ذرہ بھر اثرات نمودار نہ ہوئے۔‘‘

ایاز نے عرض کیا: ’’حضور ککڑی واقعی بہت کڑوی تھی۔ منہ میں ڈالی تو عقل نے کہا کہ تھوک دے مگر دل نے کہا، ایاز خبردار! یہ وہی ہاتھ ہیں جن سے روزانہ میٹھی اشیا کھاتا رہا ہے۔ اگر ایک دن کڑوی چیز ملے گی تو کیا تھوک دے گا، اس لیے کھا گیا۔‘‘

یہی مسلمان کی شان ہونی چاہیے کہ جس اللہ نے انسان پر لاتعداد احسانات فرمائے، اگر کبھی اس کی طرف سے کوئی مصیبت آجائے تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کرلے۔

یہ بات سن کر خالہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ انھوں نے جواب دینے کے بجائے ایک دو موٹے قطرے کٹی ہوئی چھالیا میں گرا دینے زیادہ مناسب سمجھے۔ طاہر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: ’’اماں تو میرے ساتھ آرہی تھیں۔ لیکن میں نے سوچا یہاں سردی ہوگی اور موسم کا اچانک تغیر ان کی صحت پر برا اثر ڈالے گا۔ اس لیے ساتھ نہ لایا اور نہ وہ تیار تھیں۔‘‘

’’بہت برا کیا تم نے۔‘‘ خالہ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا: ’’ایک دو دن میں کیا ہو جاتا اور پھر یہاں کوئی ایسی خاص سردی بھی تو نہیں کہ بی بی برداشت نہ کرسکتیں۔ تم نے انھیں ساتھ نہ لاکر بڑی زیادتی کی ہے۔‘‘

جب نعیم نے کمرے میں آکر طاہر بھائی کے بیگ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تو طاہر نے جی ہی جی میں کہا: ’’واقعی میں نے نعیم کے لیے چاکلیٹ اور ٹافی نہ لاکر بڑی زیادتی کی ہے۔ اب میں پہلے جیسا طالب علم تو نہیں رہا۔ میونسپل کمیٹی کا اسی روپے ماہوار پانے والا معزز عہدیدار ہوں۔ واقعی میں نے بہت برا کیا۔ خالی ہاتھ ان کے گھر آ گیا۔‘‘

ڈرائیور نے کہا: ’’یہ لوگ بڑی زیادتیاں کرتے ہیں۔ موٹر پاس کرنے کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں چھوڑتے اگر میں ایک دم بریکیں نہ باندھ دیتا تو لاری کھڈے میں اتر جاتی۔‘‘

طاہر نے کہا: ’’ایسی زیادتیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔‘‘ اور پھر سوچا، لیکن اگر میں اُس کیڈٹ سے دس کے بجائے پندرہ روپے لے لیتا تو ایسی زیادتی کبھی نہ ہوتی۔ پانچ روپے میں تو کافی چاکلیٹ آجاتی ہے۔

اور جب خالہ کمرے سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں تو بانی نے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر ٹھٹک گئی۔ طاہر نے اپنی نئی چپل کا بکل کھولتے ہوئے جھک کر اُسے پردوں کی اوٹ میں سے دیکھا اور اس کا دل الٹ کر جیسے حلق میں آ

پھنسا۔ بانی ہمت کر کے اندر چلی آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو کر بولی: ’’اب آ گئے بڑے صاحب بن کر۔‘‘

طاہر نے خفت مٹانے کی خاطر پوچھا: ’’کیوں؟‘‘

’’ہم ڈھاکا میں اتنا عرصہ رہے مگر آپ نے ایک خط بھی لکھا؟‘‘

’’خط......خط......‘‘ اس نے سوچتے ہوئے کہا: ’’لیکن تم نے کون ساڈاک کا تانتا باندھ دیا تھا۔‘‘

’’آخر میں نے ہی کراچی سے چلتے چلتے آپ کو مری آنے کا کارڈ لکھا نا۔‘‘

’’کارڈ کا کیا ہے، آخر یہاں تو میں ہی پہنچا...... اچھا بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟‘‘

’’میں کیوں بلانے لگی۔ میں نے تو اتنا لکھا تھا کہ ہم مری جا رہے ہیں۔ غیر معینہ عرصے تک وہیں رہیں گے۔ آپ کو کس نے دعوت دی۔‘‘

طاہر نے چٹکی بجا کر جواب دیا: ’’دعوت نہیں دی تو ہم لوٹ جاتے ہیں۔ پلٹنے میں کونسی دیر لگتی ہے۔‘‘

اتنے میں خالہ پھر اندر آگئیں۔ انھوں نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا:

’’بانی نے اچھی خاصی بنگالی سیکھ لی ہے۔ اس نے وہاں بہت سی بنگالی لڑکیاں سہیلیاں بنالی تھیں اور اب تو یہ انھیں خط بھی بنگالی میں لکھنے لگی ہے۔‘‘

’’کمال ہے۔‘‘ طاہر نے جھوٹ موٹ کی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا:

’’ہم تو چودہ سال تک انگریزی کے پیچھے لٹھ لیے پھرا کیے مگر آج تک ایک لفظ بھی اٹھانا نہ آیا۔ بانی نے کمال کیا ہے جو تین سال میں بنگالی لکھنا شروع کردی۔‘‘

بانی نے خالہ کی طرف منہ موڑ کر کہا: ’’امی بھی کے دماغ ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ذرا کند ذہن ہوتا ہے۔ کسی کسی کو اللہ میاں ذہین بنا دیتا ہے۔‘‘ اس نے چور آنکھوں سے طاہر کو دیکھا اور اپنی امی کے سامنے بھولا سا منہ بنا کر کھڑی ہوگئی۔

خالہ نے مسکرا کر کہا: ’’تم دونوں کی تو یونہی ٹھنی رہی اور خدا معلوم کب تک ایسے ہی ٹھنی رہے گی۔‘‘

ڈرائیور کہہ رہا تھا: ’’تینوں ٹرانسپورٹ کمپنیوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ ایک سال کا عرصہ ہوگیا ہے خدا جانے اور کب تک ایسے ہی ٹھنی رہے گی۔‘‘

طاہر نے گھبرا کر پوچھا: ’’ابھی مری کتنی دور ہے؟‘‘

’’بس آیا چاہتی ہے۔‘‘ ڈرائیور نے وقت دیکھا اور سگریٹ جلانے میں مشغول ہوگیا۔

اقوال زریں

☆ خوش قسمت ہے وہ انسان جو خوشی کو چھاؤں اور غم کو دھوپ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

☆ انسان کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح نرم ہونا چاہیے۔

☆ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور انسان کی قیمت اس کی خوبیاں ہیں۔

☆ موت ایک ایسا دروازہ ہے جس سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔

☆ زندگی میں وہ راہیں اپناؤ جن سے کچھ فائدہ حاصل کرو۔

☆ سوال کرو بے وقوف کی طرح اور سمجھو عقلمند کی طرح۔

☆ کبھی کوئی شکست ایسی بھی ہوتی ہے جس کے دامن میں فتح سے زیادہ کامیابیاں ہوتی ہیں۔

سڑک کے کنارے سبز رنگ کی ایک لمبی سی کار کھڑی تھی، اس کے باہر ایک صاحب، تین چار کلرک اور دفتر کی بے شمار فائلیں بغل میں دابے، سُرخ رنگ کی وردی والا ایک اردلی کھڑا تھا۔ طاہر کو سُرخ رنگ کی وردی دیکھ کر نصرت باجی کا بیاہ یاد آ گیا۔ جب وہ اسی رنگ کا جوڑا پہنے صوفے پر بڑے طمطراق سے بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس قالین پر لیٹے ہوئے ممتاز بھائی سگریٹ پی رہے تھے۔ باجی لال جوڑا پہنے بھی افسردہ دکھائی دیتی تھیں اور ممتاز بھائی ووسٹڈ کا سوٹ پہنے بھی اردلی لگتے تھے۔ اس ایک شادی کے ساتھ بہت سی شادیاں طاہر کے ذہن میں گھومنے لگیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ طاہر نے ریسیور اٹھایا تو بانی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی: ”جلدی گھر آیئے۔ ایک نہایت ضروری کام آن پڑا ہے۔“

”ایسا کیا کام آن پڑا ہے بانی۔ میں دفتر چھوڑ کر کیسے آؤں۔ مجھے ٹیلیفون ہی پر بتادو۔“

”ٹیلیفون پر بتانے کا ہوتا تو میں پہلے ہی نہ کہہ دیتی۔“ بانی نے روہانسی ہو کر کہا: ”گھر آیئے، نہیں تو میں......“

”نہیں تو میں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھئی میں گھر ہی آ رہا ہوں۔“ طاہر نے جلدی جلدی ٹیلیفون بند کیا اور اپنے چپڑاسی کو کھلی ہوئی فائلوں کا دھیان رکھنے کے لیے کہہ کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر گیا۔ اسٹاف کار پورچ میں موجود نہ تھی۔ اس نے گیٹ کیپر کو بھیج کر ایک ٹیکسی منگوائی اور گھر پہنچ گیا......

بانی سیاہ رنگ کے بڑے بڑے پھولوں والی قمیص پہنے بنگلے کے برآمدے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ طاہر کو اپنی طرف تیزی سے قدم اٹھاتے دیکھ کر ذرا مسکرائی اور اپنی قمیص کے پہلوؤں میں اسی رنگ کی لٹکتی ہوئی پیٹیاں اٹھا کر بولی:

”ذرا انھیں میری کمر کے پیچھے باندھ دیجیے۔“

طاہر نے ٹھٹک کر استعجابیہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پوچھا:

”مجھے دفتر سے کیوں بلایا تھا؟“

”اسی لیے بلایا تھا...... ماما کھانا پکا کر چلی گئی ہے۔ یہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں گرہ کس سے دلواتی؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

طاہر نے جھنجھلا کر کہا: ”میں حضور کا اردلی تو نہیں۔ ایک بڑے دفتر کا بڑا صاحب ہوں مجھے......“

بانی نے بات کاٹ کر کہا: ”صاحب تو صاحب ہی رہتے ہیں۔ گرہ دینے سے اردلی تو نہیں بن جاتے۔“

طاہر نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا: ”اچھا تو اب میں جا سکتا ہوں؟“

”شوق سے!“ بانی نے بڑے صاحبوں کی طرح کہا اور پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اندر چلی گئی۔

طاہر اپنے دفتر پہنچ کر ابھی کرسی پر ٹھیک سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس نے جھنجھلا کر ٹیلیفون پرے دھکیل دیا اور بولا:

”اب چاہے یہ گھنٹی جتنی دیر تک بجتی رہے میں ہرگز ریسیور نہ اُٹھاؤں گا۔“

☆☆☆

ڈرائیور نے چلا کر کہا: ”چاہے یہ گھنٹی رات تک بجاتے رہو میں موٹر کھڑی نہیں کروں گا۔“ کلینر نے پکارا: ”استاد سواری اترنی ہے، اس ذخیرے کے پاس۔“

”تو میں کیا کروں؟“ ڈرائیور نے الجھ کر کہا: ”مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ڈھلوان پر بس نہیں رک سکتی۔ پتا نہیں اس کی بریکیں خراب ہیں؟“

طاہر نے کہا: ”ٹھیک ہے ڈرائیور صاحب اب یہ بس مری جا کر ہی رکے گی۔ راستے میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔“

رات کو خالو جان نے طاہر سے اس کی موجودہ تنخواہ پوچھ کر کہا: ”میاں صاحبزادے تم نے میونسپلٹی کی نوکری کر کے

اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ اس میں عہدے کی ترقی ہے نہ تنخواہ کی اور آخری عمر میں پنشن سے بھی صاف جواب ہے۔ اس وقت تم نے میرا کہا نہ مانا۔ اگر میرے دفتر میں عرضی دے دیتے تو میں تمھیں ڈائریکٹ اسسٹنٹ رکھ لیتا...... اب سوچو کل کو خدانکردہ تمہاری اماں تمہاری شادی کے درپے ہو جائیں تو ان ہی روپوں میں اپنا، اپنی اماں اور اس بدبخت بیوی کا پیٹ کیسے پال سکو گے...... واقعی تم نے بڑی غلطی کی۔ میں تمھیں ڈائریکٹ اسسٹنٹ رکھ لیتا۔ یہ کمیٹی کی نوکری کر کے تو تم نے اپنا وقت ہی ضائع کیا۔“

خالہ نے طاہر کی جگہ جواب دیتے ہوئے کہا: ”کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ آپ ہی ترقی ہو جائے گی۔ ہاتھ آئی روزی چھوڑ کر دوسرے روزگار کی طرف بھاگنا کونسی عقلمندی ہے؟ اللہ ہی ترقی کر دے گا۔“

طاہر نے جھینپتے ہوئے کہا: ”ہاں جی اللہ بڑا کارساز ہے وہ اسی نوکری میں مرتبہ دے دے گا۔“

”سبحان اللہ“ خالو نے ہنستے ہوئے کہا: ”آپ بھی اپنی خالہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ میاں اگر اس خیال میں رہے تو کہ یہ نوکری کرتے کرتے تم ایک دن تحصیلدار بن جاؤ گے تو اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگے۔ اس مرتبہ کسی نے بھی ان کی ہنسی کا جواب نہ دیا۔

سونے سے پہلے جب طاہر دانت صاف کر رہا تھا تو بانی غسل خانے میں ہاتھ دھونے آئی۔ اس نے صابن کا جھاگ ہاتھوں سے لپیٹتے ہوئے کہا:

”آپ گھبرائیں نہیں۔ ابا جان کی باتوں پر نہ جائیں۔ وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن تم ابا جان سے بھی بڑے افسر بن جاؤ گے۔“

طاہر نے برش منہ سے نکال کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ بانی کی آنکھوں میں خلوص اور یقین کے اشارے اندھیاروں میں جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔

ڈرائیور بلند قامت کلینر سے کہہ رہا تھا: ”دیکھ لینا بچو آج دیر سے پہنچیں گے۔ جواب طلبی ہو گی، تو میں تمہارا نام لے دوں گا کہ جگہ جگہ رُکواتا آیا ہے۔“

کلینر نے پکار کر کہا: ”کوئی بات نہیں استاد میں منشی سے خود ہی نپٹ لوں گا۔“

پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر مری دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ سڑک کنارے ڈھلوان چھتوں والے بنگلے ایک دوسرے کے آگے پیچھے آ کر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ بڑی بڑی چٹانوں پر موٹے موٹے حروف میں ہوٹلوں کے اشتہار کندہ تھے۔ وادی کے سرسبز کھیتوں پر سفید سفید بادل تیر رہے تھے اور اُوپر سیاہ ابر چھایا ہوا تھا۔ بارش ابھی برس کر تھمی تھی لیکن سرد ہوا کے تیز جھونکوں سے درخت ابھی تک لرز رہے تھے۔ طاہر نے اچکن کے سارے بٹن بند کر لیے اور کمبل ٹھیک سے تہ کر کے گود میں ڈال لیا۔

کسی سواری نے التجا کرتے ہوئے کہا: ”ایک منٹ کے لیے یہاں نہیں روک سکتے۔“

ڈرائیور نے جواب دیا: ”اگلا موڑ مڑنے کے بعد اڈا آ رہا ہے۔ یہاں روک کر کیا لیں گے؟“

جب اگلا موڑ آیا تو ایک اور بس پاں! پاں! کرتی ان کے قریب سے گزری۔ طاہر نے دیکھا کہ اگلی سیٹ پر بانی، نعیم، خالہ اور خالو کمبل گھٹنوں پر ڈالے واپس جا رہے تھے۔

ڈرائیور نے پکار کر کہا: ”لو جی! آخری بس بھی نکل گئی۔“

طاہر نے گھبرا کر پوچھا: ”اب کوئی بس نیچے نہیں جائے گی؟“

”اوہوں۔“ ڈرائیور نے بے پروائی سے کہا: ”اب کل ملیں گے...... لیکن ٹیکسی جا سکتی ہے، سالم ٹیکسی۔ تیس روپے کی۔“ پھر وہ...... ’یہ زندگی کے میلے‘ گانے لگا۔ طاہر نے اپنی اچکن کی جیب سے پانچوں نوٹ اور کارڈ نکال کر مٹھی میں بھینچ لیے۔ بادل زور سے گرجا اور بارش ہونے لگی۔ ●●●

جگ بیتی

رانا محمد شاہد

بانیانِ پاکستان واقعات کے آئینے میں!

عظمتِ کردار اور شخصیت کا لطیف پہلو عیاں کرنے والی دلچسپ و سبق آموز یادیں

خوش مزاجی، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی انسان کی عظمت میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ لوگ جو لطیف طنز و مزاح اور ظرافت سے محفل کشتِ زعفراں بنا دیں یا اپنی باتوں سے لوگوں کو محظوظ کریں، محبوب شخصیات بن جاتے ہیں۔ بابائے قوم قائداعظمؒ اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی زندگی سے ایسے ہی دلچسپ و شگفتہ واقعات کا ذکر پیشِ خدمت ہے۔

شیر آئے تو......

1940ء میں مینارِ پاکستان کے موجودہ مقام پر قائداعظمؒ قوم سے خطاب فرما رہے تھے کہ اچانک پنڈال میں ہلچل محسوس ہوئی۔ قائداعظمؒ نے اس بابت دریافت کیا تو انھیں بتایا گیا کہ شیرِ بنگال تشریف لائے ہیں۔ قائداعظمؒ نے فرمایا:

''جب شیر آئے تو میمنے کو چپ ہو جانا چاہیے۔'' یہ کہہ کر کچھ لمحوں کے لیے تقریر میں وقفہ دیا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

جب شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کو کرسی پر بٹھا دیا گیا تو قائداعظمؒ پھر سے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''اب شیر کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے میمنا بول سکتا ہے۔'' اس کے بعد دوبارہ اپنی تقریر شروع کر دی۔ قائداعظمؒ کے اس انداز سے لوگ بے حد محظوظ ہوئے۔

پردے میں بٹھا دیا:

1945ء میں قائداعظمؒ بلوچستان آئے تو ایک تقریب میں کہا: ''تم لوگوں نے اسٹوڈنٹ فیڈریشن قائم کی ہے۔ نیشنل گارڈ بنائی ہے لیکن خواتین لیگ ابھی تک قائم نہیں کی۔ میں اس سلسلے میں مسلمان خواتین سے ملنا چاہتا ہوں۔''

قاضی محمد عیسیٰ نے فوری طور پر لیگی کارکنوں سے کہا کہ اپنے گھروں سے عورتوں اور بچیوں کو لے آؤ۔ انھوں نے اپنی بیٹھک سے میز کرسیاں ہٹوا دیں۔ یوں تیس، چالیس خواتین کے بیٹھنے کا انتظام ہو گیا۔ ایک کونے میں پردہ ڈال کر ایک کرسی قائداعظمؒ کے لیے رکھوا دی۔ قائداعظمؒ جب پردے کے پیچھے آ کر بیٹھ گئے تو کہا:

''میں آج کل ہندوستان میں جہاں بھی جاتا ہوں، مجھے کہا جاتا ہے کہ عورتوں کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے لیکن بلوچستان کے لوگوں نے تو مجھے ہی پردے میں بٹھا دیا۔''

ایک اچھے باورچی کی ضرورت:

ایک دفعہ قائداعظمؒ کشمیر گئے۔ وہاں کھانے کے دوران کشمیر کے ہندو راجا کا ذکر چھڑ گیا۔ ایک صاحب بولے:

''سنا ہے کشمیر کے مہاراجا کھانا بہت اچھا پکاتے ہیں۔''

یہ سن کر قائداعظمؒ نے مسکراتے ہوئے کہا: ''خیر انڈا تو میں بھی اُبال لیتا ہوں۔ ویسے اگر مہاراجا پسند کریں تو میں انھیں اپنے ساتھ ممبئی لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ ان دنوں مجھے ایک اچھے باورچی کی ضرورت ہے۔''

قائداعظمؒ کی اس بات پر محفل کشتِ زعفراں بن گئی۔

بہت زیادہ کھاتے ہیں:

محمود حسن ایک زمانے میں ہفت روزہ ''دکن ٹائمز'' کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں ''ڈان'' کے منیجر بھی رہے۔ وہ ایک دن قائداعظمؒ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ قائداعظمؒ نے حسبِ معمول بہت تھوڑا کھانا کھایا اور باقی وقت چھری اٹھا کر اپنے ناخنوں پر بجاتے رہے۔ ان کی اس عادت سے پرانے دوست بخوبی آگاہ تھے۔ محمود حسن، جو ابھی تک کھانا کھا رہے تھے، نے کچھ دقت محسوس کی اور قائداعظمؒ سے کہا۔ ''سر! آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔''

قائداعظمؒ نے کہا۔ ''یہ دُنیا والے اسی لیے دُکھوں میں مبتلا ہیں کہ بہت زیادہ کھاتے ہیں۔''

جیتا ہے، چھینا نہیں:

قائداعظمؒ ایک بار کھیل کے انعامات کی تقریب میں شریک تھے۔ ایک طالب علم انعام لینے کے بعد اتنا گھبرا گیا کہ قائداعظمؒ سے ہاتھ بھی نہ ملا سکا۔ قائداعظمؒ نے اسے نرمی اور شگفتگی سے واپس بلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لڑکے! تم بھاگ کیوں جا رہے ہو؟ مجھے یقین ہے، یہ انعام تم نے ہی جیتا

ہے، کسی سے چھینا نہیں۔"

یہ تو آدمی ہیں:

سیّد وحید الدین اپنی کتاب "روزگار فقیر" میں علامہ اقبالؒ کے حوالے سے ایک واقعہ لکھتے ہیں۔ "میرے ایک قریبی رشتے دار، سیّد ماجد علی کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں ان کے کتے بھی موجود تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جبکہ کتے موٹر میں ہی چھوڑ دیے۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کی ننھی بیٹی منیزہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی:

"اباجان! موٹر میں کتے آئے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "نہیں بیٹی! یہ تو آدمی ہیں۔"

نہاتے ہوئے سیاسی:

علامہ اقبالؒ کے ایک قریبی دوست چوہدری شہاب الدین کی رنگت سیاہ تھی۔ ایک مرتبہ غسل خانے میں نہا رہے تھے کہ اندر پڑی سیاہی کی دوات گر گئی اور یوں پانی سیاہ ہو کر نالی میں بہنے لگا۔ اتفاقاً علامہ اقبالؒ اسی وقت ملاقات کے لیے آئے۔ چوہدری صاحب نہا کر نکلے تو علامہؒ نے کہا۔

"اچھا تو آپ نہا رہے تھے۔ میں بھی حیران تھا کہ نالی میں پانی اس قدر سیاہ کیوں آ رہا ہے۔"

بیماری کی یاد میں:

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ بیمار ہو گئے۔ کچھ دن بعد بیماری سے کچھ افاقہ ہوا مگر مستقل ہائے، ہائے کرتے رہے۔ منشی طاہر الدین بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے دریافت کیا۔ "علامہ صاحب! خیر تو ہے۔" علامہ اقبالؒ کہنے لگے، "ہاں میں ذرا بیماری کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔"

ایک چھوٹے سے قصبے..... آکسفورڈ میں:

شملہ میں ہونے والی ایک کانفرنس میں مولانا محمد علی جوہر بھی شریک تھے۔ آپس میں گفتگو اُردو زبان میں ہو رہی تھی۔ کسی موضوع پر وہاں بحث شروع ہوئی اور اُلجھا پیدا ہو گیا۔ جوشِ خطابت میں مولانا انگریزی زبان میں دلائل دینے لگے اور اپنی باتوں سے سب کو لاجواب کر دیا۔ اس مجلس میں ایک ہندو رانی بھی موجود تھی۔ اس نے مخصوص وضع قطع والے ایک مولانا کو اتنی شستہ انگریزی بولتے سنا تو حیران رہ گئی۔ اس سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھی۔

"مولانا! آپ نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی؟" مولانا جواب دیا۔

"میں نے انگریزی ایک بہت ہی چھوٹے قصبے میں سیکھی ہے۔"

ہندو رانی نے استفسار کیا تو مولانا محمد علی جوہر نے شگفتگی سے کہا۔ "آکسفورڈ میں۔" اس پر تمام حاضر لوگ ہنس دیے۔

چادر کا مختاج:

مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ آپ رئیس زادے ہونے کے باوجود بچپن سے ہی قناعت پسند

تھے۔ ایک بار اوڑھنے کے لیے چادر کی ضرورت محسوس ہوئی مگر والد سے استدعا کرنے کی جرأت نہ تھی۔ چنانچہ زبانی فرمائش کرنے کے بجائے شعر موزوں کیا۔ اسے کاغذ پر لکھ کر قبلہ والد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ والد نے شعر پڑھا تو بہت خوش ہوئے۔ انھیں سینے سے لگایا اور چادر مہیا کرنے کا فوراً انتظام کر دیا۔ شعر تھا۔

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

اب نہیں جائے گا:

مشہور مصنف شوکت تھانوی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ نو عمری میں ہی انھوں نے شاعری شروع کر دی۔ ایک دفعہ کافی کوشش کے بعد وہ اپنی غزل رسالہ "ترجمانِ نظر" میں چھپوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس غزل کا ایک شعر کچھ یوں تھا۔

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچے میں جا کر ہم ذلیل و خوار ہوتے

شوکت تھانوی کے والد کی نظر جب اس شعر پر پڑی تو انھوں نے شوکت کی والدہ کو یہ شعر غصے میں سنایا اور پھر کہا:

"یہ آوارہ گرد! آخر اس کوچے میں جاتا ہی کیوں ہے؟"

شوکت کی والدہ نے ان کا غصہ دیکھا تو اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے بیٹے کی صفائی پیش کرتے ہوئے بولیں۔

"بچہ ہے، غلطی سے چلا گیا ہو گا، میں منع کر دوں گی۔ اب کی بار معاف کر دیں۔"

پاکستان بنانے کی ضرورت تھی؟

پروفیسر جگن ناتھ آزاد پاکستان آئے تو ان کے اعزاز میں ایک دعوت رکھی گئی۔ اس دعوت میں سبزیاں، دالیں تو

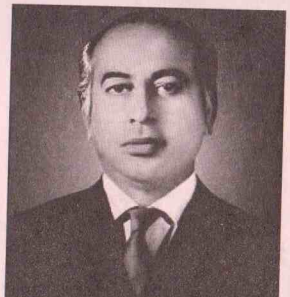

وافر مقدار میں نظر آ رہی تھیں مگر گوشت کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ جگن ناتھ نے میزبان کو اپنے پاس بُلایا اور کہا۔

"اگر آپ کو یہی کچھ کھانا تھا تو پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی؟"

مہنگے جوتے:

سابق وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کر رہے تھے کہ دورانِ تقریر کسی دل جلے مخالف نے احتجاجاً اپنا جوتا اُونچا کر کے ہوا میں لہرا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ بھٹو احتجاج کو سمجھ لیں۔ جیسے ہی بھٹو کی نظر جوتے پر پڑی، انھوں نے تقریر کے دوران ہی کہا:

"ہاں، ہاں میں سمجھ گیا، جوتے مہنگے ہو گئے ہیں۔ سدِ باب کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔"

◆◆◆

☆ پُرسکون زندگی کا راز صرف ایک ہے اور وہ ہی جس کو قناعت کہتے ہیں۔ یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا اس پر صابر و شاکر رہنا۔

☆ عدمِ اطمینان دراصل عدمِ قناعت کی قیمت ہے جو ہر اس شخص کو بھگتنی پڑتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی تقسیم (عطا) پر راضی نہ ہو۔

اُکھڑے ہوئے لوگ

بندی کہانی

رام لعل

صبح پہلی گاڑی سے میں چندی گڑھ پہنچ گئی تھی۔ اُس وقت بجے تھے لیکن سردیوں میں تب بھی شہر میں خاصا اندھیرا ہی ہوتا ہے۔ وہ صبح بھی خاصی کہر آلود تھی۔ دسمبر کی آخری صبح میں لمبے کوٹ کے نیچے ایک نیلا کارڈیگن بھی پہنے ہوئے تھی۔ سر پر ایک ریشمی پھولدار اسکارف باندھ رکھا تھا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو حیران رہ گئی۔ میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی! لیکن درحقیقت چالیس سے بہت آگے نکل آئی ہوں۔ لوگوں نے بڑے اشتیاق سے میری طرف دیکھا تو میں دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ مردوں کی ایسی نظر ایک عورت کو خوشی اور خود اعتمادی کا احساس دیتی ہے لیکن اُس وقت میں قطعی دوسرے موڈ میں تھی۔

انتظار گاہ میں جا کر چائے منگائی۔ اُس وقت وہاں چائے پینے والی تنہا میں ہی تھی۔ وہاں ایک ہی جنرل ویٹنگ روم ہے جو مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُجالا ہونے تک مجھے وہیں بیٹھنا تھا۔ سبھی مسافروں کو میری طرح دوسری بس سے شہر جانا تھا۔ وہاں ٹیکسیاں بہت مہنگی ہیں۔ ٹھیک ہے، بس کے روانہ ہونے تک دھوپ نکل آئے گی۔ ٹھٹھرن اور کہرہ بھی کم ہو جائے گا۔

لیکن میں وہاں ایک ہی گھنٹا بیٹھ کر بور ہو گئی۔ اٹیچی اُٹھا کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی کئی ٹیکسی ڈرائیور میرے گرد جمع ہو گئے۔ اُن سے پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ میں اس قدر سویرے سترہ نمبر سیکٹر میں جانے کو تیار نہیں تھی لیکن یونیورسٹی کے ایک طالبعلم نے جو انجمی ڈرائیوروں میں گھر گیا تھا، مجھے اسکوٹر رکشا میں پارٹنر بنانے کی پیشکش کی تو میں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح میں صرف ایک ہی روپے میں اپنی بیٹی کے گھر سے تھوڑی ہی دور مین روڈ تک پہنچ گئی۔ اس وقت بھی کہرہ چھایا ہوا تھا۔ دھوپ نکلنے کی کوئی اُمید نہیں تھی کیونکہ آسمان پر بادل آ گئے تھے۔

اچانک مجھے یاد آیا، وہ ناول تو میں ویٹنگ روم میں ہی چھوڑ آئی جسے میں نے بریلی اسٹیشن پر اسٹال سے خریدا تھا۔ ناول نے راستے بھر ایک اچھے دوست کی طرح ساتھ دیا تھا۔ ایک چوتھائی پڑھنا باقی رہ گیا تھا۔ اُسی نے مجھے افسردگی سے بھی دور رکھا تھا رات بھر۔

میں تو چندی گڑھ جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بار بار بھیسن صاحب سے کہا تھا، آپ ہی جایئے نا! لیکن انھوں نے اپنے بس، انکم ٹیکس کی تاریخ اور نہ جانے کون کون سی مصروفیات کی پوری فہرست سنا دی لیکن میں خوب سمجھتی تھی، وہ اتنے سنجیدہ ماحول میں جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ وہ ہیں بھی بے حد حساس! ایسا آدمی اس قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کیونکر کرے گا جس میں داماد نے اچانک ایک دوسری عورت کے ساتھ گٹھ جوڑ لیا ہو اور بیٹی نے اپنے ماں باپ کو ایک لمبے پتر کا سارا دکھڑا بھی لکھ بھیجا ہو! وہاں تو کسی سخت یا ذہین آدمی کی ضرورت تھی جو اس معاملے کو سلجھا بھی سکتا۔

میں بھیسن صاحب کے ساتھ اس بات پر پوری طرح متفق تھی کہ ہمارے پریوار میں اس قابلیت کا آدمی ایک بھی نہیں لیکن اتنے گھمبیر معاملے میں کسی دوسرے پر بھروسا کیا بھی کیسے جا سکتا تھا؟ رشتے دار یا بعض دوست کتنے بھی قریب کیوں نہ ہوں، کوئی بھی اپنے آپ کو پوری دیانتداری سے ایسے معاملے میں شامل نہیں کرتا۔ معاملے کو سنوارتا کم، بگاڑتا زیادہ ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے خاوند کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا کہ اشوک کو راہِ راست پر لے آنے کے لیے ہمارے فیملی ڈاکٹر سہگل یا پجو بھاجی کو وہاں بھیجا جائے۔ اُن سے بہتر تو میں خود ثابت ہو سکتی تھی جس کا روم روم بیٹی کے درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ لڑکی کب تک رو رو کر ہلکان ہوتی رہے گی!

شادی کے پانچ برس بعد وہ اس مشکل میں پھنسی تھی۔ ایسی مشکل کے لیے اگرچہ کوئی وقت مقرر نہیں۔ مرد کسی بھی لمحے دھوکا دے سکتا ہے۔ مرد عام طور پر گھر سے باہر کہیں نہ کہیں جھک مارتی ہی آتا ہے لیکن ایسا تو کوئی کوئی ہی ہوگا جو خاصی حسین بیوی کی موجودگی میں بھی کسی دوسری عورت کو داشتہ بنا لے۔

اب میرا ہی آدمی دیکھنے میں تو بڑا سیدھا سادا ہے۔ دن رات اپنے ریڈیو کے دھندے میں مصروف رہتا ہے۔ اس نے تو میرے ساتھ بھی محبت دکھانے میں کبھی آزادی نہیں دکھائی لیکن میں اس کے بارے میں بھی پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ سو فیصدی وفادار نہیں۔ اس بات کے لیے میں نے اُس کے ساتھ کبھی جھگڑا نہیں کیا۔ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی جان تک لڑا دینے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹی۔ محض اس نیت سے کہ وہ مجھ سے کبھی دور نہ ہو۔ ایسا کر کے میں اپنے طور پر بے حد مطمئن بھی ہوتی رہی ہوں۔

اب اس کے مستقل طور پر ہاتھ سے نکل جانے کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اس نے میرے ہی رہنے کے لیے اتنا خوبصورت و آرام دہ مکان بنوایا ہے۔ میرا ہر طرح سے خیال بھی رکھتا ہے۔ خود کو میں خوش قسمت ترین عورتوں میں شمار

ایک نرالے جوڑے کی دردانگیز داستان، وہ ہر دم لڑ کر بھی محبت کے شعلے کو بجھا نہ پایا

کیوں نہ کروں؟ پاکستان سے آ کر آخر کتنوں کو یہ عزت نصیب ہوئی! ریڈیو بزنس میں ہاتھ ڈالتے ہی روپیہ پانی کی طرح بہتا ہوا سا آیا ہے۔ روپے کے ساتھ ساتھ پہلے ایک پرانا مکان بھی ہاتھ لگا۔ کسٹوڈین کے ذریعے پھر اسی مکان کی نئی تعمیر بھی ہوئی۔ بچوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت ملی اور ہم سب کو وہ ساری آسائشیں بھی جن کی متوسط طبقے میں کلپنا کی جا سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے بھیسن صاحب کبھی کبھی جذباتی ہو کر کہہ بیٹھتے ہیں، پتا نہیں کیوں یہ سب مجھے اپنا نہیں لگتا! جیسے یہ سب ایک سراب ہو! میرا نہ ہو! میرا سب جو پاکستان رہ گیا، وہی اب بھی میرے خوابوں میں آتا ہے۔ میں اب بھی کبھی کبھی اپنے بچپن کے دور میں جا پہنچتا ہوں۔ چھوڑی ہوئی گلیوں میں جا کر کھیلتا ہوں، بھاگتا ہوں، اور کبھی کبھی اپنی سورگیہ ماں کو دیکھ کر اُس کی گود میں سر رکھ دیتا ہوں۔

جو کچھ بھیسن صاحب کہتے ہیں، وہ نفسیاتی طور پر غلط تو نہیں اور مجھے کئی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی محسوس نہیں کیا، شاید اس لیے کہ میں پاکستان صرف کچھ ہی سال رہ پائی تھی۔ میرے ماں باپ ویسے بھی ادھر کے تھے نا! جالندھر کے۔ اسی لیے میں اپنے خاوند کے ایسے جذباتی اُبال پر بھی کبھی ہنس دیا کرتی ہوں۔ اُس نے یہاں جس زمین کو میرے سامنے اپنی گاڑھی کمائی سے خریدا، اس پر ڈبل اسٹوری عالی شان مکان بنوایا اور اس پر اپنی سنگ مرمر کی نیم پلیٹ بھی لگوا رکھی ہے، وہ جگہ بھلا اُس کی اپنی کیسے نہیں!

ہماری سروج جب کالج میں تھی تو وہ بھی اپنے باپ کے اس قسم کے جذباتی رویے سے اُوب کر کہہ اُٹھتی تھی: ''ڈیڈی! آپ بہت بور ہیں! اپنے پرانے شہر کا قصہ کیوں لے بیٹھے! مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔ بھئی ہم نے تو یہیں آ کر ہوش سنبھالا ہے، ہم تو اسی شہر کے ہیں۔''

یہ سن کر بھیسن صاحب سروج اور میری طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے، اداس بھی ہو جاتے، سوچتے سے رہ جاتے کہ ہم ان کی باتوں کا مطلب ٹھیک طرح سے کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ کبھی کبھی تو وہ ہمیں سچ مچ سمجھانے بیٹھ جاتے۔ اپنے سوبھاؤ کے مطابق دونوں ہاتھوں سے ہوا میں ہی کچھ بنانے لگتے۔

''اس طرح کی ایک گلی تھی۔ اس کے آس پاس ایک بڑا گنجان محلہ تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک بازار، اسکول، کالج، میدان کچہری، ڈاک خانہ اور ایک برادری نہیں، پورا سماج انھی کے بیچ میں اپنا ایک گھر تھا۔ اُس گھر میں سچ مچ بڑا سکون تھا۔ جیسا کسی مضبوط قلعے میں ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ سیکورٹی کا احساس تو سمجھتے ہو۔ ہم کسی جنگل میں جا کر راتوں رات ایک چار دیواری بنا کر اُس کے اندر پورے اطمینان سے کبھی نہیں رہ سکتے۔ مجھے اپنا یہ گھر ایک جنگل کے اندر ہی بنایا ہوا سا لگتا ہے۔ تم لوگوں کو اس جنگل سے گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی کیونکہ تمھاری پرورش ہی اسی ماحول میں ہوئی ہے لیکن جس احساس کا شکار تمھارا باپ ہو رہا ہے، اُس سے اُس کی اولاد کب تک آزاد رہ سکتی ہے؟ مجھے یقین ہے تم بھی کبھی نہ کبھی ایسا ضرور محسوس کرو گے۔ ٹھیک میری طرح نہ سہی، کسی اور شکل میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

سروج نے شادی ہو جانے کے بعد بڑے فخر سے ہمیں لکھا تھا، ہم نے چنڈی گڑھ میں سترہ نمبر سیکٹر میں اپنا مکان بنوانا شروع کر دیا ہے۔ سب لوگ باہر سے ہی آ آ کر بس رہے ہیں۔ پتا نہیں ہمارے پڑوس میں کون آ کر مکان بنواتا ہے۔ ابھی تک تو دونوں طرف پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ ہم فی الحال تین ہی کمرے بنوا رہے ہیں۔ ایک کچن، ایک اسٹور اور ایک باتھ روم بھی۔ ایک چھوٹا گول برآمدہ بھی ہوگا۔ برآمدے کے لیے گڑھ مکیشور کے موڑھے بھجوانے کے انتظام ضرور کر

دیجیے گا۔ ان کے کناروں پر چمڑا بھی مڑھوایے گا لیکن موڑھوں پر ہم پینٹ اپنی پسند کا ہی کرائیں گے۔

میں اُن کے مکان میں صرف ایک مرتبہ پہلے گئی تھی۔ دو سال پہلے جب اشوک اور سروج کا مارشل پیدا ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ دو مہینے رہی، ساتھ ان کی فرمائش کے مطابق چار موڑھے بھی لے گئی۔ برآمدے میں واقعی اچھے لگتے ہیں۔ صبح صبح وہاں بیٹھ کر اشوک چائے پیتا، اخبار پڑھتا، دوپہر میں دھوپ آ جانے پر سروج وہیں بیٹھ کر کپڑے سیا کرتی۔ وہیں میں بھی اپنے نواسے کو گھٹنوں پر لٹا کر اس کی مالش کرتی۔ شام ہونے لگتی اور اشوک کے دفتر سے لوٹنے کا وقت ہو جاتا تو سروج پھاٹک پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کیا کرتی۔ سڑک پر گزرتی ہوئی عورتوں کی طرف بھی تکا کرتی۔ کسی کسی کے ساتھ اُس کی بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔

اُن دو مہینوں میں وہاں رہ کر مجھے کئی باتیں پہلی بار معلوم ہوئی تھیں۔ سروج شادی کے بعد بہت لڑاکا ہو گئی تھی۔ بات بات پر اشوک کے ساتھ الجھ پڑتی۔ اُس پر جا بے جا حکم بھی چلاتی۔ اگرچہ وہ بے چارہ گھر کا بہت سا کام بنا کہے بھی کر دیتا تھا۔ اُس پر بھی وہ اسے کام چور ہی سمجھتی۔ لیکن اشوک پلٹ کر اسے کبھی کچھ نہ کہتا۔ اُس کی ہر بات پر بس ہنس پڑتا۔ کبھی کبھی شکایت کر بھی دیتا تو اس انداز سے جیسے یہ بھی ایک گھریلو فرض نبھانے کی خاطر ہی کر رہا ہو۔ ورنہ وہ پوری طرح مطمئن ہے۔ اُسے اپنی خامیوں کا احساس ہے اور وہ واقعی کام چور بھی ہے۔ سروج جو کچھ کہتی ہے اُس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

اشوک کے رویے سے میں بھی پوری طرح مطمئن تھی۔ وہ واقعی ایک محبت کرنے والا خاوند تھا۔ اشوک کی ایسی بے پناہ محبت کے مقابلے میں سروج کی بدزبانی دیکھ کر میں نے اُسے کئی بار ٹوکا بھی تھا لیکن اشوک ہی اُسے کچھ کہنے سے مجھے منع کر دیتا اور میں اُس کی اپنی بیوی کے تئیں ایسی پر جوش عقیدت دیکھ کر وہاں سے خوش خوش لوٹ آئی تھی۔ دو سال پہلے مجھے وہ دن ابھی تک یاد ہے جب اشوک اور سروج اپنے ننھے مارشل کو ساتھ لیے ہوئے مجھے چھوڑنے اسٹیشن پر آئے تھے۔ اب دو برسوں میں کیا کچھ نہیں ہو چکا! اس بیچ میں سروج صرف ایک بار ہمارے پاس آئی تھی۔ اشوک کی بہت سی شکایتیں کر کے گئی۔ وقت پر گھر نہیں لوٹتا۔ اپنے رشتے داروں پر بہت جان چھڑکتا ہے۔ ان کی وقت بے وقت روپے پیسے سے مدد بھی کرتا رہتا ہے۔ دوستوں کو گھر پر زیادہ بلاتا ہے جن کی ناز برداریاں کرتے کرتے میں عاجز آ جاتی ہوں۔ میں کہتی ہوں ان کا ایک بھی دوست کام کا نہیں۔ سب غرض کے بندے ہیں! اس شہر میں کوئی بھی کسی کا نہیں۔

لیکن میں نے سروج کی کسی بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اُس کی عادت سے واقف ہوں نا، بات بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اُسے خوب آتا ہے۔ اسی لیے اس کی ہمیشہ حوصلہ شکنی ہی کی ہے۔ اس نے واپس جا کر مجھے کئی خط لکھے۔ ہر خط میں اشوک کی وہی شکایتیں ہی لکھتی رہی لیکن پچھلے چند خطوں میں وہ سچ مچ بہت دکھی معلوم ہوئی۔ اس نے رو رو کر لکھا ہے، اب وہ میری بالکل پروا نہیں کرتے۔ کوئی عورت بھی رکھ لی ہے۔ اکثر اسی کے یہاں رہتے ہیں۔ یا تو آ کر مجھے لے جائیے یا مجھے اجازت دیجیے خود کو آگ لگا کر مر جاؤں!

☆☆☆

میں اپنے خیالوں میں ڈوبی ڈوبی مارکیٹ کے سامنے گزری۔ وہ ابھی بند تھی۔ پوری مارکیٹ میں، میں ہی اکیلی چل رہی تھی۔ ابھی تک کوئی بھی ادھر سے نہیں گزرا تھا۔ شام کے وقت یہاں چلتے ہوئے کندھے چھلتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائی ہوں۔ مارشل، سروج، اشوک کسی کے لیے بھی نہیں۔ بہت جلدی میں نکلی نا! بڑی پریشانی میں۔ سوچا اگر سب ٹھیک ہوا، وہیں سے خرید کر لے دوں گی۔ اشوک کو

اس بار گرم سوٹ ہی لے دوں گی اس کی پسند کا۔

میں نے رُک کر اِدھر اُدھر ایک دکان کو تلاش کیا۔ دومنزلہ فلیٹوں کے نیچے بڑی بڑی دکانوں کے بڑے پرکشش سائن بورڈ تھے۔ یہیں کہیں ایک بہت اچھی کپڑے کی دکان تھی۔ دو سال پہلے وہاں سے مارشل کے لیے کپڑے لیے تھے۔

میں آگے بڑھ گئی۔ نئی طرز کا سینما گھر اُس وقت محوِ خواب تھا۔ یہاں ہم سب نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی ٹین کمانڈمنٹس! آگے پارک تھا۔ اُس پار کے رہائشی مکانوں تک پہنچنے کے لیے میں پارک کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر سے ہو کر گزرنے لگی۔ انھی مکانوں کے پیچھے ایک گلی میں ان کا مکان ہے۔ مکانوں اور پارکوں کے یہ سلسلے بہت خوبصورت ہیں۔ فرانسیسی انجینئر جیسے کسی دوسری ہی دنیا سے یہ نیا نگر اپنی ہتھیلی پر اُٹھائے اُٹھائے آ گیا۔

آڑے، ترچھے، بیضوی، تکونے، چوکور نقشے! ہر بلاک ایک جداگانہ رنگ کا۔ ہر گھر سے نکلتے ہی ایک سیرگاہ کا آغاز۔ شاید دنیا میں ایسا اور کہیں بھی نہیں ہوتا۔ چیری، زردمہر، یوکلپٹس کے پیڑوں کے طویل سلسلے، کچھ پیڑوں کے بدن پر لال لال انگاروں کے سے پیرہن ہیں۔ ان پیڑوں کے نیچے نیچے جانے والی سڑک پر بھی انگارے ہی بچھے ہیں۔ میں انگاروں پر بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوئی گئی ہوں۔ اُف آج میں کتنی اُداس ہوں۔

چلتے چلتے میں نے اٹیچی دوسرے ہاتھ میں بدل لی۔ کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کارڈیگن کے اُوپر کے بٹن کھول دیے۔ دم گھٹتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں نے بہت سی تازہ ہوا اپنے اندر بھر لی۔ دور اسٹیشن کی طرف سے ایک بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ شاید یہ وہی بس تھی جس سے مجھے آنا تھا۔ اچانک گلی کے موڑ پر ایک اسکوٹر میرے بالکل پاس آ کر رک گئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، وہ اشوک تھا۔ نائٹ کیپ لگائے۔ بدن پر چمڑے کی جیکٹ اور ڈرین پائپ، ذرا ذرا سی بڑھی ہوئی شیو، ہونٹوں کے درمیان ایک سگریٹ پھنسا ہوا۔

''ممی آپ!''

مجھے دیکھ کر وہ واقعی حیران نظر آیا۔

وہ اتنے سویرے سڑک پر کیوں گھوم رہا ہے؟ یقیناً اُسے میری آمد کی کوئی اطلاع نہیں ہو سکتی۔ اُس کا رخ بھی اپنے گھر کی طرف ہے، یعنی وہ اس عورت کے پاس سے لوٹ رہا ہے۔ میں سمجھ گئی جیسا سروج نے لکھا تھا۔

چند لمحوں تک تو میں نے کوئی جواب دینے سے خود کو روکے رکھا۔ اس کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ جب آدمی کسی بات کی شکایت کرنے کے لیے بالکل حق بجانب ہو تو وہ اپنے اندر اچانک کافی جرأت پیدا کر لیتا ہے۔ میں بھی پوری جرأت سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری بیٹی میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو اُن کا بدلہ لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟

''کیا سروج نے آپ کو لکھا تھا؟'' وہ ابھی تک میری اچانک آمد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں فوراً یہ فیصلہ کر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے اشوک کے ساتھ وہ روّیہ ہرگز نہیں اپنانا چاہیے جس سے سروج کی پوری حمایت ظاہر ہو۔ میں نے اس سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا:

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں بیٹا لیکن گھر جانے سے پہلے ہی۔ یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا تو مناسب نہیں۔ کہیں چائے کی دکان نہیں کھلی ہے۔ میں چائے بھی پینا چاہتی ہوں۔ بہت سردی ہے نا۔''

اشوک نے میرے ہاتھ سے اٹیچی لے لیا اور کہا: ''اچھا تو ممی میرے پیچھے بیٹھ جایئے۔ اِدھر بائیس میں ایک ریستوران بہت صبح کھل جاتا ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔''

بائیس سیکٹر میں ایک چھوٹا سا ریستوران واقعی کھلا تھا۔

مالک خود ہی انگیٹھی لگا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ ایک جھاڑن سے میز اور کرسیاں پونچھ دیں۔ میں نے اسے چائے اور اُبلے ہوئے انڈے لے آنے کے لیے کہا۔ اشوک نے نئی سگریٹ سلگائی تو میں نے اس سے پوچھا:

''تم سگریٹ کب سے پینے لگے؟''

''معذرت ممی! تمہارے سامنے سگریٹ پی رہا ہوں۔ لیکن مجھے اجازت دے دو اب۔'' وہ میز پر کہنیاں ٹیک کر مسکرایا، پھر سر سے ٹوپی اُتار کر میز پر رکھ دی۔ سر کے چپکے بال انگلیوں سے ٹھیک کرتے ہوئے بولا: ''کہو نا ممی! تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟''

میں پس و پیش میں پڑ گئی۔ میں ستائیس سال کے اس نوجوان کے سامنے بیٹھی ہوں جو میرا داماد ہے۔ شاید شب بھر کسی دوسری عورت کے ساتھ رہا ہے۔ عورت مرد کا ایسا چہرہ تو ایک نظر میں پہچان جاتی ہے، جو صبح کی روشنی میں گزشتہ شب کا سارا قصہ کہہ ڈالتا ہے۔ یہ احساس کر کے مجھے صدمہ سا بھی محسوس ہوا لیکن وہ کسی قسم کی ندامت نہیں دکھا رہا تھا۔ میں نے بھی اُس پر سے اپنی نظریں ہٹائیں نہیں لیکن ایک شائستہ ضبط کے ساتھ اس سے کچھ کہنے کے لیے تیار ہو گئی، سچی سچی باتیں۔

''بیٹا یہ تو مجھے معلوم ہے سروج بہت بدزبان ہے۔ تمہیں ہر وقت ٹوکتی رہتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار پہلے بھی سمجھایا ہے۔ اب بھی ایسا کروں گی۔ تمہارے سامنے اس کے ساتھ وہ کروں گی کہ...... لیکن پھر تم ہی میرا ہاتھ نہ روک لینا!''

میں پگھل کر رہ گئی، اندر ہی اندر پہلے سے ہی کافی پگھلی ہوئی تھی۔ اشوک مسکراتا رہا۔ اُسی بیچ میں انڈے آ گئے۔ ایک پلیٹ میں اُس نے میرے سامنے سرکا دی اور کہا:

''ممی، تم بہت بھولی ہو۔ میرا خیال ہے دنیا کی بیشتر عورتیں تمہاری ہی طرح بھولی ہوتی ہیں۔ میں نے تم سے اس بات کی شکایت کب کی کہ مجھے سروج کا زبان چلانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ مجھ پر حکم بھی چلاتی ہے تو مجھے محسوس نہیں ہوتا بلکہ خوشی ہی ہوتی ہے کہ کوئی عورت اس لہجے میں مجھ سے مخاطب تو ہوتی ہے!''

محبت کیا ہے؟

☆ خدا سے ہو تو بندگی بن جاتی ہے

☆ استاد سے ہو تو روشنی بن جاتی ہے

☆ دولت سے ہو تو مرض بن جاتی ہے

☆ انسان سے ہو تو زندگی بن جاتی ہے

☆ والدین سے ہو تو عبادت بن جاتی ہے

میں بھونچکا سی رہ گئی۔

''پھر؟...... پھر سروج نے وہ سب کیوں لکھا؟''

وہ زور سے ہنس پڑا اور بولا: ''میرا اور اُس کا جھگڑا بالکل دوسری بات پر ہے۔ جس سے نہ وہ واقف ہے نہ ہی تم سمجھ سکتی ہو ممی!''

یہ کہہ کر اُس نے چھیلے ہوئے انڈوں کے کئی ٹکڑے کر ڈالے جن میں سے ہلکی ہلکی بھاپ نکلنے لگی۔ اُس نے اُن پر نمک اور کالی مرچیں چھڑکیں۔ پھر ایک ٹکڑے کو کانٹے میں پھنسا کر کہا: ''عورت مرد کا ایک ضروری حصہ ہوتی ہے۔ یعنی اُس کی بہت بڑی ضرورت! لیکن وہ مرد کی متواتر چوبیس گھنٹوں کی ضرورت نہیں۔ ہرگز نہیں! مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا اس سے کہیں زیادہ اچھا لگتا ہے اور وہ اسی بات پر کڑھتی ہے۔ حالانکہ میں باہر کی نسبت گھر پر کہیں زیادہ وقت گزارنے پر مجبور ہوں۔ رات کے آٹھ دس گھنٹے! صبح و شام کے بھی چار پانچ گھنٹے! یعنی کل ملا کر چودہ پندرہ گھنٹے تو

اُسی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔"

اُسی دوران میں نے پیالوں میں چائے انڈیل دی۔ ایک پیالی اُس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اُٹھا لی اور کہا: "وہ میرے دوستوں کو پسند نہیں کرتی جن کے ساتھ میں قہقہے لگا کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ ٹھیک ہے وہ سب کے سب خودغرض بھی ہو سکتے ہیں لیکن جو لمحے پھر بھی ہم ساتھ گزارتے ہیں وہ ہم مردوں کے لیے زندگی کے بہترین لمحے ہوتے ہیں۔ پھر ہمیں کب یہاں ہمیشہ رہنا ہے! یہاں جی نہیں لگے گا تو کہیں اور چلے جائیں گے۔ مکان تو ہر وقت بِک سکتا ہے۔ پہلے سے زیادہ... دونی چوگنی قیمت پر؛ جہاں جائیں گے ایک نیا مکان کھڑا کر لیں گے۔ روپیہ ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ مجھے تو یہ بالکل مہم جیسا لگتا ہے۔ خالص مردوں کی مہم جوئی جس میں بے پناہ خوشی بھری ہوتی ہے!"

میں منتظر تھی وہ اُس موضوع کی طرف کب آتا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔ اُس کے لیے ایک اور پیالی بنا کر میں نے پوچھا: "کیا تم رات گھر پر رہے؟"

میرے اس سوال کے لیے وہ جیسے بالکل تیار تھا۔ ذرا بھی نہ گھبرایا۔ میں نے بھی یہ بات طنزاً نہیں پوچھی تھی بلکہ بہت ہی سادہ انداز میں۔ اُس نے اُسی بے تکلفی سے جواب دیا۔ "ممی یہ تو سچ ہے کہ اب میں کبھی کبھی رات کو گھر پر نہیں سوتا، لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو میں نے کہی۔ آخر سروج مجھ پر اپنا پورا قبضہ کیوں جمانا چاہتی ہے؟"

اس کے بعد وہ چپ ہو گیا اور چائے پینے لگا۔ میرے اندر بھی اچانک ایک طوفان اُٹھتے اُٹھتے تھم گیا۔ وہ اس قدر معصوم، سنجیدہ اور سچا نظر آیا کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا مجھے بالکل بے معنی سا لگا...... بلکہ بے انصافی پر ہی مبنی!

میں نے مسکرا کر پوچھا: "جس کے پاس تم جاتے ہو وہ نہیں ٹوکتی تمھیں؟ یہ نہیں کہتی کہ تم اُسے چھوڑ کر کہیں اور مت جایا کرو؟"

"نہیں ممی! وہ ایسی کوئی بات نہیں کہتی یا یہ کہ میں دیر سے کیوں آتا ہوں، کبھی کبھی بالکل کیوں نہیں آتا، پھر کب آؤں گا، آؤں گا بھی یا نہیں؟ میرا جب جی چاہتا ہے وہاں چلا جاتا ہوں لیکن اُس نے جس دن مجھ پر پورا ادھیکار جمانے کی کوشش کی اُسی دن اسے چھوڑ دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا: "ممی، مجھے دفتر بھی جانا ہے۔ ٹھیک دس بجے صرف آدھا گھنٹا باقی ہے۔ اب گھر چلیں۔"

سروج نے مجھے اشوک کی اسکوٹر پر سے اترتے دیکھا تو وہ چپ سی رہ گئی۔ کچھ سمجھ نہ سکی۔ بولی: "ان سے پوچھا نہیں وہ سب جو میں نے تمھیں لکھا تھا!"

اشوک نے جلدی جلدی شیو کا سامان نکالا۔ خود ہی پلگ لگا کر پانی گرم کر لیا اور برآمدے میں لگے شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر منہ پر صابن سے بھرا ہوا برش چٹ چٹ تھوپنے لگا۔ صابن کا جھاگ ادھر ادھر کئی جگہ اُڑ اُڑ کر گرا۔ کرسی پر، فرش پر اور اُس کے کپڑوں پر بھی۔ میں مارشل کو گود میں لے کر پیار کرتی رہی۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے اب! شرارتی بھی۔ چاہتا ہے باپ اسے اُٹھا کر آئینہ دکھائے اور اس کی بھی شیو بنا دے۔

اشوک دفتر چلا گیا تو میرا پورا دن سخت بے چینی میں گزرا۔ سروج کی باتیں سن سن کر جی پھٹتا رہا۔ اُسے کوئی جواب بھی نہیں دے سکی۔ کچھ اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آئیں۔ وہ سروج سے ہمدردی رکھتی تھیں۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی باتیں مجھ سے کہیں جیسی سروج کہتی تھی لیکن میں نے انھیں بھی پلٹ کر کوئی جواب نہ دیا تو وہ حیران سی ہو کر لوٹ گئیں۔ میری خاموشی سروج کو بھی ناگوار گزر رہی تھی۔ میں کچھ کہتی کیوں نہیں؟ مائیں تو بیٹیوں کی تکلیف پر رو پڑتی ہیں۔ اُس نے مجھے اسی لیے تو یہاں بلایا ہے۔

شام کو اشوک ٹھیک وقت پر آ گیا۔ اس نے آتے ہی چائے مانگی۔ سروج سے ہی مانگی اور اس کی طرف مسکرا کر بھی دیکھا لیکن سروج اپنے چہرے پر کسی قسم کی مسکراہٹ نہ لائی۔ اس نے دن میں جو چند کپڑے دھوئے تھے اور اب سوکھ چکے تھے، انھی کو تہ کرنے میں لگی رہی۔ اس نے چائے بنانے میں کچھ توقف دکھایا تو میں ہی مارشل کو گودی سے اُتار کر باورچی خانے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سروج بھی میرے پاس آ بیٹھی۔ ایک طرف چپ چاپ۔ مارشل کی قمیص کے ٹوٹے بٹن لگاتی رہی۔ مارشل اس کی گود میں لیٹا لیٹا دودھ پیتا رہا۔ اشوک نے موڑھے میں ڈوب کر سگریٹ سلگا لیا۔

وہ بار بار سگریٹ کی راکھ فرش پر گرا دیتا۔ اُس نے اپنا کوٹ جو آتے ہی پلنگ کی ٹیک پر پھینک دیا تھا، پھسل کر فرش پر گر گیا۔ اس نے کوٹ پھر سے اُسی طرح ٹیک پر پھینک دیا۔ سروج کچن میں بیٹھی بیٹھی اس کی طرف بڑی بے زاری سے دیکھ رہی تھی۔ میں اشوک کے لیے چائے کی پیالی لے کر گئی تو اس نے سگریٹ پاؤں کے نیچے کچل دیا۔ سروج نے مجھ سے کہا: "دیکھ رہی ہو ممی! دن بھر کتنی محنت سے فرش رگڑ رگڑ کر چمکاتی ہوں اور یہ ہیں کہ سگریٹ، کاغذ، اخبار، جوتے، ہر چیز جہاں چاہتے پھینک دیتے ہیں۔"

اشوک نے بڑے اطمینان سے چائے کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اُتارے۔ ایک دو بار میری طرف بھی دیکھا۔ شاید میرا ردعمل جاننے کے لیے۔ پھر بڑے ضبط سے کہا:

"سروج! میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا۔ یہ مکان ہم نے بنایا ہے، مکان نے ہمیں نہیں بنایا۔ ہم جس طرح چاہیں گے اسے استعمال کریں گے۔ مکان کو یہ حق کبھی نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں استعمال کر سکے۔"

پھر وہ میری طرف پلٹ کر بولا: "ممی تمھیں میرا رویّہ بہت ہی عجیب سا لگ رہا ہو گا لیکن میں کہتا ہوں ہم اپنے بنائے ہوئے مکان کے اندر پوری آزادی سے کیوں نہ رہیں؟"

یہ سن کر میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا کوٹ ہینگر پر لٹکا دیا۔ برش سے فرش پر بکھری راکھ اور سگریٹ کے ٹکڑے صاف کر دیے اور کہا: "اشوک، مجھے تو ایسا لگتا ہے تم اپنے ہی مکان کے ساتھ لڑ رہے ہو! جسے تم نے خود بنایا ہے۔"

مجھے اپنے خاوند کی بھی باتیں یاد آ گئیں تو اور زیادہ ہنسی آئی۔ میں نے درمیان میں رک کر سروج سے کہا: "تجھے یاد ہے نا، تیرے ڈیڈی اپنے مکان کے بارے میں کبھی کبھی کیا کہنے لگتے تھے۔ اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی سمجھنے لگتے تھے۔ تو ان کے ساتھ الجھ بھی پڑتی تھی۔"

میں نے سر گھما کر اشوک کو بتایا: "ہاں سچ! یہ لڑکی تو اپنے ڈیڈی کو ڈانٹ بھی دیتی تھی۔ عورتیں دراصل اپنے مکان سے بہت زیادہ اُنس رکھتی ہیں۔ انھیں اسی کی چار دیواری کے اندر ہی تو زندگی بِتانا ہوتی ہے۔"

من ہی من میں، مَیں نے سوچا، عورت اپنے ماں باپ کے گھر سے قدم نکالے تو اس کے سامنے مکان یا چار دیواری کا تصور بہت دھندلا سا ہوتا ہے۔ اسے یقین بھی نہیں ہوتا وہ جس مرد کے ساتھ جا رہی ہے وہ اُسے پوری حفاظت کا احساس بھی دے سکے گا یا نہیں، لیکن ایک بار جب وہ اس کے مکان کے اندر داخل ہو جائے پھر اُس مرد اور اس کے مکان پر مکمل اختیار بھی چاہنے لگتی ہے کیونکہ اپنا بہت کچھ دے کر ہی تو وہ انھیں حاصل کرتی ہے۔

میں نے سروج کی طرف دیکھا، وہ اپنی حدود کے اندر کس قدر صحیح ہے۔ لیکن اس کے اندر اعتماد کی کمی ہے۔ زبان پر بھی قابو نہیں۔ قابو نہ ہونے سے ہی اُس کا اصلی مطالبہ کمزور ہو جاتا ہے اور وہ اس وقت بھی منہ پھلائے انگیٹھی کے سامنے

بیٹھی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر میری طرف نہ تکا۔ اشوک بھی ہونٹوں کے درمیان سگریٹ پھنسائے خاموش بیٹھا رہا۔ میں بھی چپ ہوگئی تو مجھے گہری خاموشی کا احساس ہوا اور میرا من ڈوبنے لگا۔ کبھی کبھی ننھی لحات سے گھبرا کر اشوک گھر سے نکل جاتا ہوگا لیکن وہ مجھے روٹھے بچے کی طرح لگا جسے ذرا سی خوشامد سے منایا جاسکتا ہو۔

اچانک اس نے ہاتھ اُٹھا کر سروج کو پکارا ''سروج دیکھو تو میری انگلی میں کوئی کھینچ گڑ گئی ہے۔ دن بھر بہت تکلیف دیتی رہی۔ ذرا سوئی سے نکال دو۔

''اسی کے پاس کیوں نہیں چلے گئے کھینچ نکلوانے؟'' سروج بڑبڑا اُٹھی اور مارشل کا رخ الٹ کرائے دوسری طرف سے دودھ پلانے لگی۔ اب میں ہی سوئی لے کر اُس کے پاس جا بیٹھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا، ''کیسے گڑ گئی؟'' میں ڈر رہی تھی کہ ابھی جھگڑا نہ شروع ہوجائے۔

''نہ جانے کہاں سے؟ مجھے تو تبھی پتا لگا جب درد ہونے لگا۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

ذرا سی کوشش سے میں نے اسے نکال پھینکا۔ سوئی کو اس کی جگہ پر رکھنے کے لیے پلٹی تو اپنے اُوپر سروج کو کھڑا پایا۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ مارشل کو بڑی سختی سے سینے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔

میری سمجھ میں فوراً کچھ نہ آسکا کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہوگئی؟ حیران ہو کر پوچھا بھی، ''کیا بات ہے سروج؟ کیا ہوا تجھے؟''

''یہ بات تم اپنے آپ سے ہی پوچھو ممی۔''

میں ہکا بکا سی رہ گئی۔ اس لڑکی کا دماغ تو نہیں چل گیا!

''میں اپنے آپ سے کیا پوچھوں بیٹا؟ تو اپنی زبان سے ہی کیوں نہیں کہہ دیتی؟'' لیکن مجھے اپنی آواز حیرت ناک طور پر کمزور اور لرزتی ہوئی سی لگی۔

☆ ملنے کے صرف دو ہی معیار ہوتے ہیں.... خون ملتا ہو، یا خیالات ملتے ہوں۔

☆ آسمان پر نظر ضرور رکھو پر یہ نہ بھولو کہ پیر زمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔

سروج پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے جاتے کہتی گئی، ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں؟ تم چاہو تو واپس چلی جاؤ، ابھی، اسی وقت۔''

میرے قدموں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔ کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ اشوک بھی چپ سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے لگا میں کچھ ہی پلوں میں رو دوں گی۔ اپنے آپ پر سے میرا اختیار ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے بے حد ندامت بھی محسوس کی۔ میری ہی کوکھ سے جنمی نے مجھے چپت دے ماری! اپنے آدمی کے سامنے! اب میں کیا کروں؟

کچھ لمحوں تک تو میں کوئی فیصلہ ہی نہ کرسکی۔ پھر میں نے سوچ لیا۔ جلدی جلدی اپنی چیزیں اکٹھی میں رکھیں اور باہر نکل آئی، سروج سے ملے بنا ہی۔ اب میں اُس سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے میری توہین کی تھی۔ میری خودداری نے اجازت نہیں دی کہ میں اب اس کا منہ بھی دیکھوں۔ اسے خود ہی میرے پیچھے پیچھے آنا ہوگا! مجھ سے معافی مانگنی ہوگی۔

گلی میں چلتے چلتے میں نے خود کو پیر پٹختے ہوئے بھی محسوس کیا۔ اس نے تو بچپن میں بھی مجھے کئی بار کلپایا ہے۔ اس کے منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے ہی تو کئی بار اسے پیٹ بھی ڈالتی تھی۔ اگرچہ ایسا کر کے مجھے دکھ بھی بہت ہوتا لیکن اب تو وہ بڑی ہوچکی، اپنے گھر بار والی بھی۔ اسے یہ گھر بار مبارک ہو۔ اسے میری توہین کرنے کا کیا حق ہے؟

میں نیم روشن سڑک پر سیدھی بڑھتی گئی۔ اپنے قیاس کے مطابق اسٹیشن کی طرف ہی جا رہی تھی۔ کسی سے راستہ تک پوچھنے کی خواہش محسوس کی نہ کوئی سواری لینے کی۔ غصے کی

کیفیت میں میلوں تک چل سکتی تھی۔ ادھر ادھر کسی بھی طرف دیکھے بغیر جگمگاتے ہوئے مکان، ہنستے ہوئے لوگ! میرے اندر اچانک ہی ہر چیز سے دلچسپی ختم ہوگئی۔

اچانک میں نے پیچھے پیچھے کسی کی چاپ سنی۔ جیسے کوئی بھاگتا آرہا ہو۔ میں اور بھی تیز چلنے لگی لیکن وہ چاپ چلنا ہی ختم ہوگئی۔ جیسے میں اس سے بہت آگے نکل گئی۔ میرا کوئی تھا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر میرا جی اور بھی دکھا لیکن میں نے خود کو رونے سے باز رکھا۔ اگر چہ میرا دل پاش پاش ہو چکا تھا۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ لڑکی میرے ساتھ ایسا سلوک بھی کر گزرے گی۔ اس کے باپ کو جا کر بتاؤں گی۔ تیری لاڈلی نے میری کتنی بڑی ذلت کی ہے۔ اب میں اُس کا بھی منہ تک نہیں دیکھوں گی۔

چند لمحے رک کر میں پھر چل پڑی لیکن اب میں بلا مقصد چلتے جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسٹیشن کا صحیح راستہ جان لینا چاہتی تھی۔ کوئی سواری مل جائے تو اسٹیشن پر پہنچ کر ہی دم لوں گی۔

اچانک سامنے سے روشنی دکھائی دی۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی۔ آٹو رکشا کے رکتے ہی میں اس کے اندر کود جاؤں گی۔ کرایہ طے کیے بغیر۔ میرے اندر مزید انتظار کی تاب نہیں۔

اسکوٹر قریب آیا تو مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ رکشا نہیں کوئی اسکوٹر سوار تھا۔ وہ میرے پاس پہنچ کر رُک گیا اور بولا: ''ممی اس وقت کہاں جاؤ گی؟''

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ وہ اشوک ہو سکتا ہے لیکن وہ اُتر کر میرے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر میرا اٹیچی تھام لیا۔

''میں واپس نہیں جاؤں گی بیٹا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔'' اگرچہ میری آواز آنسوؤں سے آلودتھی لیکن سخت اور فیصلہ کن۔

اشوک چپ کھڑا رہا۔ اس نے پورے کپڑے بھی نہیں پہن رکھے تھے۔ اس قدر سردی میں صرف پینٹ اور سویٹر ہی پہنے چلا آیا تھا۔ میرے چلے آنے کے بعد یقیناً سروج ہی گرگرائی ہوگی لیکن کچھ بھی ہو، میں واپس جانے کے لیے تیار نہ تھی۔

اشوک نے کچھ سوچ کر کہا: ''ٹھیک ہے ممی! تم جانا ہی چاہتی ہو تو ضرور جاؤ لیکن اس وقت تو کوئی بھی گاڑی نہیں جاتی۔ پہلی گاڑی صبح سات بجے جائے گی۔ تب تک کہاں رہو گی۔''

''اسٹیشن پر انتظار گاہ ہے، لیکن اب تم گھر جانے کے لیے مت کہنا۔''

''اس طرح بھی ہو سکتا ہے ممی کہ تم گھر بھی نہ جاؤ اور اسٹیشن پر بھی نہیں۔ جہاں اس وقت بھی تم کھڑی ہو نا، اس کے ٹھیک سامنے میرے ایک جاننے والے رہتے ہیں۔ چلو وہیں رہ لو۔ صبح چھے بجے آکر میں تمہیں لے جاؤں گا۔ اسٹیشن چھوڑ آنے کے لیے۔''

یہ تجویز میں نے رد نہ کی۔ رات بھر ان کے گھر کے قریب ہی رہوں گی! ہو سکتا ہے صبح تک سروج معافی مانگنے آ جائے۔ اگر چہ میں اُسے معاف کبھی نہیں کرسکوں گی لیکن ایک بار اسے پشیمان ضرور دیکھنا چاہتی ہوں۔

اشوک مجھے سامنے کے بلاک میں لے گیا۔ دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ کوئی عورت اپنے بچوں کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ اشوک نے اُسے بتایا کہ یہ میری ساس ہے۔ رات یہاں رہے گی۔

عورت نے جلدی سے میرے لیے اُسی کمرے میں ایک چارپائی ڈال دی۔ ایک ہی کمرا تھا اُس کے پاس۔ اشوک فوراً واپس چلا گیا۔ اس عورت کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہ بتایا لیکن میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ یہ وہی ہے۔ اسی

کے پاس وہ آتا ہے۔ یہ میرے لیے ایک اور صدمہ تھا۔ میں پھنس کر رہ گئی۔ حالات نے مجھے اپنے شکنجے میں بالکل جکڑ سا لیا تھا۔ اس کے پاس رہنا مجھے عجیب سا لگا لیکن میں چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھی چکی تھی۔ اس نے بستر بھی بچھا دیا تھا۔ میرے لیے اُٹھنا مشکل ہو گیا۔

اس وقت وہ کمرے میں نہیں تھی۔ رسوئی میں چولہا جلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ شاید میں کوئی بات تک نہیں کر سکوں گی۔ بالکل احمقوں کے مانند دیواروں پر لگے کیلنڈر اور تصویریں دیکھنے لگی۔ ایک تصویر کے فریم پر باسی ہار لٹک رہا تھا۔ میں سمجھ گئی اس کا آدمی زندہ نہیں۔ ایک کونے میں بڑے سلیقے سے چار پانچ ٹرنک اُوپر تلے رکھے تھے۔ ایک الماری میں بچوں کی کتابیں اور کاپیاں ترتیب سے لگی تھیں۔ میری نگاہ بچوں پر جا رُکی۔ آٹھ اور دس سال کی دو لڑکیاں گہری نیند میں تھیں۔

اچانک وہ عورت دُودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آئی۔ میرے سامنے ہاتھ بڑھا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا۔ نازک نازک نین نقش کی پچیس چھبیس سال کی سانولی سی! میری بیٹی سے کچھ کم ہی جاذبِ نظر۔ ہر ہر لمحہ اپنے وجود کے اندر سکڑتی سمٹتی ہوئی سی۔ اس حقیقت کے احساس سے میری ہی طرح مجوب کہ ہمارے درمیان کبھی کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔

وہ ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی ہی رہی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کی پیش کش کو قبول کر لینا یا ٹھکرا دینا، دونوں ہی کام میرے لیے مشکل ہو گئے۔ میں اُس کے ساتھ بولنا ہی نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے مجبوراً زبان کھولنا پڑی۔ ''مجھے نہیں چاہیے بیٹی۔''

اسے بیٹی کہہ کر ہی میں کانپ گئی۔ اس کی ذرا سی ہمدردی نے مجھے نرم کر دیا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے میں بھول گئی کہ وہ میری بیٹی کی سوتن ہے۔ دوسرے لمحے اس کی طرف دیکھنا بھی دشوار ہو گیا۔

اس نے اصرار نہ کیا۔ گلاس میرے قریب ایک تپائی پر رکھ کر وہ اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ اپنے بچوں کے پاس کچھ دیر بیٹھی رہی، پھر لیٹ گئی۔ رضائی میں پوری طرح چھپ کر۔ میں ابھی تک پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ بجلی کا بلب روشن تھا۔ روشنی تکلیف دہ بنتی جا رہی تھی۔ اردگرد کی ہر چیز مجھے ہنستی ہوئی سی لگی۔ میں نے اُٹھ کر بتی بجھا دی۔ اندھیرا ہوتے ہی جیسے کئی چہرے غائب ہو گئے۔ زندہ اور متاثر کرنے والی چیزوں کے چہرے۔

اب میں تنہا تھی۔ اپنے اندر داخل ہو کر رات کے مہیب سناٹے سے بچنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ بے اختیار دونوں ہاتھ بھی جوڑ دیے۔ ذہنی اذیت سے مکتی پانے کے لیے بھگوان کو یاد کیا۔ کیا بھگوان واقعی میری مدد کرے گا؟ میں اسی جگہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو جانا چاہتی ہوں۔ یہ دھرتی پھٹ کیوں نہیں جاتی؟ پیشتر اس کے، کہ میں اس کمرے میں پھر سے روشنی دیکھوں۔ روشنی ہوتے ہی سارے مکروہ چہرے پھر سے سامنے آ جائیں گے۔ بھگوان کو اتنی دردمندی سے میں نے پہلے کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ میں اس کی طاقت پر اعتماد نہیں رکھتی۔ میرا وشواس ہمیشہ انسان کی نفسیاتی کشمکش میں رہا۔ آدمی روشنی میں بھی سکون پاتا ہے، اندھیرے میں بھی۔ گھپ اندھیرا ہی میرے لیے ایک مقدس وجود بن گیا ہے۔ ہمدرد اور مہربان اور طاقتور وجود! میں اس کی گود میں سر ڈال کر رو بھی سکتی ہوں۔

اچانک میں نے خود کو روتے ہوئے سنا۔ بہت حیران ہوئی کہ میں سچ مچ رو رہی ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانپے اونچی آواز میں رو رہی ہوں۔ دن بھر تو میں نے خود کو رونے سے روکے رکھا بلکہ کافی برسوں سے! میرے اختیار میں اب ضبط نہیں رہا۔ جب تک چاہوں رو سکتی ہوں۔ عام طور پر میں کسی عورت کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ مجھ سے دیکھا ہی نہیں جاتا۔ عورت اتنی کمزور کیوں ہے؟ وہ اتنی مجبور تو نہیں کہ بات بات پر آنسو بہانے بیٹھ جائے۔ لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ عورت واقعی کمزور ہے۔ میں یہاں کیوں آ گئی؟ یہاں میرا کیا کام؟ بیٹی کو ایک بار پھر اس کے مرد کے حوالے کر دیا۔ اسے قابو میں رکھنے کے لیے وہ لڑتی کیوں نہیں؟ جیسے اس نے اپنی ماں کے منہ پر تھپڑ مارا، اسی طرح اپنا حق چھیننے والے کے منہ پر بھی لگا سکتی ہے لیکن اس کی ماں اس کی سوت ہرگز نہیں۔ یہ اس کی بھول ہے۔

یہ سوچ کر مجھے کچھ تسکین سی ملی۔ سروج نے اپنے مرد کے لیے لڑنے کی خاطر پہلا تھپڑ اپنی ماں کے منہ پر مارا ہے۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے اندر کا درد کچھ کچھ کم ہوتا محسوس ہوا۔ میرے آنسو بھی تھم گئے۔ میں نے سسکنا بند کر دیا۔ ڈوپٹے سے چہرہ پونچھ ڈالا۔ کئی گھنٹوں کے بعد آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا۔ تھوڑی تھوڑی روشنی باہر سے آ رہی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ میرے سامنے پلنگ پر وہ تینوں ایک ہی رضائی میں دبکی پڑی تھیں۔ اشوک ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ اس عورت کو میں پھر نہیں دیکھنا چاہتی۔

میں نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چپکے سے چوروں کی طرح کوئی آہٹ کیے بغیر میں باہر آ گئی۔ باہر آ کر یوں لگا جیسے طویل قید سے رہائی ملی ہے۔ چھ بج چکے تھے۔ آج بھی کہرا چھایا ہوا تھا۔ اشوک نہیں آیا لیکن میں خود اسٹیشن پر پہنچ سکتی ہوں۔

میرے قدم اسٹیشن کے بجائے اُن کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔ ایسا نہ چاہتے ہوئے بھی میں اسی سمت میں بڑھتی گئی۔ نیم ارادہ، نیم رضامند۔ بار بار یہی سوچ کر من کو ورغلاتی گئی کہ ان کے گھر کے سامنے سے ہو کر سیدھی نکل جاؤں گی۔ وہاں ہرگز نہیں رکوں گی۔ کوئی دکھائی دے گا تب بھی نہیں۔

مجھے یاد آیا سروج جب چار سال کی تھی، میرا کہنا نہیں مانتی تھی۔ بار بار فراک اُٹھا کر منہ میں ڈال لیتی۔ یہ بات مجھے بہت بری لگتی۔ اسے کتنا منع کیا، دھمکایا اور مارا بھی لیکن وہ بھی بہت ضدی تھی۔ ناچار اُس کے ساتھ میں نے بولنا چھوڑ دیا۔ اس سے روٹھ سی گئی۔ کتنی دیر تک اسی طرح روٹھی روٹھی پھرتی رہی۔ اس نے پہلے تو اس بات کو قطعاً محسوس نہ کیا لیکن پھر سمجھ گئی۔ اپنے ننھے ننھے قدموں سے میرے پیچھے پیچھے گھومنے لگی۔ لیکن یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کب تک اس سے روٹھی رہوں گی؟ بیچاری کو منانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اُس نے دو تین گھنٹے سے منہ سے فراک نہیں پکڑا ہے تو مسکرا کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس سے آئندہ ایسا کبھی نہ کرنے کا وعدہ بھی لے لیا۔

گھر کے سامنے پہنچ کر جی چاہا ذرا سا اندر جھانک بھی لوں۔ اُن کے دروازے ابھی تک بند کیوں پڑے ہیں؟ صبح تو ہو چکی۔ اس وقت دونوں ہی بیڈ ٹی پینے کے عادی ہیں۔ کون چائے بنا رہا ہو گا۔ سروج یا اشوک؟

پھاٹک کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلا تھا میں اندر چلی گئی۔ برآمدے میں بہت سی کراکری ٹوٹی پڑی تھی۔ کئی اور چیزیں بھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل پھر ڈوبنے لگا۔ مکان میں گہری خاموشی تھی۔ جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو۔ سب چھوڑ کر چل دیے ہوں۔ ان کی خوابگاہ تک پہنچتے تک میرے پاؤں کے نیچے کئی چیزیں آئیں۔ ایک کھڑکی کھلی تھی جس پر دبیز پردہ پڑا تھا۔

میں نے بڑی بے صبری سے ہاتھ بڑھا کر پردے کو ذرا سا ہٹا دیا۔ کمرے کے اندر بھی ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ کپڑے، کرسیاں! لیکن وہ دونوں ایک ہی پلنگ پر ہاتھوں میں ہاتھ دیے گہری نیند سو رہے تھے۔ ●●●

تجسس ابھارنے والی بہترین فلمیں

ناظرین کو اپنے سحر میں جکڑ لینے والی یادگار فلموں کا دلچسپ قصہ

عالیہ احمد

ایک ایسی فلم جسے دیکھتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ تجسس یا سسپنس بڑھتا محسوس ہو، اسے بہترین تھرلر فلم قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی ہی کچھ تھرلر فلمیں ایسی ہیں جنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ حقیقت میں آپ کے ساتھ ایسا ہونا ممکن ہے یا یوں کہہ لیں کہ وہ اندر سے ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ ذیل میں ایسی بہترین سسپنس سے بھرپور فلموں کا تعارف پیش ہے جن کا جادو طویل عرصے تک آپ کا احاطہ کیے رکھے گا۔

دی یوزول سسپیکٹس (The Usual Suspects)

یہ پانچ مجرموں کی کہانی ہے جنھیں پولیس معمول کی تفتیش کے دوران اکٹھا کرتی ہے۔ پھر وہ اکٹھے ہو کر ایک ڈکیتی کا منصوبہ بناتے ہیں اور پولیس کو انہیں روکنا ہوتا ہے۔ کیون اسپائسی کے یادگار کردار نے اسے ہر دور کی بہترین تھرلر فلموں میں سے ایک بنا دیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے ہر لمحہ یہ اندازہ لگاتے ہوئے گزرتا ہے کہ آگے کیا ہوگا جبکہ پوری فلم کے دوران دیکھنے والا نشست کے کونے پر بیٹھا رہتا ہے اور آنکھیں کہیں اور پھیر نہیں پاتا۔

ریئر ونڈو (Rear Window)

جب ایک چلنے پھرنے سے معذور فوٹو گرافر اپنے

پڑوسیوں کی جاسوسی کرنے لگتا ہے تو کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی زندگی مکمل طور پر بدل کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اسے لگتا ہے کہ اس کے سامنے والے فلیٹ میں رہنے والے شخص نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ اس خیال پر یقین بھی نہیں ہوتا مگر تناؤ چین بھی نہیں لینے دیتا، اور یہ سب دیکھنے والوں کے اندر بھی بے چینی دوڑا دیتا ہے۔

ورٹیگو (Vertigo)

الفریڈ ہچکاک کی ایک اور مسٹری فلم جس میں سان فرانسسکو کے ایک ریٹائرڈ سراغ رساں کو اپنے ایک پرانے دوست کی بیوی کی عجیب سرگرمیوں کی تفتیش کے دوران مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے بھی کلاسیک کا درجہ حاصل ہے جبکہ مسٹری فلموں کے شائقین کی نظر میں تو یہ ہر دور کی سب سے بہترین فلم سمجھی جاتی ہے۔

شٹر آئی لینڈ (Shutter Island)

ڈائریکٹر مارٹین اسکورسیز کی یہ سائیکولوجیکل تھرلر فلم لیونارڈو ڈی کیپریو کی بہترین فلموں میں سے ایک ہے۔ اس کی کہانی کے لیے 2003ء میں شائع ہونے والے ڈینیس لیہانے کے اسی نام کے ناول کا انتخاب کیا گیا۔ اس فلم میں لیونارڈو نے ایک یو ایس مارشل کا کردار ادا کیا تھا جو شٹر آئی لینڈ کے سائیکاٹرک ادارے کی تفتیش کرتا ہے۔

فائٹ کلب (Fight Club)

ایک عام شخص کی ملاقات صابن بیچنے والے سیلز مین سے ہوتی ہے اور ان کے درمیان ایک پیچیدہ تعلق اس وقت قائم ہوتا ہے جب وہ ایک دوسرے سے لڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ناول پر بننے والی بہترین فلم ہے جس کو دیکھتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بظاہر ایک عام سی کہانی تجسس سے کتنی بھرپور ہے، یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

مول ہولینڈ ڈرائیو (Mulholland Drive)

رائٹر اور ڈائریکٹر ڈیوڈ لنچ کی اس فلم کو بی بی سی نے 21 ویں صدی کی اب تک کی سب سے بہترین فلم قرار دیا ہے۔ یہ ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ کی کہانی پر مبنی ہے جو نئی نئی لاس اینجلس آتی ہے۔ وہاں اس کی دوستی بے خوابی کی شکار خاتون سے ہو جاتی ہے، جس کے بعد ایک دلچسپ کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

دی پریسٹیج (The Prestige)

دو جادوگروں کی ایک دوسرے سے رقابت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مخالف سے زیادہ بہتر جادوئی کرتب تیار کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور ایسا بصری دھوکا دینا چاہتے ہیں جو لوگوں کو دنگ کر دے۔ 2006ء کی یہ فلم ایک ایسی کہانی ہے جو حقیقت اور اسٹیج کرافٹ کے درمیان موجود لکیر کے حوالے سے سوالات ذہن میں پیدا کرتی ہے۔ ان کی تلاش میں پھر اسے دیکھنا مجبوری بن جاتا ہے۔

گون گرل (Gone Girl)

یہ کہانی ایک جوڑے کے گرد گھومتی ہے جس میں بیوی اچانک کہیں غائب ہو کر میڈیا کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ پولیس اور میڈیا کا شک شوہر پر جاتا ہے اور یہ سوال کیا جانے لگتا ہے کہ کیا اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے؟ یہیں سے کہانی مختلف پیچ و خم کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور دیکھنے والوں کی توجہ ایک لمحے کے لیے اسکرین سے ہٹنے نہیں دیتی۔

زوڈک (Zodiac)

یہ ایک مسٹری تھرلر فلم ہے جو 1986ء کی ایک نان فکشن ناول ہر مبنی ہے۔ اس میں ایک قاتل زوڈک کی تلاش کو دکھایا گیا ہے جو سان فرانسسکو کے علاقے بے ایریا میں 1960ء اور 70ء کی دہائی میں قتل کرتا تھا۔ اس دوران وہ خطوط کے ذریعے پولیس پر طنز کرتا رہا۔ اس فلم کی ہدایات ڈیوڈ فنچر نے دیں جبکہ اسکرین پلے جیمز وینڈربیلٹ نے تحریر کیا۔

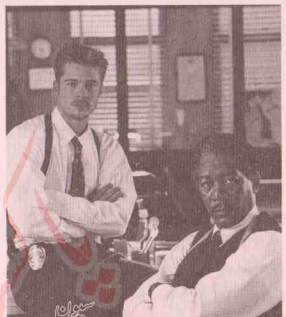

پریزنرز (Prisoners)

جب پولیس کیلر ڈوور نامی شخص کی بیٹی اور دوست کو تلاش کرنے میں ناکام رہتی ہے تو وہ خود انہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ تھرلر فلم دیکھنے والوں کے درمیان کسی بدترین خبر کا تناؤ پیدا رکھتی ہے جبکہ کہانی اتنی روانی سے آگے بڑھتی ہے کہ دیکھنے والا کھو کر رہ جاتا ہے۔ بہترین اداکاری اور بیک گراؤنڈ اسکور نے اسے دیکھنے کے لائق فلم بنا دیا ہے۔

کیپ فیئر (Cape Fear)

جیل سے رہا ہونے والے ریپ کا مجرم اپنے وکیل کے خاندان کو تنگ کرتا ہے کیونکہ اس کا ماننا ہوتا ہے کہ وہ اپنے وکیل کی وجہ سے ہی پکڑا گیا تھا۔ یہ فلم دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شکاری ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے، ولن کی اداکاری اتنی فطری ہے کہ بہادر ترین افراد کو بھی کانپنے پر مجبور کردے۔ ڈائریکٹر ناظرین کو پوری فلم میں کہانی میں گم رکھتا ہے اور آخر میں ایسا ذہن گھما دینے والا گھونسا لگتا ہے کہ دیکھنے والا اہل کر رہ جاتا ہے۔

دی گیم (The Game)

ایک ایسے انتہائی امیر شخص کی کہانی ہے جو سان فرانسسکو کا بینکر ہوتا ہے۔ مگر بہت زیادہ تنہا ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنی سالگرہ بھی اکیلے مناتا ہے۔ اس کی 48 ویں سالگرہ پر اس کا طویل عرصے سے غائب بھائی اچانک واپس آتا ہے اور اسے ایک تحفے کے طور پر ایک جگہ کا کارڈ دیتا ہے۔ وہاں جانے پر مرکزی کردار کو عجیب و غریب اور پُراسرار واقعات کا سامنا ہوتا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ایل اے کانفیڈنشل (LA Confidential)

ایک ناول پر مبنی اس فلم میں لاس اینجلس شہر کے پولیس اہلکاروں کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں تجسس، مسٹری اور سسپنس عروج پر ہے۔ وہ قتل کے مختلف واقعات کی تحقیقات کرتے ہوئے غیر متوقع موڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تینوں پولیس اہلکاروں کا اپنا ایجنڈہ ہوتا ہے جس سے وہ تفتیش کرنا چاہتے ہیں، بلی چوہے کے اس کھیل میں سچ کہیں گم ہو جاتا ہے۔

میمینٹو (Memento)

اگر تو آپ کو تجسس بڑھانے والی فلمیں پسند ہیں تو یہ کسی تحفے سے کم نہیں مگر اسے دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی پوری توجہ اس پر مرکوز ہے کیونکہ اس میں دو مختلف سیکونس چلے رہے ہوتے ہیں۔ ایک بلیک اینڈ وائٹ جس میں ماضی کا احوال ہوتا ہے جبکہ دوسرا کلر سیکونس جو حال سے پیچھے کی جانب جاتا ہے۔ یہ دونوں سیکونس اختتام پر ملتے ہیں اور صحیح معنوں میں ذہن گھما دینے والی کہانی سامنے آتی ہے۔

سیون (Seven)

اگر یہ کہا جائے کہ یہ فلم چند بہترین مسٹری اور تھرلر فلموں میں سے ایک ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس میں بریڈ پٹ اور مورگن فری مین نے مرکزی کردار کیے ہیں۔ یہ پولیس کے دو اہلکاروں کی کہانی ہے جو ایک سیریل کلر کی تلاش کررہے

ہوتے ہیں۔ فلم کا اختتام ایسے ٹوئیسٹ پر ہوتا ہے جسے آپ طویل عرصے تک بھول نہیں سکیں گے۔

سائیکو (Psycho)

الفریڈ ہچکاک کی یہ فلم ہوسکتا ہے کافی پرانی لگے مگر اس کی کہانی آپ کو بالکل بھی بیزار نہیں ہونے دے گی۔ بلکہ اس کا اختتام ایسا ہے جس کی توقع آپ کو کبھی نہیں ہوگی۔ یہ فلم ایک موٹیل کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک لڑکی پہنچ کر غائب ہوتی ہے۔ اس کے بعد لڑکی کی بہن اور بوائے فرینڈ اس کی تلاش شروع کرتے ہیں جس کے بعد کہانی میں یکے بعد دیگرے غیر متوقع موڑ آنے لگتے ہیں۔

دی سائیلنس آف دی لیمبز
(The Silence of the Lambs)

ایک ایف بی آئی ایجنٹ ایک سیریل کلر کو پکڑنے کے لیے ایک سابق سیریل کلر سے مدد طلب کرتی ہے۔ بلی چوہے کے اس کھیل میں ایجنٹ کو سابق سیریل کلر پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اس کیس کو حل کردے گا، مگر جو کچھ ہوتا ہے، وہ توقع کے خلاف ہے۔

دی سکستھ سنس (The Sixth Sense)

اگر آپ نے اس فلم کو نہیں دیکھا تو ایک بار ضرور دیکھ لیں، وہ ہوسکتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک آپ کو دلچسپ تو لگے مگر اسے بہترین قرار دینا مشکل ہو۔ مگر جب اس کا اختتام ہوتا ہے تو آپ کے لیے یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ فلم کی کہانی کو سمجھا بھی تھا یا نہیں۔ ہم اختتام تو نہیں بتاتے مگر 1999ء کی یہ فلم ایک ماہر نفسیات اور بچے کے گرد گھومتی ہے جو مردوں کو دیکھنے اور بات کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

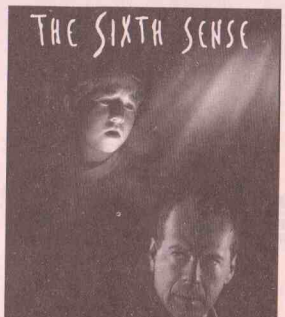

گون بے بی گون (Gone Baby Gone)

جب ایک چار سالہ بچی اپنے گھر سے غائب ہو جاتی ہے تو پولیس کو یہ کیس حل کرنے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اس پر بچی کی آنٹی دو پرائیویٹ جاسوسوں کی خدمات

حاصل کرتی ہے، جن کو اس طرح کے کیسز کی تفتیش کا کوئی خاص تجربہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر متاثرہ خاندان دو وجوہ کی بنا پر ان کی خدمات چاہتی ہے، ایک تو وہ پولیس والے نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ بوسٹن کے خطرناک علاقوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے کیس آگے بڑھتا ہے، کہانی کی پیچیدگی بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اختتام چونکا کر رکھ دیتا ہے۔

پرائمل فیئر (Primal Fear)

یہ ایک عدالتی تھرلر ہے جس میں تجسس و سسپنس عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ ایک وکیل کی کہانی ہے جو ایسے نوجوان کی وکالت کرتا ہے جس پر ایک پادری کو قتل کرنے کا الزام ہوتا ہے۔ اس مقدمے کو کوئی وکیل لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا کیونکہ بظاہر اس میں ناکامی یقینی نظر آتی ہے۔ مقدمہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے، چرچ کے تاریک راز سامنے آنے لگتے ہیں اور ایک سادہ کیس اچانک تاریک اور انتہائی خطرناک بن جاتا ہے۔ ◆◆◆

افسانہ کہیں جسے

منیر احمد شیخ

وہ کل راستے میں مجھے ملا اور چھوٹتے ہی بولا:

''برسوں سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ مجھے آپ کی بڑی تلاش رہی۔''

''خیریت تو ہے؟'' میں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے تو خیریت ہی ہے۔ آپ کو افسانے لکھنے کا شوق ہے۔ میں آپ کو ایک ایسی بات سنانا چاہتا ہوں جو افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ آپ کو حقیقت سے بھی کوئی دلچسپی ہے؟''

''اس حد تک جس حد تک وہ افسانے کا موضوع بن سکے۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن افسانہ، افسانہ ہوتا ہے اور حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

''مطلب یہ ہے کہ حقیقت تو واردات ہوتی ہے، سنگین واقعہ کی طرح سخت جسے آپ دیکھتے، محسوس کرتے اور تجربہ کرتے ہیں اور افسانہ ...؟ میں کیا عرض کروں آپ بہتر جانتے ہیں کہ افسانہ کیا ہوتا ہے۔''

انسانی حیات اتفاقات کا مجموعہ نہیں بلکہ کاتبِ تقدیر بڑے حسنِ تدبر سے خیال کو حقیقت میں ڈھالنے کی قدرت رکھتا ہے

''حقیقت اگر سچ ہے تو افسانہ سب سے بڑا سچ ہے۔ حقیقت افسانے کی نچلی سطح ہے۔ اگر آپ محض نچلی سطح پر ہی رہنا قبول کرلیں تو افسانے تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔''

وہ یہ بات سن کر قدرے تذبذب میں پڑ گیا۔ پھر کہا کہ ''تو فلسفے کی بات آپ نے شروع کردی۔ سڑک پر یہ گفتگو نہیں ہوسکتی۔ آیئے سامنے ریستوران میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ چائے کی ایک پیالی بھی ہوجائے گی۔ ہم دونوں ریستوران میں جا بیٹھے اور چائے ہمارے درمیان تھی۔

''ہاں تو اب کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔''

''کہنا کیا چاہتا ہوں یہ تو مجھے پتا ہے مگر آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ میں آپ کے جواب میں فیصلہ صادر کروں گا۔ فلسفے اور ادب میں فیصلے صادر نہیں ہوا کرتے۔''

''تو پھر فیصلے کہاں صادر ہوتے ہیں؟''

''اس حقیقی دنیا میں جس کا ذکر آپ کر رہے، لیکن باوجود اس بات کے یہ فیصلے شروع دنیا سے دیے جارہے ہیں۔ کوئی فیصلہ ایسا نہیں جو حتمی ہو۔ جو فیصلہ آج ہوتا ہے کل اُس سے مختلف فیصلہ ہوجاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آخری سچائی کا کہیں کوئی سراغ نہیں۔''

''تو پھر سچائی افسانوں میں کیسے مل جاتی ہے۔''

''افسانہ اور کہانی آخری سچائی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ یہ واقعہ وقت کا پابند ہے مگر افسانہ وقت کی قید سے آگے نکل جاتا ہے۔ دیکھیے نا آدمی مرجاتا ہے۔ یعنی ایک حقیقت اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے مگر وہ زندگی جو آدمی نے گزاری، اس کی کہانی باقی رہ جاتی ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہوا، جو باقی رہ جاتا ہے وہ کہانی ہے۔''

''جی ہاں اور باقی رہنا اللہ کی صفت ہے اور کہانی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔''

''اور پھر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک کہانی ایسی ہے جو مسلسل لکھی جارہی ہے اور ابھی تک اس کے اختتام کا انتظار ہے اور جو آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔''

''کون سی کہانی ہے جو ختم ہونے پہ نہیں آرہی۔''

''یہ کہانی دنیا کی کہانی ہے لیکن ابھی تک نامکمل ہے۔''

''یہ مکمل کیوں نہیں ہورہی۔ کیا اس کے پلاٹ بنانے والے کے ذہن میں اس کا کوئی انجام نہیں۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔ جو کہانی شروع کرے، وہ اسے کہیں نہ کہیں ختم بھی کرتا ہے مگر وہ لوگ جو اس کہانی کے کردار ہیں وہ دلچسپ چیز ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی خاکہ بناتے ہیں، پھر اسی کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ زندگی اس خاکے کے مطابق بسر ہو مگر ہوتا یہ ہے کہ خاکہ کچھ بنتا ہے اور زندگی اس خاکے کے بالکل برعکس بسر ہوجاتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ انسان کے ساتھ لطیفے ہوتے رہتے ہیں۔''

میں اس سوال پہ ہنس دیا اور کہا:

''لطیفے سمجھ لیجیے لیکن یہ بات ہے کہ حقیقت اور افسانہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حقیقت کا وجود نہ ہو تو افسانہ نہیں بنتا۔ جہاں افسانہ نہیں بنتا وہاں لطیفہ رہ جاتا ہے۔''

''لیکن میں جو آپ کو دو روز سے ڈھونڈ رہا ہوں، میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اس حقیقت کا افسانہ بنالیں۔ لیکن بہرحال یہ ہے ایسی حقیقت جو میں اُگل دینا چاہتا ہوں۔ میں اس کا افسانہ بنا سکتا تو ضرور بناتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں جھوٹ سچ ڈال کے اس کی کہانی بنالیں گے۔''

''جھوٹ سچ مت کہیے۔ افسانے میں جو بات جھوٹ نظر آئے وہی تو اس کی سچی بات ہوتی ہے۔ اگر افسانوی سچ کا وجود نہ ہوتا تو کوئی آدمی دنیا میں خاکہ ہی نہ بنا سکتا۔ اچھا تو بیان فرمائیے۔''

میرے کہنے پر کہ بیان فرمائیے، اس نے گہرا سانس لیا اور کہا:

''یہ حادثہ میری زندگی میں مجھ پر گزر رہا ہے۔ لوگوں سے ذکر کرتا ہوں تو کوئی اس پر یقین نہیں کرتا۔ پھر میں نے سوچا کہ افسانہ نگار سے اس کا ذکر کرنا چاہیے۔ وہ اسے ضرور مان لے گا۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جو بات دنیا والے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں افسانہ کہنے والے اس پہ یقین کر لیں گے۔ جب کوئی یقین کرنے والا آس پاس نہیں رہا تو میں نے آپ سے ملنے کا سوچا۔ بات یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس بیسویں صدی میں کسی ایسی بات کا یقین نہیں کرتے جس کو عقل ماننے سے انکار کر دے۔

''میری عقل مجھ سے کہتی ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ چاند گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ یہ اپنے اپنے محور کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کے راستے متعین ہیں اور یہ اتنی زبردست سائنس ہے جو کسی بہت اعلیٰ و ارفع عقل نے بنائی۔ بالکل اسی انداز پر انسان کی زندگی ہے۔ انسان جو بھی کام کرتا ہے اس میں انسانی سوچ اور پلاننگ شامل ہوتی ہے۔ زندگی بڑی ''دو ضرب دو'' قسم کی چیز ہے۔ اس میں معجزے نہیں ہوتے، کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی کہ جس کے لیے آپ نے کچھ نہیں کیا مگر وہ ہو جائے۔

''میری اپنی مثال ہی لیجیے۔ ایک غریب مزدور کے گھر پیدا ہوا۔ بڑا ہوا تو پتا چلا کہ محنت کروں گا تو دنیا میں روٹی کھانے کے قابل ہو سکوں گا۔ امتحان دیے...... اسکولوں کے امتحان، کالجوں کے امتحان، یونیورسٹیوں کے امتحان اور ملازمتوں کے امتحان۔ ان امتحانوں میں سے جب نکلا تو مجھے ایک ملازمت مل گئی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ملازمت کے پیچھے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے سب سے بڑا سبب میری محنت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ محنت کبھی ضائع نہیں ہوا کرتی۔

''البتہ کچھ کہانیاں پچھلے کچھ عرصہ میں ایسی بھی پڑھیں جن کے پڑھنے سے یہ پتا چلتا تھا کہ محنت کبھی کبھی بالکل ضائع بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے اس پر بہت سر مارا کہ محنت نے اگر ضائع ہو جانا ہے تو پھر وہ کی ہی کیوں جاتی ہے۔ اس کا جواب میری عقل سے نہیں ملا۔ میں بہت پریشان رہا۔ اپنی زندگی کی ساری گتھیاں عقل کے راستے سے سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یہ سارے افسانے جھوٹ لگے جن میں خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ باتیں لکھی ہوئی تھیں تا آنکہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔

''میں ان دنوں ایک دفتر میں ملازم تھا۔ ہر روز صبح صبح مجھے دفتر پہنچنے کے لیے ایک بارونق سڑک پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ میرے پاس ان دنوں فقط ایک سائیکل تھی جو میری واحد غمخوار تھی۔ ایک دن جب میں تیز تیز سائیکل چلاتے اس پررونق سڑک پر سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سڑک کنارے ایک لڑکی کتابیں بغل میں تھامے کھڑی ہے۔ غالباً کسی تانگے کے انتظار میں۔ اس وقت ابھی رکشا اور ٹیکسی نہیں چلا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری سائیکل کی رفتار سست پڑ گئی اور میرا جی چاہا کہ میں بریک لگا دوں۔ وہ ایسی تھی کہ دیکھتے ہی میرے جی میں اُتر گئی۔ سرخ و سفید چہرہ جس پہ عجیب تمکنت تھی اور آنکھوں میں اُداسی جھلکتی تھی۔''

''میں زیادہ کیا بیان کروں، آپ افسانہ نگار ہیں۔ کسی لڑکی کے حسن کو بیان کرنا آپ کا کام ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جب میری سائیکل اس کے قریب ہوئی تو وہ مجھے اتنی

اچھی لگی کہ بے اختیار میرے منہ سے یہ جملہ نکل گیا کہ یہ میری بیوی کیوں نہیں ہو سکتی؟ یہ جملہ زبان سے اس طرح ادا ہوا کہ میرے کانوں نے میرے جی کی خواہش کو سن لیا۔ میں چونکا کہ یہ کیا بات میں نے اپنے آپ کو سنا دی۔ اتنی دیر میں سائیکل اس لڑکی سے ایک فرلانگ آگے نکل آئی تھی اور دفتر کا گیٹ سامنے نظر آ رہا تھا۔''

''اس واقعے کو سات سال گزر گئے۔ ان سات برسوں میں مجھے پھر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ حالانکہ میں بھی اس شہر میں رہتا تھا اور اسی پُررونق سڑک سے دفتر جایا کرتا۔ آہستہ آہستہ یہ واقعہ ذہن سے بالکل اُتر گیا اور اُتر ہی جانا تھا کہ اس کی حقیقت بھی اتنی تھی کہ ایک اجنبی لڑکی سرِ راہ کھڑی وقت کی وقت اچھی لگی۔ پھر ایک خواہش نے جنم لیا اور وہ اگرچہ دل کی گہرائیوں سے اُٹھی تھی مگر فوری نوعیت کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتا نہیں وہ اجنبی کون تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی؟''

''پھر یہ بھی کہ وہ اتنی خوبصورت ہے تو ضرور اب تک اس کے خاندان میں کوئی شہزادہ اسے منتخب کر چکا ہو گا! میں اُسے اور وہ مجھے نہیں جانتی۔ صرف میں نے ہی اسے دیکھا تھا۔ اسے تو یہ خبر بھی نہیں ہوئی کہ کوئی اس کی طرف دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ کس نے دیکھا ہے کہ جی ہی جی میں کتنی بڑی خواہش دیکھنے والے جی میں مچل کے رہ گئی۔ اسے اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ میں حسبِ معمول اس دن دفتر میں کام کرتا رہا۔ واپس جب گھر لوٹا تو بس اتنا تھا کہ آج ذرا کی ذرا ایک بجلی سی آنکھوں کے سامنے کوندی اور ایک حسرت سینے میں تڑپ اُٹھی تھی۔ دوسری صبح یہ حادثہ ذہن سے اتر گیا۔''

''سات سال گزر گئے۔ سات سال کہنے کو بہت ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو پھر کہیں یاد آئی اور نہ کہیں نظر پڑی۔ ان سات سالوں میں دفتر جاتے ہوئے سرِ راہ سیکڑوں اور ہزاروں

حکمت کی باتیں

☆ تمہارے پاس اگر تمہاری پسندیدہ چیزیں نہیں ہیں تو موجود چیزوں کو ہی پسند کر لو۔

☆ روزی اگر عقل سے حاصل کی جاتی تو دنیا کے سارے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔

☆ دوسروں کا مزاج چاہے تمہیں پسند آئے یا نہ آئے، اپنا اچھا مزاج چھوڑنا نہیں چاہیے۔

☆ خود کو سنوارنے اور اپنی زندگی بہتر بنانے میں اس قدر مگن ہو جاؤ کہ دوسروں پر تنقید کے لیے آپ کے پاس وقت نہ ہو۔

لڑکیاں نظر آتی رہیں مگر کسی کو دیکھ کر پھر یہ جملہ بے اختیار میری زبان پہ نہ آیا کہ ان میں سے کوئی لڑکی ''میری بیوی کیوں نہیں بن سکتی۔'' جیسے یہ جملہ صرف اسی لڑکی کے لیے تھا جو ایک صبح سڑک کنارے کھڑی تھی اور جس کی آنکھوں میں اداسی جھلکتی تھی۔''

''تو صاحب سات سال بیت گئے۔ اتنے عرصے میں تو ہم نے پاکستان بنا لیا تھا۔ خاصا عرصہ ہوتا ہے سات سال۔ اس دوران میں دو ملازمتیں چھوڑ کے تیسری جگہ ملازم ہو گیا۔ ملک کے حالات بھی کافی بدل چکے تھے۔ سات سال پہلے لڑکیوں کی شادی ہونے لگتی تھی تو ماں باپ یہ بھی نہ پوچھتے کہ میاں کیا تنخواہ لیتے ہو؟ کوئی نیک، سادہ سا کھانے کمانے والا لڑکا نظر آ جاتا تو اللہ کا نام لے کر لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دیتے اور شادی ہو جاتی۔ ان سات برسوں میں یہ فرق پڑ گیا کہ اب ماں باپ تو گُجا لڑکی خود سب سے پہلا یہ سوال کرتی کہ یہ صاحب جو مجھ سے شادی فرمانا چاہتے ہیں ان کی پہچان اور کریکٹر کیا ہے؟ چنانچہ لڑکے اپنی جوانی کیریکٹر کی نذر کرتے اور پھر شادی کا نام لیتے۔''

''معاف کیجیے میں کیا بات کر رہا تھا اور کہاں بھٹک گیا۔ میں یہ بتلا رہا تھا کہ سات سالوں میں زمانہ بڑا بدل گیا اور میں اپنی تیسری ملازمت چھوڑ کے ایک اور شہر میں چوتھی ملازمت پہ آ گیا۔ یہ شہر بڑا ٹھنڈا اور اداس تھا۔ یہاں آ کر میں زیادہ اداس رہنے لگا مگر نوکری کا قصہ تھا۔ جگہ ویران ہو یا اداس اگر وہاں سے رزق ملے تو وہی بہتر ہوتی ہے۔ اے مجبوری سمجھ لیجیے یا کچھ اور مگر واقعہ یہی ہے کہ جس جگہ پر رزق لکھا گیا ہو، اُسے بُرا نہیں کہنا چاہیے۔''

اچانک اس نے پوچھا: ''آپ میری باتوں سے کہیں بور تو نہیں ہونے لگے؟''

میں نے کہا: ''ہرگز نہیں۔''

اُس نے بیرے کو بلایا اور کہا کہ خالی پیالیاں اُٹھا کے لے جاؤ اور نئی چائے لے کر آؤ۔ تھوڑی دیر بعد مزید چائے آ گئی۔ اس نے چائے کی پیالی اُٹھائی اور چسکیاں بھرنے لگا۔

میں نے کہا: ''بیان جاری ہے۔''

اس نے چائے پیتے ہوئے کہا: ''ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ مجبوری تھی اور اس شہر میں اب ہر حال میں رہنا تھا۔ اکیلے رہتے رہتے جب میں بے حد ویران ہونے لگا تو میں نے کہا آخر یہاں بھی تو آدمی بستے ہیں۔ دوست بنانے چاہئیں۔ وقت کٹنے کا کوئی تو بہانہ ہو۔ ایسے تو اکیلے مر جائیں گے اور کمیٹی والے لاش کو ٹھکانے لگاتے پھریں گے۔''

''میں نے لوگوں سے ملنا شروع کر دیا۔ ایک شخص مجھے شکل سے ہی بڑا اچھا لگا۔ میں نے سوچا کہ اس سے دوستی ہونی چاہیے۔ میں دوستی کے معاملے میں شکل کا بڑا قائل ہوں۔ بعض لوگ مجھے پہلی نظر ہی میں شکل سے زہر لگتے ہیں اور میرا ان سے کلام کرنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ یہ جی چاہتا ہے انھیں ماروں۔ خیر تو وہ آدمی جو مجھے شکل سے بھا گیا تھا، بڑا گداز اور ملائم آدمی نکلا۔ اس نے مجھے گھر پہ آنے کی دعوت دی۔ ہم سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے رہے۔''

''پتا چلا کہ سیاست اس آدمی کا سب سے پسندیدہ موضوع ہے۔ اس کی بیوی اس عرصے میں جمائیاں لیتی رہی۔ میں نے درمیان میں دو ایک مرتبہ موضوع بدلنے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی بات چھیڑی جائے کہ وہ نیک بخت بھی اس میں شریک ہو سکے لیکن میں اور اس کی بیوی، دونوں کوشش کے باوجود بھی موضوعِ گفتگو نہ بدل سکے۔ جب بھی کوئی بات موسم یا بچوں کی شروع ہوتی تو وہ سیاسی آدمی بیچ میں بول اُٹھتا۔ ''اچھا تو اور سنایئے، کشمیر ہمیں مل رہا ہے یا نہیں۔''

''میں ایسے سوال کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ لیکن وہ اصرار کرتا، بھائی صاحب کچھ تو بتلایئے۔ بیس برس ہونے کو آ رہے ہیں۔ تخت یا تختہ کچھ تو ہو۔ میں اس کا جواب دینے کے بجائے اس کی بیوی کی طرف متوجہ ہوتا اور کہتا، ہاں تو آپ سنایئے، بچے کو اسکول میں داخل کب کروا رہی ہیں۔ وہ ابھی اس کا جواب دینے ہی لگتی تھی کہ وہ بھلا آدمی بول اُٹھتا: ''او جی بچے اسکول میں داخل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کشمیر کا بتلایئے۔ کیا ہم اپنی زندگی میں بھی سری نگر جا سکیں گے۔''

''میں سری نگر جانے کے بجائے اس سے اجازت لے کے چلا آتا۔ ہر مرتبہ ایسے ہی ہوتا۔ وہ آخر میں ہمیشہ سری نگر کے بارے میں پوچھتا اور میں اس بات پر اجازت طلب کر لیتا لیکن اس کے باوجود جو چیز مجھے اس شخص کی پسند تھی وہ اس کی موسمی طبیعت تھی۔ گفتگو میں کوئی گہری سیاسی بات تو نہیں ہوتی تھی مگر اس شخص کا جوش و خروش اور کھُب کر بات کرنے کا پُرخلوص انداز مجھے بہت اچھا لگتا۔''

''میں کہاں سے کس طرف کو آن نکلا۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ مجھے ٹوک کیوں نہیں دیتے کہ میاں پٹڑی سے اُتر رہے ہو؟ معاف کیجیے، اب کے میں کوشش کروں گا کہ ادھر اُدھر کی کوئی بات نہ ہو۔ ہاں تو وہ میاں بیوی بڑے نیک، پیارے اور بھلے لوگ تھے۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ اس شہر میں ایک گھر تو ایسا ہے جہاں کچھ دیر بیٹھ کر میں اپنی اُکتا دینے والی تنہائی کو بھول سکتا ہوں۔ اچھا تو ایک روز کیا ہوا۔ سردیوں کی ایک شام جب میں اپنے آپ کو بھولنے کے لیے ان کے گھر گیا تو دیکھتا ہوں کہ ایک سرخ و سپید رنگ کی لڑکی ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک عجب تمکنت اس لڑکی کے چہرے پر تھی۔ مگر اآنکھوں میں اداسیاں تھیں۔

''مجھے یوں لگا جیسے یہ لڑکی ایک دم میرے جی میں اُتر گئی ہو۔ وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ یہیں کہیں رہتی ہے تو اس سے دوستی کی جائے۔ میرے دوست کی بیوی نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا: ''میری پیاری سہیلی ہیں۔'' سہیلی کا نام اس نے جان بوجھ کر نہیں بتلایا یا وہ بھول گئی۔ میں بھی تکلف میں نام پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں نے اس لڑکی کو سلام کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نروس ہو رہا ہوں۔

''میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔ یہ تو لونڈوں بالوں کا کام ہے جو زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی کو قریب سے دیکھتے ہیں تو ان کے ہوش سلامت نہیں رہتے مگر میری اس نصیحت کا مجھ پہ کوئی اثر نہ ہوا اور میں بدستور نروس ہوتا چلا گیا۔ اب سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس لڑکی سے کیا بات شروع کی جائے۔ موسم کا ذکر سب سے محتاط موضوع تھا۔ میں نے کہا: ''موسم بہت سرد ہو رہا ہے۔''

اس نے جواب دیا: ''جی ہاں۔''

پھر خاموشی اور سردی ہمارے درمیان آ گئی۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے پوچھا: ''سردی کا علاج آپ کیا کرتی ہیں؟''

''علاج! علاج تو ڈاکٹروں کے پاس ہوتا ہے۔ ہمیں جب سردی زیادہ لگے تو ہم لحاف اوڑھ لیتے ہیں۔ پھر بھی لگتی رہے تو انگیٹھی یا ہیٹر لگا لیتے ہیں۔''

''لیکن میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میں کچھ بھی جتن کر لوں میرے پیر لحاف میں بھی ٹھنڈے ہی رہتے ہیں۔''

وہ یہ سن کر زور سے کھلکھلا پڑی اور میں نے گھبرا کر جلدی سے اجازت مانگی اور وہاں سے ایک دم بھاگ نکلا۔ میں نے گھر پہنچنے کے بعد اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ کل سے اپنے دوست کے ہاں ہرگز نہیں جاؤں گا مگر جب دوسرے دن پھر شام آئی تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے خود ساختہ عہد کے باوجود اپنے دوست کے مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

بیٹھک میں داخل ہوا تو وہ وہاں موجود تھی۔ میرے دوست کی بیوی نے بتلایا کہ یہ آج واپس جا رہی ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا اور اس سے ایسے مخاطب ہوا جیسے کوئی اجنبی سے ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا: ''کہاں واپس جا رہی ہیں؟ میں تو سمجھتا تھا آپ اسی شہر میں رہتی ہیں۔''

اس نے کہا: ''نہیں میں تو صرف اپنی سہیلی سے ملنے یہاں آئی تھی۔ یہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ اس سے وعدہ کیا تھا کہ اب کے سردیوں میں کچھ دن تمہارے پاس گزارنے آؤں گی۔ سو وعدہ ہم نے پورا کر دیا۔ اب گھر کو واپسی ہے۔''

میں نے پوچھا: ''تو کیا گھر آپ کا یہاں نہیں۔''

اس نے کہا: ''نہیں۔ میں تو یہاں نہیں رہتی۔'' پھر اس نے اس شہر کا نام بتلایا۔

''اس شہر میں تو میں نے سات سال ملازمت کی ہے۔''

میں نے اسے اطلاع دیتے ہوئے بتلایا۔

''سات سال۔'' اس نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ''سات سال تو خاصا عرصہ ہوتا ہے۔ میں نے تو وہیں تعلیم حاصل کی اور اب وہیں ملازمت بھی کرتی ہوں۔''

یک لخت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میں

نے اس کے چہرے پر غور سے دیکھا تو مجھے یاد آنے لگا کہ یہ تو وہی لڑکی ہے جو ایک صبح سڑک کنارے بغل میں کتابیں دبائے غالباً کسی تانگے کا انتظار کر رہی تھی اور جسے دیکھتے ہی میرے اندر ایک خواہش نے جنم لیا تھا، پھر وہ خواہش آواز کی صورت میرے کانوں میں سنائی دی تھی۔ یہ تو وہی لڑکی ہے، سرخ و سفید رنگ، چہرے پر عجب تمکنت اور آنکھوں میں گہری اداسی۔ سات سال گزرنے کے بعد بھی اس کے اندر کی لڑکی اب بھی زندہ تھی۔ لیکن ملازمت سے وہ قدرے خاتون سی دکھائی دینے لگی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے ہاتھ پاؤں ایک دم سے یخ ہونے لگے ہیں۔

اس نے کہا: ''رات آپ نے بہت دلچسپ بات کہی۔ ہم دونوں دیر تک آپ کی سردی کا علاج سوچتی رہیں۔'' مجھے پسینہ آنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے کہا: ''تو کون سی دوا تجویز کی ہے آپ نے؟''

''دوا یہ تجویز کی ہے۔'' وہ رک گئی جیسے وہ کہنے سے ہچکچائی ہو۔

میں نے کہا: ''ہاں ہاں ضرور کہیے۔ میں برا نہیں مانوں گا۔''

اس نے کہا: ''یہ دوا میں نے اکیلے نہیں ہم دونوں نے مل کر تجویز کی ہے'' اور اپنی سہیلی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''کیوں ٹھیک ہے نا۔'' اس نے کہا: ''ہاں، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''تو حضور دوا یہ ہے کہ آپ کو فوراً شادی کر لینی چاہیے۔ لڑکی آپ جیسی کہیں گے ہم دونوں اس کو تلاش کرنے میں آپ کی مدد کریں گے۔ میری بہت اچھی اچھی سہیلیاں ہیں۔ آپ کو ان سے ملوایا بھی جا سکتا ہے۔ مگر پہلے آپ یہ مان لیں کہ آپ کی بیماری کا کوئی اور علاج نہیں۔''

''میں نے اپنے تئیں سوچا کہ یہ بہت معقول بات ہے۔ یہ دونوں سہیلیاں سمجھ دار اور پڑھی لکھی ہیں اور ان کی سہیلیاں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ مگر یہ دعوت مجھے بہت عجیب سی لگی۔ میں نے اسے کہا:

''اب شادی کروا کے کیا کرنا۔ کچھ گزر گئی ہے باقی بھی بیت جائے گی۔''

وہ فوراً بولی: ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ زندگی گزارنی ہی ہے تو ڈھنگ سے گزاریئے اور آپ کا علاج بھی صرف یہی ہے۔'' اس پر دونوں سہیلیاں پھر زور سے کھلکھلا پڑیں۔

میں پہلی شام سے بھی زیادہ نروس ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے دونوں مل کے مجھ پہ ہنسی ہیں۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ اس غصے میں، میں نے اس سے ایسا سوال کر دیا جو ہمارے یہاں نہیں کیا جاتا۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا:

''شادی اگر ہر بیماری کا علاج ہے تو آپ کیوں نہیں کرتیں؟''

''میری شادی؟ ہوں! میں نے تو عمر بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہی نہیں اور نہ ہی میں نے کبھی اس پر بھی سوچا ہے۔''

یہ بات مجھے بہت عجیب سی لگی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''دوسرے لفظوں میں آپ اپنے آپ سے بھاگ رہی ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا؟ مجھے بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ کی شادی کیوں نہیں ہونی چاہیے۔ یہ فرار ہے۔ آپ خوف زدہ ہیں اور اپنے اندر ہی پناہ لے رہی ہیں۔ اس خول سے ذرا باہر نکلیے اور دیکھیے کہ آپ کا ہاتھ تھامنے کو ہزاروں مچلتے ہوں گے اور جو علاج آپ نے میرے لیے تجویز فرمایا وہ آپ کا بھی ہے۔ بیماری ہم دونوں کی ایک جیسی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اس کا علاج باہر ڈھونڈتا پھرتا ہوں اور آپ اس کے لیے اپنے آپ میں پناہ لے رہی ہیں۔''

''میری باتوں کو اس نے غور سے سنا اور میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ فکر مند سا ہو گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر سفیدی کی جھلک بھی پہلی مرتبہ نمودار ہوئی۔ میں خوش تھا کہ میں نے اس کے اندر کا چور پکڑ لیا ہے مگر جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی:

''خیر چھوڑیے میرے قصے کو، میرا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ آپ مجھے جانتے نہیں، میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور میں اپنے فیصلوں کے جواز کسی کے آگے پیش نہیں کیا کرتی۔''

''میں خاموش ہو گیا۔ سردی اور خاموشی ایک مرتبہ پھر ہمارے درمیان پھیل گئی۔ اس نے کہا:

''تو کل میں واپس جا رہی ہوں۔ آپ کو اپنی بیماری سے دلچسپی ہو تو آ جایئے گا۔ میں اپنی ایک بڑی عزیز سہیلی سے آپ کو ملواؤں گی۔ نہایت سگھڑ، شائستہ اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ وہ جس کی بیوی بنے گی اس کی زندگی سنور جائے گی۔ آپ آیئے اور خود ہی فیصلہ کیجیے۔''

''میں نے وعدہ کیا کہ میں ضرور آؤں گا۔ اگر آپ کسی لڑکی کی اتنی تعریف کر رہی ہیں تو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ میں نے اجازت لی اور گھر چلا آیا۔ وہ واپس اپنے گھر چلی گئی اور میں رات بھر سوچتا رہا کہ یہ لڑکی اپنی شادی کی بات سے کیوں کترا رہی ہے؟ دیکھنے میں خوبصورت ہے، مذاق نہایت شستہ ہے، گفتگو میں گرم جوشی ہے۔ پھر اس نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں کر لیا؟ نہ جانے کیوں اسی وقت مجھے یہ خیال آیا کہ کاش یہ لڑکی اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ مجھ سے تو پوچھ لیتی۔ پھر خود ہی اپنی اس ناممکن خواہش پر ہنس پڑا۔

مسکرانا منع ہے

دیسے تو شادی خوشی کا موقع ہے مگر افریقی ملک کانگو میں اس کی اجازت نہیں۔ جی ہاں کانگو کی کچھ برادریوں میں ایک انوکھی روایت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ شادی کے موقع پر دلہا اور دلہن کو ہنسنا تو کیا مسکرانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی خصوصاً تصاویر لیتے وقت۔ یہ روایت ڈیڑھ روز تک چلنے والی شادی میں بہت مشکل ہوتی ہے کیونکہ اس کے دوران دلہا دلہن کو ہنسانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ خود پر کنٹرول اور شادی کے فیصلے میں سنجیدگی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

''اگلے دن میں نے اس کے دیے ہوئے پتے پر خط لکھا کہ آنے والی اتوار کو میں حسب وعدہ ضرور آؤں گا اور آپ کی سہیلی سے ملاقات ہو گی۔ آخر میں یہ جملہ میرے قلم سے بے اختیار نکل گیا کہ آپ واپس تو چلی گئیں مگر اپنی خوشبو یہاں چھوڑ گئی ہیں۔ یہ خوشبو میرے اردگرد چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دل کے قریب ایک گلاب کھلا ہے۔''

''اس کا جواب آیا کہ اگلی اتوار کو آپ ضرور آیئے۔ میں نے اپنی سہیلی سے وقت طے کر لیا ہے۔ خوشبو کے ضمن میں بس اتنا لکھا کہ اس خوشبو کے دھوکے میں نہ آیئے۔ اس کا وجود کوئی نہیں۔ ورنہ خواہ مخواہ پریشان ہوتے رہیں گے۔

''میں اگلی اتوار کو اس شہر میں پہنچا۔ اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنے گھر میں سب سے میرا تعارف کروایا اور کہا کہ یہی وہ صاحب ہیں جن کے رشتے کی بات میں اپنی سہیلی سے طے کر رہی ہوں۔ سب گھر والوں نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ خاص طور پر اس کی چھوٹی بہن کی آنکھ میں بہت شرارت تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر نہیں کہہ سکتی۔

جھاڑو سے کودنا

امریکہ کے انتہائی جنوب میں ایک انوکھی روایت ہے جھاڑو سے کودنا، جس کا مطلب ہے کہ نیا نویلا جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ دے کر جھاڑو کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرے جو ان کی نئی زندگی کے کامیاب ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی نمائش کی چیز ہوں۔ ایک عجیب الخلقت آدمی جسے سبھی دیکھ دیکھ کر متجسس ہو رہے ہیں۔ خیر وہ مجھے اپنی سہیلی کے یہاں لے گئی۔ شرارتی نظروں والی چھوٹی بہن بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اس کی سہیلی کے گھر والے پہلے سے منتظر تھے۔ تعارف ہوا۔ ہم گہرے صوفوں میں دھنس کر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی سہیلی واقعی ایسی تھی جیسا اس نے مجھے بتلایا۔ چہرے مُہرے ہی سے وہ سلیقہ مند، شستہ، سگھڑ اور ملائم دکھائی دی۔ باوقار اور حیادار لڑکی تھی اور باشعور بیوی بننے کی صلاحیتیں اس کے چہرے سے بخوبی ٹپکتی تھیں۔ تھوڑی دیر ہم بیٹھے، چائے پی اور چلے آئے۔ واپس تانگے پر آتے ہوئے اس نے مجھے پوچھا:

''تو کہیے، آپ کو پسند آئی میری سہیلی؟''

میں خاموش رہا۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا اس سوال کا کیا جواب دوں۔

''آپ چپ سے ہو گئے ہیں۔ کیا بہت ہی اچھی لگی آپ کو؟'' میں پھر بھی چپ تھا۔

''بولتے کیوں نہیں؟ پسند آئی ہے تو کہیے ہاں۔ نہیں پسند تو کہہ دیجیے پسند نہیں۔''

''میں کیا عرض کروں؟ وہ اچھی لڑکی ہے مگر کیا کروں کہ آپ سب سے اچھی ہیں۔''

وہ یہ جواب سن کر چپ ہو گئی۔ میں بھی چپ تھا۔ سارا راستہ ہم نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ جب تانگہ اس کے گھر کے سامنے رکا اور میں اُسے دروازے پر اُتار کے اجازت لینے لگا تو میں نے دیکھا کہ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ مجھ سے موڑ لیا۔ ایک آنسو ڈھلک کر اس کے عارض پہ بہ گیا۔ وہ فوراً اندر چلی گئی اور دروازہ زور سے بند ہو گیا۔

اس واقعے کے پورے دو مہینے بعد وہ میری بیوی بن کر میرے گھر آ گئی۔''

☆☆☆

چائے کی پیالی ایک بار پھر خالی ہو چکی تھی مگر اس میں سے ہلکا ہلکا دھواں اب بھی اُٹھ رہا تھا۔ بات ختم کرتے ہی اس نے کہا: ''آپ یقین نہیں کریں گے کہ اس زمانے میں اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ یہ واقعہ میرے ساتھ گزرا ہے۔ مجھے خود اب تک اس پر یقین نہیں آتا۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں، خواب ہے..... افسانہ ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ لڑکی جسے میں نے سرِ راہ ایک صبح بغل میں کتابیں دبائے کھڑے دیکھا، جو سرخ و سفید رنگ کی تھی، جس کی آنکھوں میں اداسی چھپی ہوئی تھی اور جسے دیکھ کر ایک موہوم سی خواہش میرے سینے میں تڑپ اُٹھی تھی کہ جس کا اتا پتا مجھے معلوم نہ تھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کس خاندان سے ہے؟ اب وہی لڑکی میری بیوی ہے۔ وہ جملہ جو میرے منہ سے یونہی نکل گیا تھا وہ میری خواہش تھی جواب حقیقت بن کر میرے گھر کے در و دیوار کو روشن کیے ہوئے ہے۔ میں نے یہ واقعہ آپ کو سنا دیا۔ حقیقت آپ کے سامنے ہے۔ آگے آپ کی مرضی..... چاہیں تو بے شک اس کا فسانہ بنا لیں۔''

ارم ناز

رمضان کی آمد پر شاپنگ مال کے اطراف میں چوڑیوں، مہندی اور کھانے پینے کی اشیاء کے ڈھیروں اسٹال لگے تھے۔ نئی، چمکتی دمکتی کار سے اُترتی، ہانیہ ان پر نگاہ دوڑاتی، دل ہی دل میں طے کرتی مال کی جانب جارہی تھی کہ کون سے اسٹال سے کیا چیز لینی ہے؟ جونہی وہ شاپنگ مال کی سیڑھیاں چڑھتی اندر داخل ہوئی، اس نے لپلپائی نظر تمام دکانوں پر ڈال کر اطمینان کی سانس لی، کیونکہ سیل ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

ہر طرف ''سیل..... سیل'' کے بورڈ آویزاں دیکھ کر اسے دلی خوشی ہوئی، اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ عید کے لیے کپڑے، جوتے، میک اپ اور زیورات کے ڈھیر لگالے، ویسے بھی ہر دکان نے سیل لگائی تھی تو وہ جو چاہے سستے داموں لے سکتی تھی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور کپڑوں کی ایک مشہور دکان میں گھس گئی۔ دکان میں داخل ہوتے ہی سیل مین اس کے اردگرد پھرنے لگے۔ جب وہ دکان سے باہر آئی تو اس کے پاس شاپنگ بیگوں کا انبار تھا، جو مشکل سے اُٹھائے جا رہے تھے۔ اس نے فون کر کے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور تمام بیگ اسے تھما کر اگلی دکان میں داخل ہوگئی۔ اس دکان سے باہر برآمد ہوئی تو جوتوں کے آٹھ دس جوڑے اُٹھائے سیل میں ڈرائیور کا منتظر تھا، جو اس سے لے کر گاڑی میں رکھنے چلا گیا۔

اس طرح ہانیہ نے پورے شاپنگ مال کی ہر دکان کھنگال ڈالی اور دو چار لاکھ اُڑا کر جب وہ مال سے باہر نکل رہی تھی تو ہر کوئی اسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے، اب اس کی نظر اردگرد لگے اسٹالوں پر تھی کہ اچانک.....

دھڑام..... دھم..... کی آواز سے حوریہ آپی نے فوراً اُٹھ کے دیکھا تو ساتھ سوئی ہوئی ہانیہ بیڈ سے نیچے گری ٹکر ٹکر تکے جا رہی تھی۔

''یہ میں کہاں ہوں؟ وہ میرے سارے شاپنگ بیگ کہاں گئے؟''

حوریہ آپی (کھلکھلا کے ہنس پڑیں) ''کون سے بیگ؟ لگتا ہے، آج پھر کوئی خواب دیکھ رہی تھی''۔

کیا! یہ بھی خواب تھا..... اوہو!!

ہانیہ (منہ بسورتے اور کمر سہلاتے ہوئے بولی) آپی! اس بار میں عید پہ پھر پرانے کپڑے پہنوں گی کیا؟ کاش ہم بھی ڈرامے والی ہیر وئنوں کی طرح امیر ہوتے یا پھر ہمارے ابا بھی مزدور ہونے کے بجائے بڑے کاروباری ہوتے تو ہم یہ ٹھاٹھ باٹھ اور بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر اٹھلاتے پھرتے۔''

''شیخ چلی بننا چھوڑو اور جاکے اپنا نیا سوٹ پہن کے بتاؤ کہ ٹھیک ہے یا نہیں؟''

''نیا سوٹ کہاں سے آیا آپی؟''

رات ساتھ والی حنصفہ آنٹی نے ہم دونوں کے کپڑے اور مٹھائی بھجوائی ہے۔ تم رات کو غالباً جلدی سو گئی تھی۔ خریداری کرنے کی جلدی جو تھی، اسی لیے اعلم ہوا اور شاپنگ مال پہنچ گئیں۔'' حوریہ آپی اسے چڑاتے ہوئے بولیں۔

ہرے..... واہ..... اب مزہ آئے گا۔ اللہ حفصہ آنٹی کو خوش رکھے۔ وہ ہمیشہ ہمارا خیال رکھتی ہیں۔ عید تو اب ہوگی۔ عید مبارک آپی۔'' ہانیہ خوشی سے اُچھلتے ہوئے بولی۔

☆☆

رمضان المبارک کا چاند نظر آتے ہی چہار سو چہل پہل اور رونق سی چھا جاتی ہے۔ ہر مسلمان اپنے واحد و لاشریک رب کو راضی کرنے کے لیے تراویح، قرآن پاک کی تلاوت اور روزوں کا خصوصی اہتمام کرتا ہے۔ یہی وہ بابرکت مہینا ہے جس میں غربا و مساکین کو اپنی خوشیوں میں شامل کرنے کے لیے صدقہ فطر اور زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے تاکہ وہ لوگ بھی عید کو خوشی کے طور پر منا سکیں۔

عید الفطر، اہل اسلام کا ایک اہم مذہبی تہوار ہے، جسے پوری دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان سکونت رکھتے ہیں، یکم شوال کو مناتے ہیں۔ عید عربی زبان کا لفظ ہے جو ''عود'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''لوٹنا'' ہے۔ چوں کہ یہ دن مسلمانوں پر بار بار لوٹ کر آتا ہے، اس لیے اسے عید کہتے ہیں۔ ماہ صیام میں خشوع و خضوع کے ساتھ روزوں اور تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عید الفطر کے دن اللہ رب العزت اپنے بندوں کو رمضان المبارک کی عبادات کا ثواب عطا کرتا ہے۔ عید نہ صرف خوشی کا دن بلکہ تشکر کا مقام بھی ہے، اسی لیے اہل اسلام دن مسرت و انبساط کے طور پر مناتے ہیں۔

عید الفطر کی نماز (دو رکعت بلکہ تکبیروں) کے ساتھ جامع مسجد، کسی کھلے میدان، پارک یا عیدگاہ وغیرہ میں ادا کی جاتی ہے لیکن اس سال کرونا وائرس کی وبا کے سبب مساجد میں جمعہ کی نماز بھی اجتماعات کی صورت میں نہیں ادا کی گئی تو عید کی نماز کے لیے بھی احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ اب کی بار ہمیں یہ خوشیاں تھوڑا احتیاط سے منانی ہیں، کہ ہماری ذرا سی غفلت سے کوئی بھی کرونا جیسے مرض کا شکار نہ ہونے پائے۔

عید وہ دن ہے، جب تمام مسلمان مرد و عورت، بچے بھلا کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مختلف انواع کے کھانے بنائے جاتے ہیں۔ گھروں کو سجایا جاتا اور ایک دوسرے کی دعوت کی جاتی ہے۔ محبت اور خوشی کے جذبے سے سرشار لوگ ایک دوسرے کے گھروں پر عید ملنے جاتے ہیں۔ بچے بڑے سب بہت اہتمام سے تیار ہوتے ہیں، بالخصوص خواتین اور بچیوں کی تیاری تو دیدنی ہوتی ہے جو رمضان کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہوجاتی ہے۔ اس سال رمضان سے قبل کرونا وائرس کی وبا نے زندگی کے نظام کو منقطع کر کے رکھ دیا لیکن پھر بھی عید سے قبل تھوڑی سی تیاری کرنی تو لازم ہے، چاہے وہ محدود پیمانے پر ہی ہو۔ اس حوالے سے ہم آپ کی راہنمائی کریں گے کہ کس طرح خواتین کرونا وائرس اور لاک ڈاؤن کے باوجود اپنی اور گھر کی تزئین و آرائش کر کے سب سے داد و دہش وصول کر سکتی ہیں، تاکہ آپ عید کے دن حقیقتاً ہنستی مسکراتی نظر آئیں۔

گھر کی تزئین و آرائش

عید سال کا ایک ایسا خوشیوں بھرا دن ہوتا ہے، جب بہت سے عزیز و اقارب اور دوستوں کی آپ کے گھر آمد ہوتی ہے اور کچھ بن بلائے مہمان بھی آپ کے گھر لازماً آتے ہیں۔ مہمانوں کی آمد پر جہاں مختلف قسم کے پکوان بنائے جاتے ہیں وہیں گھر کی سجاوٹ پر معمولی سا دھیان دے کر بہت سی تعریفیں سمیٹی جاسکتی ہیں۔ صاف ستھرا اور سجا ہوا گھر نہ صرف جاذب نظر لگتا بلکہ خاتونِ خانہ کے ذوق کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لیے اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے گھر آنے والا ہر ذی نفس آپ کی تعریفیں کے پل باندھے تو ہماری چند باتوں کو مدِ نظر ضرور رکھیں۔

کمروں کی صفائی و سجاوٹ

یوں تو صفائی کا کام رمضان کے آغاز سے پہلے نمٹا لینا چاہیے کیونکہ رمضان المبارک میں روزے کی وجہ سے بہت سے تھکا دینے والے کام مشکل لگتے ہیں۔ اب تو ویسے بھی رواں برس کرونا وائرس کی وجہ سے مرد حضرات کی گھر میں موجودگی بہت سے کاموں میں آپ کی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو مختلف قسم کے صفائی والے سرف، فنائل اور مائع کیمیکل جو صفائی ستھرائی میں استعمال ہوتے وہ اگر گھر پر موجود ہیں تو ان کو ایک جگہ اکٹھا کر کے رکھ لیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں یا اگر نہیں تو خرید لیں۔ اس کے علاوہ برش، جھاڑو، کوڑے والی ٹوکریاں، برتنوں اور دوسرے سامان کی جھاڑ پونچھ کے لیے کپڑا یا

عید کارڈ۔۔۔ایک گم گشتہ روایت

ہمارے معاشرے میں عید الفطر کے کئی رنگ ہیں۔ جیسے جیسے ماہِ رمضان اپنے اختتام کو پہنچے، تو ملک بھر کے بازار عید سے وابستہ اشیا جیسے کپڑوں، چوڑیوں، مہندی اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھر جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اس تہوار کا خاصہ ہیں اور ان کا رواج کبھی ماند پڑتا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ایک چلن گذشتہ کئی برس سے دم توڑ رہا ہے، اور وہ ہے عید کارڈ بھیجنا۔ کبھی زیادہ تر گھرانوں میں عید کارڈ منتخب کرنے، خریدنے، لکھنے، اور دوستوں اور رشتے داروں کو بھیجنے پر خاصا وقت لگانا معمول ہوا کرتا تھا لیکن اب شاذ و نادر ہی ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔ عید پر مبارکباد دینے کا رواج اب بھی ہے، لیکن ذریعہ تبدیل ہو چکا۔ نہ تو اب لوگوں کے پاس عید کارڈز کے اسٹالز پر جانے کا وقت ہے اور نہ ہی لوگ انہیں پوسٹ کرنے کے لیے قطاروں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عید کے دن موبائل فون نیٹ ورکس پر اضافی بوجھ پڑ جاتا ہے کیونکہ اب سب لوگ عید کی مبارکبادیں ایس ایم ایس کے ذریعے بھیجتے ہیں۔

موبائل فون اور سوشل میڈیا کے اس دور میں جب ہاتھ سے لکھے خطوط نے اپنی افادیت کھو دی ہے، تو عید کارڈز کے رواج کی یاد تازہ کرنا اچھا رہے گا، خاص طور پر اس کے اولیں دنوں سے، جب یہ رواج ہمارے خطے میں نیا نیا فروغ پا رہا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ برِصغیر پاک و ہند میں عید کارڈ بھیجنے کی روایت کا آغاز انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہوا۔ ویسے تو کئی دولت مند مسلمان گھرانے صدیوں سے سجاوٹ والے خطاطی شدہ پیغامات بھیجا کرتے تھے، لیکن عید کارڈز کی وسیع پیمانے پر دستیابی اور ان کا ڈاک کے ذریعے بھیجا جانا انیسویں صدی کے اواخر میں ہی شروع ہوا۔

لگتا ہے کہ اس کے پیچھے دو وجوہ ہیں: پہلی ریلوے کا پھیلاؤ اور دوسری پرنٹنگ کی نئی سہولیات کا متعارف ہونا۔ 1853ء میں جب ہندوستان میں ریلوے متعارف کروائی گئی تھی، تو اس کا جال صرف چونتیس کلومیٹر پر محیط تھا جو بڑھتے بڑھتے 1880ء میں پچیس ہزار کلومیٹر تک پھیل گیا تھا۔ ریلوے کے پھیلاؤ کی وجہ سے لوگ اپنے کاروبار اور روزگار کے سلسلے میں گھروں سے زیادہ دور جانے لگے۔ اس سے ڈاک کا نظام بھی بہتر ہوا، جبکہ پرنٹنگ کی نئی سہولیات نے بھی عید کارڈز کا معیار اور دستیابی بڑھا دی۔

ان قدیم عید کارڈز پر گفتگو اس مخصوص طرز کی اردو شاعری کے بغیر مکمل نہیں ہوگی، جسے خاص طور پر عید کے موقع کے لیے تحریر کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر:

میرے یاروں کو مبارک عید ہو
غمگساروں کو مبارک عید ہو

عید کارڈز کا رواج گذشتہ صدی کے اختتام تک اپنے زوروں پر رہا۔ اس کے بعد موبائل اور انٹرنیٹ کی آمد کے ساتھ دم توڑتا گیا۔ ظاہر ہے ٹیکنالوجی نے لوگوں کا اپنے پیاروں سے جذبات کا اظہار کرنا کم خرچ، آسان اور پرکشش بھی بنا دیا۔ لیکن پھر بھی ہم میں سے وہ لوگ جنہوں نے عید کارڈ منتخب کرنے، لکھنے، بھیجنے، اور وصول کرنے کا لطف لیا ہے، وہ چند بٹن دبانے اور چند کلکس میں وہ لطف کبھی نہیں پا سکتے جو انھیں اپنے پیاروں کو سپردِ ڈاک کرنے سے ملتا تھا۔

پاکستان میں لوگوں نے مغرب کی برائیوں کو خوشی سے گلے لگایا لیکن ان کی اچھائیوں تک پاکستانیوں کی پرچھائی بھی نہ پڑی۔ یہ مغرب کی ہی ریت ہے کہ والدین، رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کے ساتھ شاذ و نادر ہی رابطہ ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی ہو تو بہت پرجوش اور اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہاں پوسٹ کارڈز بھیجنے بھجوانے کی رسم اب بھی رائج ہے۔ یورپی ممالک میں ڈاک کے محکمے فعال ہیں۔ موبائل ٹکنالوجی اپنی جگہ لیکن پوسٹ کارڈز کا تبادلہ ایسی یادگار ہے جسے برسوں تک محفوظ رکھ کر یادیں سمیٹی جا سکتی ہیں۔

عید کارڈ کے ذریعے مبارک باد لینے یا بھیجنے کا عمل تمام تر اہل خانہ پوری دلجمی سے اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ موصول کنندہ کی عمر اور رشتے کے لحاظ سے مناسب ترین کارڈ کی خرید کسی طور بھی عید کی دوسری خریداریوں سے کم درجہ اہم نہ تھی۔ لیکن پچھلی دو سے تین دہائیوں میں جہاں بہت سی دیگر خوبصورت چیزیں ہم کھو چکے، ان میں یہ روایت بھی شامل ہے۔ افسوسناک امر یہ کہ اب اس کے دوبارہ زندہ ہونے کہ امکانات تقریباً معدوم ہیں۔ کچھ وقت کی بات ہے جب عید کارڈز کا تذکرہ صرف فیچرز، تبصروں اور کتابوں میں ملے گا۔

جھاڑن وغیرہ بھی لے آئیں۔ گھر کے پردے، کشن کور، بستر کی چادریں، قالین، گول تکیے، صوفہ کور وغیرہ کو دھو لیں، کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو خال خال ہی دھویا جاتا ہے خصوصاً پردے اور قالین وغیرہ۔ اسی بہانے گھر کے کونے کھدروں، پنکھوں اور کھڑکیوں کی بھی اچھے سے صفائی ہو جائے گی۔

برش پر کپڑا چڑھا کر جالے بھی صاف کریں کیونکہ وہ دور سے ہی نظر آجاتے ہیں۔ گیلے کپڑے سے فرنیچر صاف کرنے سے مٹی اور نشان تو ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس سے ان کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ اس کے لیے پالش کا استعمال کریں۔ اس سے لکڑی کا رنگ بھی برقرار رہے گا اور وہ ایک دم نیا لگے گا۔

اپنی خوابگاہ، ٹی وی لاؤنج خصوصاً بیٹھک کی سیٹنگ بدل لیں۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے نئی سجاوٹی اشیاء تو زیادہ خریدی نہیں جاسکتیں تو آپ پودوں، پھولوں اور جدید موم بتیوں کا استعمال کرلیں یا سجاوٹ کی چیزوں کو ردوبدل کے بعد رکھ دیں۔ یہ سیٹنگ آپ ایک نہیں بلکہ دو چار دن میں آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس سے گھر میں نئے پن کا احساس اُجاگر ہو گا۔ اچھے طریقے سے صفائی ستھرائی کے بعد پردے لٹکائیں، قالین بچھائیں اور کور چڑھا دیں۔ یقین کریں آپ کی محنت رنگ لائے گی اور گھر چمک اُٹھے گا۔

باورچی خانے کی صفائی

گھر کے ساتھ ساتھ صاف ستھرا اور منظم باورچی خانہ جہاں سلیقہ شعار عورت کی علامت ہے، وہیں اہل خانہ سے صحت اور ان کی صحت کا بھی ضامن ہے۔ رمضان اور عید کے دنوں میں چونکہ کام بہت بڑھ جاتا ہے، اس لیے پہلے سے ہی اس کی تیاری کرلیں۔ سب سے پہلے تو باورچی خانے کے تمام دراز جراثیم کش ادویہ یا پھر بیکنگ سوڈے سے صاف کرلیں لیکن خیال رہے کہ کھانے پینے کی اشیاء اس سے محفوظ رہیں۔

اپنے فریج اور فریزر صاف کریں۔ غیر ضروری اشیاء کسی کو دے دیں اور خراب شدہ پھینک دیں۔ مائیکرو ویو اوون اور چولہوں کو اچھی طرح چمکائیں کیونکہ ان پر کثرتِ استعمال سے چکنائی اور داغ دھبے پڑ جاتے ہیں۔

صفائی کے بعد مسالا جات اور سودا سلف کی فہرست بنا لیں۔ رمضان میں کثرت سے استعمال ہونے والے مسالے اور چیزیں فہرست میں لکھ لیں۔ عید پر کون سے خاص پکوان بنیں گے، وہ کھانے اور ان کے ضروری اجزاء بھی لسٹ میں شامل کرلیں، بلکہ ہو سکے تو وہ کھانے جو فریز ہو سکتے ہوں،

انھیں پہلے سے تیار کر کے رکھ دیں تاکہ وقت کی بچت ہو سکے۔ ہمارے ہاں رواج پایا جاتا کہ خاص برتن خصوصی مہمانوں کی آمد پر ہی استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے برتنوں پر مہینوں مٹی پڑی رہتی ہے، لہٰذا پہلے ہی دھو لیں تاکہ بعد میں سہولت رہے۔

غسل خانے کی صفائی

کہتے ہیں کہ اگر آپ نے کسی عورت کی نفاست اور صفائی ستھرائی کا مشاہدہ کرنا ہو تو اس کے باورچی خانے اور غسل خانے کا جائزہ لیں۔ عید پر تو ویسے ہی مہمان زیادہ آتے تو باقی گھر کے ساتھ غسل خانے کی بھی خصوصی طور پر صفائی کریں۔ فرش اور ٹائلوں کو رگڑیں تاکہ ان پر موجود داغ دھبے دور ہوں نیز باتھ ٹب وغیرہ کو بھی صاف کریں عموماً پانی کی وجہ سے ان پر کائی سی جمی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شیشے اور ٹونٹیوں کو بھی صاف کرنا نہ بھولیں، نمک ملے ہوئے گرم پانی کو تمام ٹونٹیوں پر ڈالیں اور کچھ دیر چھوڑ دیں اور پھر کسی سخت برش پر بیکنگ سوڈا اور واشنگ سوڈا ڈال کر اچھی طرح سے رگڑ کر صاف کرلیں۔ تولیے کو دھو کر رکھیں بلکہ ہو سکے تو نیا استعمال کریں، اس کے علاوہ عید کے دن غسل خانے میں وقتاً فوقتاً ایئر فریشنر کا چھڑکاؤ کریں۔ اس سے بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

لان کی صفائی

جن کے گھر بڑے ہوتے تو ان کے لان بھی بڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے عید سے قبل لان کی گھاس، پودوں اور درختوں وغیرہ کی کٹائی کروالیں، اب چونکہ بہار کا موسم شروع ہو چکا تو ہر طرف پھولوں کی بہار ہے، آپ بہت سے پھولدار پودوں کو اپنے داخلی دروازے کے اطراف میں رکھ کر دلفریب تاثر پیدا کر سکتے۔ جن کے پاس قدرتی پھول اور پودے موجود نہیں وہ مصنوعی پودوں سے بھی کام چلا سکتے ہیں نیز گملوں کو خود سے رنگ کرلیں، لاک ڈاؤن کے ان دنوں میں مرد حضرات یہ کام بخوبی انجام دے سکتے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھائیں۔

میٹھی عید کے پکوان

عید کے دن خاتونِ خانہ کی مصروفیات بھی کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ ایک تو اس دن مہمانوں کی آمد زیادہ ہوتی دوسرا گھر والوں کی بھی فرمائش کہ مزیدار پکوان بنائے جائیں۔ اس کے لیے آپ مختلف کھانے تیار کر سکتی ہیں۔

اس عید کو میٹھی عید بھی کہتے ہیں تو بہت سے گھرانوں میں سویاں، شیر خورمہ، کھیر، شاہی ٹکڑے اور فرنی میٹھے کے طور پر پسند کی جاتی ہے لیکن آپ کچھ نئے زمانے کے میٹھے فروٹ ٹرائفل، چاکلیٹ موس اور پائن ایپل ڈیلائٹ وغیرہ بھی بنا سکتے ہیں۔ نمکین ڈشز میں آسانی سے بن جانے والا چکن ہرا مسالہ، وائٹ کڑاہی، چکن تکہ، ملائی بوٹی اور اچار گوشت وغیرہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ آپ افغانی پلاؤ، بریانی یا گارلک رائس بنا کر اپنے کھانے کی میز کی رونق بڑھا سکتی ہیں۔

خواتین کی تیاری

عید کا پُرمسرت تہوار بھی اپنے انداز میں مناتے ہیں لیکن بچیوں اور خواتین کی تیاری اس دن خاص ہوتی ہے۔ رواں سال کرونا وائرس کے سبب خواتین عید کی تیاری پہلے کی طرح نہیں کر سکیں لیکن پھر بھی حالات اور موسم کے مطابق کیسے ملبوسات بنوائے جائیں، زیورات و میک اپ کیسا ہو؟ آپ اس حوالے سے آپ کو معلومات فراہم کرتے ہیں تاکہ آپ کی عید کو حقیقتاً چار چاند لگ جائیں۔

لباس کیسا ہو؟

کرونا کی وبا سے جہاں کاروبار زندگی بہت متاثر ہوا وہیں خواتین بھی عید کی تیاری بھرپور طریقے سے نہیں کر پائیں۔ عید چونکہ موسم گرما میں ہی آ رہی ہے تو اس مناسبت سے آپ ایسے لباس بنوا سکتے ہیں جن میں ہوا کا گزر ہو کیونکہ ایسے کپڑوں کے ریشے موسم کی شدت کو مدنظر رکھ کر ہی بنائے جاتے ہیں جو موسم کی سختی اور شدت میں کمی کا باعث بنتے

ہیں۔ اس عید پر لان یا شفون کے کپڑے بنائے جا سکتے ہیں۔ ہلکے تو زیادہ تر خواتین آن لائن ریڈی میڈ کپڑے منگوانے کو ترجیح دیتی ہیں یا پھر جنھیں سلائی آتی ہو وہ گھر میں خود ہی لباس سی کر عید کی تیاری کر سکتی ہیں۔

فیشن میں کیا ہے؟

اگر پاکستانی فیشن انڈسٹری کی بات کریں تو ان دنوں ہر طرح کے فیشن کا رواج ہے۔ مثلاً لان کی چھوٹی قمیصوں کے ساتھ گھیرے دار شلوار جس کے پائنچوں پر ڈیزائن یا کڑھائی ہو، ان یا کاٹن کے لیے سیدھے کرتے کے ساتھ چوڑی دار پاجاما، کھلے کُرتے کے ساتھ تنگ ٹراؤزر، چست قمیص کے ساتھ کھلے پلازو (کھلے ٹراؤزر)، مزید برآں عید پر فراک یا پشواز پہننے کا بھی رجحان موجود ہے۔ ہر صنف نازک اپنی عمر اور جسامت کے مطابق کسی بھی پہناوے کا انتخاب کر کے دلکش و خوشنما نظر آ سکتی ہے۔ خیال رہے کہ آپ جو بھی فیشن کریں، وہ پُروقار ہو۔

جوتے کی خریداری

لباس کے بعد جوتے بھی موسم کے اعتبار سے ہوں تو بہتر رہے گا۔ جوتا خریدتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ وہ آپ کے سائز کے مطابق ہو، چھوٹا یا بڑا سائز پاؤں کی تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ نے عید پر سارا دن گھر پر کام کرنا کھانے پکانے تو ہیل والے جوتے کا استعمال کم سے کم کریں۔ سارا دن ہیل والا جوتا پہنا جائے تو اس سے پاؤں میں درد اور سوجن کی تکلیف لازمی ہوگی۔ جب بھی نیا جوتا پہنیں اس سے پہلے پاؤں کو رگڑ سے بچانے کے لیے کریم یا تیل کا مساج کرلیں تاکہ جوتے پاؤں کو نہ کاٹیں یا چھالے نہ بنیں۔

مہندی رہے مہندی

چاند رات پر سب سے زیادہ رونق ہوتی ہے جب عید صرف ایک رات کی دُوری پر رہ جاتی ہے۔ خواتین اور بچیاں گھروں اور بازاروں میں جا کر خصوصی طور پر عربی، انڈین اور اراجستھانی ڈیزائن کی مہندی لگواتی ہیں، لیکن اس دفعہ کرونا کے باعث بھیڑ اور بازاروں میں آنے جانے سے اجتناب برتیں، خواتین گھر پر ہی اپنے اور اپنی بچیوں کے ہاتھوں پر پیچیدہ ڈیزائن کی بجائے سادہ گول دائرے کی صورت میں مہندی لگالیں۔ اس کا رواج بھی ہے اور وہ پرکشش بھی لگتی ہے۔ جب مہندی لگانے لگیں تو پہلے اپنے ہاتھوں کا مساج اور صفائی وغیرہ کرلیں تاکہ مہندی زیادہ خوبصورت لگے۔

ویسے تو آج کل بازار میں کون مہندی عام دستیاب ہوتی ہے لیکن کھلی مہندی بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ اگر کھلی مہندی سے ڈیزائن بنانا مقصود ہو تو اس کے لیے ٹوتھ پک یا کاٹن بڈ بھی بروئے کار لائے جاسکتے ہیں۔ مہندی عموماً رات کو لگائیں کیونکہ اس وقت خاطر خواہ کام نہیں ہوتے اور ویسے بھی ساری رات لگی رہنے کے بعد رنگ بھی گہرا آئے گا۔ مزید برآں رنگ گہرا چڑھے اس کے لیے لیموں یا سرکے کو مہندی سوکھنے کے بعد ہاتھوں میں لگائیں اور ایک آدھ گھنٹے بعد دھولیں، یا پھر مہندی اتارنے کے بعد ہاتھوں پر سرسوں کا تیل لگائیں اور کم از کم ایک گھنٹے تک پانی میں ہاتھ نہ ڈالیں۔

میک اپ کا طریقہ

عید کے موقع پر خواتین اور بچیاں بنی سنوری ہی اچھی لگتی ہیں۔ عام دنوں میں تو پارلر وغیرہ کھلے ہوتے اور خواتین وہاں جا کر اپنا فیشل وغیرہ کروا سکتی تھیں مگر آج کل ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں، یا پھر وہ خواتین جو پارلر جانا پسند نہیں کرتیں وہ عید کے دن اپنے حسن کو چار چاند لگانے کے لیے کچھ تیاری پہلے سے گھر پر بھی کر سکتی ہیں۔

کرونا وائرس کی وجہ سے بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلیں لیکن اگر جانا ہو تو سن بلاک ضرور لگائیں، یہ سورج کی تمازت سے آپ کی جلد کی حفاظت کرے گا۔ عید سے ایک دو دن قبل چہرے کی کلینزنگ کر کے اسکرب کریں اور ماسک وغیرہ لگا

لیں۔

گھر پر بہترین اسکرب کرنے کے لیے ٹماٹر کی گول قاشیں کاٹ کر چینی چھڑکیں اور اسے اپنے چہرے پر ہلکا مساج کریں اور پندرہ منٹ بعد چہرہ دھولیں، مزید برآں کوئی بھی فیشل ماسک تیار کریں اور لگالیں، جیسا کہ ایک بڑا چمچ ملتانی مٹی میں تین بڑے چمچ سنگترے کا رس یا پھر لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں۔ اس ماسک سے نہ صرف جلد کی زائد چکنائی دور ہوگی بلکہ چہرے کے نشانات اور داغ بھی ختم ہو جائیں گے یا پھر جو کا آٹا لے کر اس میں ایک چمچ یا حسب ضرورت دودھ شامل کر کے پیسٹ بنالیں اور اس کو 10 سے 15 منٹ چہرے پر مساج کریں، بعد ازاں نیم گرم پانی سے دھولیں، چہرہ بچوں کی جلد کی طرح نرم وملائم ہوجائے گا۔

ابتدائی تیاری مکمل ہوجانے کے بعد عید کے دن نیچرل یعنی قدرتی میک اپ کریں، یعنی ایسا میک اپ جو چہرے پر تھوپا ہوا محسوس نہ ہو، گرمی کے موسم میں نمی کے باعث فوراً چہرے پر تیل آجاتا ہے۔ بہت زیادہ فاؤنڈیشن یا بیس لگانے کی بجائے لیکوئیڈ فاؤنڈیشن یا بی بی کریم لگائیں۔ گہرے رنگ کی بجائے ہلکے رنگ کی لپ اسٹک یا لپ گلوس کو استعمال کریں نیز آنکھوں پر زیادہ آئی شیڈ کے مقابلے میں صرف آئی لائنر، مسکارے یا کاجل پر اکتفا کریں۔ آپ زیادہ حسین نظر آئیں گی۔

زیورات بھی ضروری ہیں

عید ہو یا کوئی اور تہوار پاکستانی خواتین کا سج دھج کر تیار ہونا لازم وملزوم ہے۔ اس لیے عید کے دن خواتین خوب سے خوب تر نظر آنے کے لیے کئی جتن کرتی ہیں۔ کبھی میچنگ مصنوعی زیورات وچوڑیاں خریدتی تو کبھی سونے کے زیورات کی فرمائش کرتی ہیں، کیونکہ سونا مہنگا ہونے کے باعث بہت سے افراد کی پہنچ سے دور ہے، یہی وجہ مصنوعی زیورات کو زیادہ فروغ مل رہا ہے۔

رنگ برنگی چوڑیوں اور عید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے خواتین اور بچیاں نئے لباس کے ساتھ اور کچھ خریدیں یا نہیں، چوڑیاں ضرور لیتی ہیں۔ پاکستان میں حیدرآباد کی دلکش و دیدہ زیب چوڑیاں نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں پسند کی جاتی ہیں۔ اگر خواتین بہت زیادہ کانچ کی چوڑیاں نہیں پہننا چاہتیں تو دستی گھڑی بھی پہنی جاسکتی ہے۔ اس کا آج کل بہت رواج ہے اور مہذب بھی لگتی ہے۔

خواتین و مرد اپنی تیاری کے ساتھ ساتھ ہر سو بکھرے خوشیوں کے ان لمحات میں قرب وجوار میں بسنے والے نادار و مساکین کو نہ بھولیں جن کے پاس ان سب مسرتوں کو منانے کے لیے وسائل نہیں ہوتے۔ جو سفید پوش ہوتے اور خودداری کے سبب کسی کے آگے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتے، ان کی مدد کر کے اپنی خوشیوں اور راحت میں اضافہ کریں۔ عید کے دن یہ عہد بھی کریں کہ پورا رمضان جہاں آپ ہر قسم کی برائی سے بچ کر اللہ رب العزت کی خوشنودی حاصل کرنے والے اعمال کرتے رہے، ان کو تاعمر چھوڑیں گے نہیں بلکہ اپنی زندگی کا حصہ بنالیں گے تاکہ آپ دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکیں۔ سب کو عید مبارک

◆◆◆

امام غزالیؒ فرماتے ہیں، باتیں چار قسم کی ہوتی ہیں:

(1) جن کے کرنے سے سراسر نقصان ہو۔ (2) جن کے کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ (3) جن سے نفع بھی ہو، نقصان بھی۔ (4) جو نفع اور نقصان سے خالی ہوں۔

قیوم راہی

سمندر

ایک پُراسرار ہستی کی سحر انگیز کتھا، اس کے باطن تک کوئی ذی حس نہ پہنچ سکا

وہ کراچی کی سہانی شام تھی۔ سرسراتی ہوئی خنک ہواؤں میں تازگی سی گھلی ہوئی تھی۔

میں زیب النساء اسٹریٹ پر بے دلی کے ساتھ تھکا تھکا سا چلا جارہا تھا۔ ان دنوں میرے جسم، میری روح، سوچوں پر سستی، بے کیفی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ میں بے حد اُکتا گیا تھا۔ چونیاں سے کراچی تک کا طویل سفر میں نے اس توقع پر کیا تھا کہ شاید ماحول کی تبدیلی میرے احساسات پر کچھ خوشگوار اثر ڈال سکے۔ سنا ہے آب و ہوا کی تبدیلی بعض اوقات صحت اور خیالات کی بہتری کا سبب بن جاتی ہے۔

زیب النساء اسٹریٹ پر بے مقصد گھومنے کے بعد میں چند گلیوں میں سے گزر کر ایک روشن اور بارونق بازار میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سامنے کچھ فاصلے پر جی سگریٹ کا دھواں اُڑاتا ایک ریستوران میں داخل ہورہا ہے۔ ایک دم جیسے کسی نے میرے دردل کو جھنجھوڑ ڈالا۔ میرے اندر

ارتعاش سا پیدا ہوگیا جس میں مسرت کا احساس بھی شامل تھا جو اس ناآسودہ کیفیت میں نعمت سے کم نہ تھا۔

میں نے تو ایک جھلک میں ہی سب کچھ دیکھ لیا۔ سر سے پاؤں تک وہ ذرا بھی تو نہ بدلا تھا۔ وہی دبلا پتلا جسم، وہی متوازن چال، سنجیدہ چہرے پر چاکلیٹ کلر فریم والی خوبصورت عینک، گہرے سنتھیٹی رنگ کی پتلون، کریم کلر کی قمیص۔ ہمیشہ سے ہی یہ اس کے پسندیدہ رنگ تھے۔

کچھ یاد نہیں، غالباً میں نے اسے آٹھ نو برس بعد دیکھا تھا۔ جدائی کے اس طویل عرصے میں وہ مجھے کئی موقعوں پر یاد آتا رہا۔ میرا طویل عرصے تک اس سے خصوصی رابطہ جو رہا تھا لیکن میں اس کی سنجیدہ شخصیت کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے بارہا اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت گہرا تھا۔ میں اس کی تہ تک کبھی نہ پہنچ سکا۔ میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک بہترین انسان اور ایک پیارا دوست ہے۔

بعض لوگ پہلی نظر میں ہی بہت اچھے لگتے اور دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ نجمی کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں ان دنوں اپنے آبائی قصبے چنیاں سے نیا نیا لاہور آیا تھا اور وہاں ایک سرکاری دفتر مین ملازم تھا۔ اس کا تبادلہ ہوا اور وہ میری برانچ میں آ گیا۔ مجھ سے چند برس سینئر تھا۔ میری ملازمت نئی نئی تھی۔ میں ابھی وہاں کے اہلکاروں سے پوری طرح گھل مل بھی نہ سکا تھا لیکن نجمی میں کوئی کشش تھی کہ میں جلد ہی اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس نے بھی میری دلجوئی کی اور دستِ تعاون بڑھایا۔ یوں ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

میں ان دنوں کرائے پر رنگ محل کے ایک سہ منزلہ مکان کی تیسری منزل کے ایک پورشن میں رہتا تھا۔ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں وہاں اکیلا رہتا تھا۔ محلے میں ایک لڑکی سے میرا عشق چل رہا تھا۔ نجمی شادی شدہ تھا اور ایک بیٹے کا باپ..... وہ عمر میں مجھ سے دس بارہ برس بڑا تھا۔ ہمیشہ کھویا کھویا رہنا اس کی عادت تھی۔ جیسے وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہو۔ پتا نہیں وہ ہر وقت کیا سوچتا رہتا۔ چھٹی کے دن وہ اکثر میری رہائش گاہ پر آتا۔ میں اس کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتا۔ کبھی موڈ ہوتا تو پریشر ککر میں گوشت بھون کر اس کے سامنے رکھ دیتا۔

وہ میرے ہاتھ کے پکے کھانے کی بڑی تعریف کرتا اور بڑی رغبت و اپنائیت سے مزے لے لے کر کھاتا اور میرے عشق کے قصے بڑی دلچسپی سے سنا کرتا۔ ویسے بھی ہماری دلچسپیاں مشترک تھیں۔ میں موسیقی کا رسیا اور افسانوی اور شعری ادب کا دلدادہ تھا۔ وہ بھی اس معاملے میں میرا ہم ذوق بلکہ مجھ سے ایک قدم آگے ہی تھا۔ ان موضوعات پر ہماری دیر تک گفتگو رہتی۔ فلمیں وہ بھی دیکھتا تھا اور میں بھی لیکن ہم دونوں نے کبھی ایک ساتھ فلم نہیں دیکھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کے بغیر فلم دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ عجیب و غریب طبیعت کا مالک تھا..... بعض اوقات تو وہ مجھے انتہائی پُراسرار شخصیت معلوم ہوتا۔

ایک چھٹی کے دن وہ مجھے ریلوے اسٹیشن لے گیا۔ وہاں ہم کافی دیر پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے۔ جب ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہوگیا تو وہ مجھے پٹڑیوں پر لے گیا۔ ہم دونوں چلتے چلتے دور نکل گئے۔

اس نے کہا: ”دراصل مجھے یہ ماحول، یہاں کا سب کچھ بڑا اچھا لگتا ہے۔ یہ ریل کے ڈبے، یہ چنگھاڑتا دوڑتا ہوا انجن، یہ پٹڑیوں کا دور تک پھیلا ہوا جال، یہ مسافروں کی ریل پیل... بتا نہیں سکتا مجھے یہاں آ کر کیا ہو جاتا ہے..... کیوں ہو جاتا ہے؟“

”یہ سب کچھ تو مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔“

”شاید ہماری دوستی کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔“

”شاید۔“

پھر اس نے ایک دم موضوع بدل دیا۔ ”یار ستار! میری

ایک بات غور سے سنو۔“

”کیا؟“

”معاملہ بس عشق تک محدود رہنا چاہیے۔“

”جی؟“ میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

”میرا مطلب ہے شادی کے جھنجھٹ میں مت پڑنا۔“

”کیوں؟“ میں حیران تھا۔

”انسان بندھ کر رہ جاتا ہے، آزادی سلب ہو جاتی ہے..... چین اور بے فکری سے جی سکتا اور نہ مر سکتا ہے۔“

”میں سمجھ نہیں سکا۔ آخر کہنا کیا چاہتے ہو تم۔“

”تم شاید سمجھ نہیں سکو گے یار..... بات ہی کچھ ایسی ہے۔“

میری پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ اس نے میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی، وہ سمجھا میں خفا ہو گیا ہوں۔ بولا: ”اب دیکھو نا! بعض اوقات اچانک یوں لگتا ہے کہ یہ زندگی، یہ کائنات، یہ سب کچھ جو تمہارے اور میرے سامنے ہے، بے کار ہے، بالکل بے کار، بے مصرف، بے مقصد..... زندگی کا کوئی جواز ہی نہیں ملتا سرے سے۔“

میں نے گہرا سانس لیا اور بولا: ”ہاں یار..... ایسا ہو تو جاتا ہے کبھی کبھار۔“

”تو ایسے میں ہی تو انسان کا مرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہی تو وہ سنہرا موقع ہے جب زندگی کی قید سے رہائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس عمل کے لیے ریل کی پٹڑیوں سے اچھی جگہ اور کیا ہے؟ تم بور تو نہیں ہو رہے میری باتوں سے؟“

”نہیں بھئی... ایسی بات نہیں مگر..... نجمی، میرے یار، تمہیں ریل گاڑی اور اس کی پٹڑیاں اس وجہ سے اچھی لگتی ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ ایسا اس لیے ہے کہ جب تمہاری بیوی میکے چلی جاتی ہے تو تم ریل کے ڈبے میں بیٹھ کر انھی پٹڑیوں سے گزر کر اسے لینے جاتے ہو، لیکن مجھے کیوں اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ؟ میں کیوں بچوں کی طرح خوش ہونے لگتا ہوں یہاں آ کر؟..... پتا نہیں کیا وجہ ہے اس کی..... تو کیا میں بھی تمہاری طرح خواہش مرگ میں مبتلا ہوں؟ ہو سکتا ہے اس آرزو کی چنگاڑی میرے تحت الشعور کی راکھ میں کہیں دبی ہوئی ہو..... نہیں نہیں، ایسا نہیں ہے شاید..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا...“ میں اُلجھ کر رہ گیا۔

”آؤ اب واپس چلتے ہیں یار..... بہت گھوم پھر لیے۔“ اسے جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا۔ وہ بعض اوقات میرے گھر سے بھی ایک دم اُٹھ کر چلا جاتا تھا۔ بات کو ادھورا اور موضوع تشنہ چھوڑ کر۔ وہ خود بھی شاید ایک تشنہ، ایک ادھورا انسان تھا ان دنوں۔

”چلو۔“ میں نے جواب دیا اور اس نے تیز تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

ایک بار جب وہ اپنی بیوی کو کراچی لینے گیا ہوا تھا، میری محبوبہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی۔ اچانک اس کی شادی ہوئی اور وہ پشاور سدھار گئی۔ میں چند دن مغموم اور دل برداشتہ رہا، آخر جلد ہی خود کو سمجھا بجھا لیا۔ جب وہ کراچی سے واپس آیا تو دفتر جانے سے ایک دن قبل شام کو میرے پاس پہنچا۔ دفتر میں ہماری بات چیت کم ہی ہوا کرتی۔ ہم اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ ”ملاقات“ کے لیے وہ فرصت اور خاص ماحول کا قائل تھا۔ دفتر اس ”خاص ماحول“ کے زمرے سے خارج تھا۔

وہ میرے لیے کراچی سے سوہن حلوہ لایا تھا۔ اس نے بڑی محبت کے ساتھ حلوے کا ڈبا مجھے دیا۔ میں نے خوش ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر سفر، کراچی اور بعد میں دفتر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب میں نے اپنی محبوبہ کی شادی کا ذکر چھیڑا تو وہ نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا: ”کوئی بات نہیں، میرا خیال ہے تم خاصے بہادر اور حقیقت پسند واقع ہوئے ہو۔ تم نے اچھا کیا جو اس بات کا اثر نہیں لیا۔“ پھر اس نے اپنی عادت کے مطابق اس موضوع کا

سلسلہ اچانک منقطع کر دیا۔ بولا: چائے نہیں پلاؤ گے؟''

میں نے بجلی کے ہیٹر پر پانی کی کیتلی رکھ دی۔

اس نے پاس ہی رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ رفیع بڑی درد بھری آواز میں گا رہا تھا:

رہا گردشوں میں اکثر مرے عشق کا ستارا
کبھی ڈگمگائی کشتی کبھی کھو گیا کنارا

یہ گانا اسے بے حد پسند تھا۔ وہ آنکھیں موندے ڈوب کر سنتا رہا۔ پھر جب رفیع کی آواز کا سوز اس شعر میں ڈھلا:

پڑے جب غموں سے پالے رہے مٹ کے مٹنے والے
جسے موت نے نہ پوچھا اسے زندگی نے مارا

تو اس نے آنکھیں کھول کر کئی لمبے لمبے سانس لیے۔ پھر کیسٹ کئی بار ریوائنڈ کر کے یہی شعر سنا۔ یہ اس کی خاص ادا تھی۔ بعض اوقات وہ اپنے پسندیدہ گانے ریوائنڈ کر کے دس دس بار سنتا۔ میں ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ گانے کے بول ختم ہوئے تو اس نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔ میں نے چائے کی پیالی بڑھا دی۔ اس نے چائے کے ایک دو گھونٹ پی کر پیالی میز پر رکھ دی اور بولا: ''اب کی بار کراچی میں جی نہیں لگا یار۔''

''کیوں، تمہیں تو وہاں کی راتیں بڑی پسند تھیں۔ جگمگاتی ہوئی پُرکیف حسین راتیں۔''

''دراصل یار! جب تک انسان خود کو کسی نہ کسی طرح بہلائے اور فریب دیے رکھتا ہے، اسے سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔ جب آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں اور وہ خود کو دھوکا دینے کے قابل نہیں رہتا تو زندگی کا سارا نشہ اُتر جاتا ہے۔ پھر وہ خود کو بالکل تنہا پاتا ہے۔ دل بُری طرح گھبرانے لگتا اور ریل کی پٹڑیاں اسے اپنی طرف بلانے لگتی ہیں...... یہ ریل کی پٹڑیاں بھی کس قدر مفید ہیں یار۔''

میں نے کبھی اسے جان بوجھ کر قائل نہیں کیا تا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے، کھل کر بیان کر سکے۔ میں بس چپ چاپ غور سے اس کی باتیں سنتا رہتا حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرے رویے سے اسے پختہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں بھی اس کے ان خیالات اور تاثرات پر ''صاد'' کرنے لگا ہوں۔

وہ ادب، موسیقی، فلم اور کبھی کبھار زندگی پر فلسفیانہ گفتگو تو کھل کر کر لیتا لیکن اس نے اپنے ذاتی حالات پر بات کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ میں جب بھی اشارے کنایے سے اسے کریدنے کی کوشش کرتا، وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ٹال جاتا۔ وہ کہیں راج گڑھ کے علاقے میں رہتا تھا اتنا مجھے معلوم تھا لیکن میں نے اس کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دکھایا ہی نہیں۔ کبھی مجھے وہاں لے کر نہیں گیا۔ حالانکہ میری ہمیشہ آرزو ہی رہی کہ اس ماحول کو دیکھوں جہاں وہ رہتا ہے۔

ہماری ملاقاتیں بڑے تسلسل سے برسوں جاری رہیں۔ ہم ریلوے اسٹیشن جاتے رہے۔ شام کے وقت انارکلی میں بھی گھومتے۔ گھوم پھر کر جب ہم تھک جاتے تو کبھی ٹولنٹن مارکیٹ کے ایک پُرسکون ریستوران میں چلے جاتے جہاں چائے یا کافی پیتے ہوئے دیر تک بیٹھے رہتے۔ کبھی خاموش تو کبھی بولتے ہوئے۔ کبھی رات کے وقت مال روڈ پر ٹہلتے دُور تک نکل جاتے۔ چلتے چلتے وہ بلا ارادہ ہال روڈ، بیڈن روڈ یا ٹیمپل روڈ کی طرف مڑ جاتا۔ ہمارے پروگراموں میں بھی کوئی نظم و ضبط نہیں تھا۔ کوئی سلیقہ، کوئی اُصول نہیں تھا جس کی بیشتر ذمہ داری نجمی پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے بارے میں، میں کیا کوئی بھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بیشتر باتوں میں غیر معمولی پن کا دخل ہوتا۔

ایک چھٹی کے دن صبح ہی سے کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بارشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شہر کی بہت سی گلیوں اور سڑکوں پر پانی بھر گیا تھا۔ سہ پہر کو بارش تھم گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''یار صبح سے بور ہو گیا تھا گھر میں پڑے پڑے۔''

بعض اوقات میں نے محسوس کیا وہ جسے ''چین'' کہتے ہیں

اسے کسی جگہ بھی نہیں ملتا۔ وہ ایک بے قرار روح ہے جو اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہے۔

ایک دن اس لڑکی پر اظہار رائے کیا جس نے شاہی مسجد کے مینار سے کود کر خودکشی کر لی تھی۔ کہنے لگا: ''یہ خودکشی کا بڑا مشکل اور بھیانک انداز ہے۔ پسند نہیں آیا مجھے۔'' پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولا: ''ریل کی پٹڑیوں پر نہیں جا سکتی تھی تو کہیں سے پوٹاشیم سائی نائیٹ ہی حاصل کر لیتی۔''

پوٹاشیم سائی نائیٹ کے بارے میں اسے تب پتا چلا جب ہمارے دفتر کے ایک افسر کا نوجوان بیٹا جو میڈیکل کا طالب علم تھا، اس زہر کے استعمال سے اپنے کنبے کو داغ مفارقت دے گیا۔ جب نجمی کو پتا چلا کہ یہ ایک ایسا زہر ہے جس کے ذائقے کے بارے میں آج تک کوئی نہ بتا سکا۔ تو کہنے لگا، ''اچھی چیز ہے۔'' اس نے مرنے والوں پر کبھی افسوس نہیں کیا تھا۔ وہ تو بس خودکشی کے طریقوں پر سوچتا اور اظہار رائے کیا کرتا۔ وہ شاید جنم جنم کا روگی تھا...... خواہشِ مرگ بھی تو ایک روگ ہی ہے۔

میں اب اس کے بارے میں کچھ اور بھی جان چکا تھا۔ مثلاً موت کے بارے میں اس کا رویہ خاصا رومانوی تھا۔ وہ اذیت پسند تھا۔ ہر وقت اُداس اور غمزدہ رہنا مرغوب تھا۔ میں نے اسے کبھی خوش نہیں دیکھا۔ ایک بار کراچی سے آنے کے بعد اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا (وہ اس قسم کی بیشتر باتیں کرتے ہوئے اپنے چہرے پر تبسم کا ملمع چڑھا لیتا تھا)

''یار اس بار ایک عجیب بات ہوئی...... بڑا لطف آیا۔''

''اچھا۔''

''ہاں... گاڑی ایک جنگل کے پاس سے گزر رہی تھی کہ مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔'' ''پھر؟''

''پھر فوراً ہی غالب کا شعر میرے اندر گونجنے لگا:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن جیسا کہ پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، میں اس کی تہ تک نہ پہنچ پایا۔ اس نے اپنے ذاتی حالات کو مجھ سے سربستہ راز کی صورت پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ میں اس معاملے میں واضح انداز میں گفتگو کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ نہ جانے اتنی قربت کے باوجود ہمارے درمیان فاصلہ کیوں تھا؟

پھر میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ لاہور کی تحصیل قصور کو جب ضلع کا درجہ دے دیا گیا تو چونیاں تحصیل قصور ضلع میں آ گئی۔ وہاں نئے انتظام کے تحت عملے کی ضرورت پڑی تو میں نے اپنا تبادلہ چونیاں کرا لیا، جہاں جلد ہی میری شادی ہو گئی۔ میں لاہور اور نجمی سے رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے اسے خط لکھا نہ اس نے مجھے۔ یوں برسوں ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں علم نہ ہو سکا کہ کون کس حال میں ہے؟

دو برس قبل جب میں لاہور کے دفتر میں اس سے ملنے گیا تو پتا چلا کہ اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور کراچی جا چکا۔ اس غیر متوقع اطلاع پر مجھے خاص تعجب نہیں ہوا۔ اس کے تو کئی اقدام ڈرامائی ہوا کرتے تھے۔ بڑے عجیب، چونکا دینے والے لیکن میں نے یہ سوچا کہ اس بار وہ یقیناً کسی غیر معمولی دباؤ کی زد میں آ گیا ہو گا ورنہ وہ لاہور ہرگز نہ چھوڑ کر جاتا۔ لاہور اسے بے حد عزیز تھا۔ کتنی ہی بار وہ لاہور سے اپنی غیر معمولی وابستگی کا برملا اظہار کر چکا تھا۔

☆☆☆

بہرکیف اُس شام کراچی میں اُسے دیکھ کر مجھے ڈھارس کا سا احساس ہوا۔ میں بڑے تجسس کے ساتھ تیزی سے اس ریستوران کی طرف چل دیا جس میں ابھی کچھ دیر پہلے نجمی داخل ہوا تھا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ ایک خالی گوشے میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ چائے کی پیالی سامنے رکھی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھا کہ میں نزدیک پہنچ گیا تب بھی اس

نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور اُداسی کی رم جھم ہو رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''ارے یار ستار تم! یہاں کیسے؟'' وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے انتہائی گرم جوشی سے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کو ڈبڈبایا ہوا سا دیکھا۔ اس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا: ''کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں یار صرف چائے پیوں گا۔'' مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوا اور اس وقت ٹولنٹن مارکیٹ کے ریستوران میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا بے اختیار جی چاہا کہ ایک بار میں بھی اس سے لپٹ کر رو دوں۔

اس نے میرے لیے چائے منگوائی۔ چائے کے ایک دو گھونٹ پی کر اس نے پوچھا: ''وہیں چونیاں میں ہو؟''

''ہاں یار۔'' میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن میں اندر ہی اندر رو رہا تھا۔

''کتنے بچے ہیں تمھارے؟''

''تین... ایک لڑکا دو لڑکیاں۔''

''خوش تو ہو؟'' اس کی آواز میں دھیما پن تھا اور ایک سوز سا بھی۔

''ہاں۔'' میں نے جھوٹ بول دیا (ہائے کیسا پیارا دوست بچھڑ گیا مجھ سے)

''کراچی کیسے آئے؟ کہاں ٹھہرے ہو؟ کتنے دنوں کا پروگرام ہے؟''

''بس سیر و تفریح، آب و ہوا کی تبدیلی..... پرسوں حیدر آباد جا رہا ہوں۔ وہاں سے چند دن بعد لاہور جاؤں گا..... اپنے ایک دوست احمد پرویز کے گھر ڈرگ روڈ کے علاقے میں مقیم ہوں۔''

''اچھا... کہاں کہاں کی سیر کر ڈالی؟ کلفٹن گئے؟''

''ہاں... زندگی میں پہلی بار سمندر بھی دیکھ لیا۔''

وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے نہ جانے کیا سوچنے لگا۔

میں نے کہا ''تم سناؤ کیا حال چال ہیں؟''

''سب ٹھیک ہے۔''

''یہاں کیوں شفٹ ہو گئے؟ کیا کر رہے ہو؟ کیسی گزر رہی ہے؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا: ''بس یار بعض اوقات انسان بے بس ہو جاتا ہے اور پھر ہزار احتیاط کے باوجود انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کچھ مجبوریاں، کچھ بزدلی، کچھ غلطیاں مجھے کراچی لے آئیں... خدا کا شکر ہے کہ مجھے یہاں ایک اچھے ادارے میں معقول ملازمت مل گئی۔ اب کچھ چھٹیاں جمع ہو گئی ہیں تو سوچ رہا ہوں چند دنوں کے لیے لاہور چلا جاؤں... بے حد یاد آتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہوا کہ تم ابھی تک خود کو یہاں سے وابستہ نہیں کر سکے۔'' میں در اصل اسے اس موضوع کی طرف لا رہا تھا جس کے بارے میں جاننے کی مجھے کرید لگی ہوئی تھی۔

''یہ کیسے جانا تم نے؟... لاہور کی یادیں تو ایک فطری جذبہ ہے۔'' اس نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے بات کو آگے نہ بڑھنے دیا۔

اتنے دنوں کے بعد ہم ملے مگر جلد باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا ہم دونوں کو۔ یوں ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے شرمندہ ہوں ایک دوسرے سے۔

کچھ دیر بعد اس نے امرتسر ٹی وی اسٹیشن سے دکھائی جانے والی فلموں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آج

کل وہ افسانوں کے مطالعے کی بہ نسبت اشعار کے مطالعے کی طرف زیادہ مائل ہے۔ ٹیپ ریکارڈر پر پسندیدہ نغمے سننے کا محبوب مشغلہ اب کچھ زیادہ ہی محبوب ہو گیا ہے..... پھر اس نے مجھے اپنا موجودہ پتا لکھ کر دیا۔ شاید اب وہ اُٹھنا چاہتا تھا لیکن مجھے ابھی اپنے دل کا بوجھ بھی تو ہلکا کرنا تھا۔

''اور سناؤ.....'' الفاظ میرا ساتھ نہ دے سکے۔

''کیا سناؤں یار؟ کیا پوچھنا چاہ رہے ہو تم۔''

''میں.....؟''

''ہاں۔''

''میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ جو ایک دیرینہ خواہش تھی تمہاری، اس کا کیا بنا؟''

''کون سی خواہش؟''

''بھئی وہی... خواہش مرگ۔''

اس نے ایک بار میری آنکھوں میں جھانکا، پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ نہ جانے کہاں ڈوب گیا تھا۔ پھر جب وہ اُبھرا تو بولا: ''بڑی عجیب صورت حال ہے یار مجھے تو کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا اس بات کا۔''

''خیریت تو ہے۔''

''خیریت ہی تو نہیں ہے یار۔'' اس نے ایک آہ بھری۔

''کچھ دن ہوئے میری اس خواہش نے دم توڑ دیا۔ اب تو مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔'' ایک زخمی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تڑپنے لگی۔

میں نے سوال کیا: ''آخر کیوں؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟''

وہ بولا ''ستار! میرے کراچی آنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ میں اپنی بیوی بیٹے کے مستقبل اور ان کے تحفظ کی فکر سے آزاد ہو سکوں۔ تم جانتے ہو یہاں میری سسرال ہے۔'' تم سمجھ گئے میرا مطلب۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا حالانکہ میں اس کی بات

ذرا دیر سے ہی سمجھ سکا۔

وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا: ''لیکن یہاں ایک عرصہ گزار کر پتا چلا کہ یہ تو بڑی بے وفائی کا دور ہے۔ بڑا ہی نفسا نفسی کا زمانہ ہے۔ لوگ تو جیتے جی کسی کی پروا نہیں کرتے، مر جانے کے بعد کا تو کہنا ہی کیا..... مرنے والوں کو تو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ یادوں کی لوح پر سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے..... اب کوئی مرے بھی تو کس آس پر؟ سو جینے کا ایک بڑا سہارا بھی چھن گیا مجھ سے۔''

میں سناٹے کے طلسم میں بند ہا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس سے کیا بات کروں؟

کچھ دیر بعد وہ ہڑبڑا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی مخصوص پرانا اضطراب نمایاں تھا۔ کہنے لگا ''آؤ یار چلتے ہیں۔''

اس نے بل ادا کیا اور ہم دونوں ریستوران سے باہر آ گئے۔

بس اسٹاپ تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بس کی طرف بڑھا تو وہ مصافحہ کر کے بولا ''اچھا یار لاہور کو میرا اسلام کہنا۔''

''اچھی بات ہے۔''

اور میں ''خواہش مرگ'' اور ''جینے'' کے تعلق کو کھوجتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔

☆☆☆

آج جب اس شگفتہ اور نکھری نکھری شام کو میں انارکلی کی گہما گہمی میں اکیلا گھوم رہا ہوں، مجھے چند دن قبل کی تجمی کے ساتھ گزری ہوئی کراچی کی وہ شام یاد آ رہی ہے۔ نگاہوں کے سامنے اس کا سراپا بار بار اُبھر رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ مدت تک خواہش مرگ کے سہارے جیتے رہنے والے اس پُراسرار شخص کا نیا اقدام پتا نہیں اب کیا ہو؟ ◆◆◆

مزاح

رشتہ مطلوب ہے

زہرہ جبیں

ایک مہ جبیں کی خصوصیات کا دلچسپ تذکرہ جو کبھی خوبیاں لگتی ہیں کبھی خامیاں

اس دور میں اور تو کسی شے کا قحط ہے یا نہیں البتہ رشتوں کا قحط ضرور ہے اور ...... لڑکیوں کے لیے۔ اس کے چرچے مدتوں سے سننے میں آرہے تھے لیکن عملی طور پر ہمارا واسطہ اس سے تب ہی پڑا جب ہماری ایک عزیز سہیلی کی شب دیجور جیسی زلفوں میں چاندی بھرنے لگی۔ لڑکی کو ٹھکانے لگانے کی کوششیں عرصۂ دراز سے جاری تھیں۔ ان کی اماں جی کی دوستی انھی معزز خواتین سے تھی جو دوسروں کے گھر بسانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ذریعے رشتے آنے لگے، ہر قسم کے اور ہر رنگ کے......

ہر رشتے کی سلسلہ جنبانی شروع ہوتے ہی بڑے دھوم دھڑکے کی خبریں موصول ہوتیں۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ بخیر وعافیت ختم ہو جاتا۔ بعد میں پتا چلتا کہ یہ صاحب زادے نرے اُستاد تھے اور دنیا کے متعلق کچھ نہ جانتے یا فلاں صاحب دفتری چکروں کے تو خوب ماہر تھے لیکن سائنس و ٹیکنالوجی میں صفر ہیں۔ کبھی پتا چلتا کہ پچھلی دفعہ جنہیں بے نیل و مرام لوٹایا گیا تھا، وہ اور تو ہر لحاظ سے اپ ٹو ڈیٹ تھے لیکن ادب سے انھیں دور کا واسطہ تک نہ تھا۔

یہ تو تھے ہماری سہیلی کے ذاتی اعتراضات، کئی لوگ ان کے والدین کی چشمِ بینا کی نذر ہو گئے۔ آنے والا کوئی سید تو تھا لیکن کچھ بناوٹی سا! کوئی مغل تھا لیکن جاٹ لگتا۔ آخر لوگوں کی یہ ریل پیل ٹوٹ گئی اور اب کئی سالوں سے کسی نوشہ کی راہ دیکھتے دیکھتے ہماری سہیلی کے گھر والوں کی آنکھیں دُکھنے کو آ گئی ہیں۔

پچھلی دفعہ شومئ قسمت ہم ان کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو اماں بی نے اس معاملے میں ہماری بے حسی و طوطا چشمی کو خوب کوسا:

دوست آں باشد کہ گیرو دست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی...

ہم نے زمیں میں گڑتے ہوئے عرض کی کہ ہم فرض دوستی کیونکہ ادا کر سکتے ہیں۔ بولیں......ضرورت رشتہ کے اشتہار اخباروں میں چھپواؤ۔ تب سے ہم اخباروں میں فرضِ رشتہ کے اشتہارات چھپوا رہے ہیں لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ روزمرّہ اشتہار بہت مختصر لکھے جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہماری سہیلی کا مؤقف و معیار لوگوں کو پتا نہیں چلتا۔ یہ معاملہ طویل ہو رہا ہے۔

چنانچہ اس سے پہلے کہ ہماری سہیلی کے مزید اُمیدواروں کو ناکام لوٹنا پڑے، ہم اپنی سہیلی کی ذات کے عقائد، نظریات کا خلاصہ بلاکم و کاست بیان کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہماری توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کر سکیں۔

اپنی سہیلی کی برتری کے بارے میں عرض یوں ہے کہ ایک تو وہ اشرف المخلوقات سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری صنف لطیف میں سے ہیں اور وہ بھی سپریم قسم کی...... عام حالات میں ہم کہیں گے کہ وہ بیماریوں کے میدان کی دھنی ہیں۔ ہر دور میں انھیں کم و بیش دو درجن جسمانی و روحانی بیماریاں لاحق رہیں، جنہیں وہ نفس کی پاکیزگی کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ جسمانی امراض کچھ اس طرح کے ہیں:

1۔ سارا سال زکام کے نت نئے حملے جاری رہتے ہیں۔

2۔ دردِ سر صد غمِ دیرینہ ہے۔

3۔ گیس ٹربل اور معدے کی گڑبڑ جب چاہے قافیہ تنگ کرتی ہے۔

4۔ ریح کی ٹیسیں جسم کے مختلف حصوں سے اٹھتی ہیں۔

5۔ دل کی دھڑکن کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی بغیر کسی وجہ کے ہی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی بن کہے دل رُکنے لگتا ہے۔ ڈوبتا بھی بلاوجہ ہے۔

6۔ دردِ گردہ دوبار ڈاکٹروں کے وارے نیارے کرا چکا۔ اس کی بغاوت کے اب بھی امکانات ہیں۔

7۔ ٹانگیں اور پاؤں بن بتائے سو جاتے ہیں۔

8۔ آنکھیں دن کے وقت تارے دیکھتی ہیں۔

9۔ جگر کے افعال مشکوک ہیں۔

10۔ سوتے سوتے سانس رکنے لگتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اور کیا بتاؤں، جانے کس وقت کب کیا ہونے لگے۔

بیماریوں سے دن رات ساتھ کی وجہ سے وہ خود ڈاکٹر ہو چکی ہیں۔ شہر کے معرکتہ الآرا حکما اور اطبا کے نقائص اور خوبیاں وہ انگلیوں پر گنوا سکتی ہیں۔ راہ چلتا ہوا جو شخص انھیں سلام کرے، وہ کیمسٹ ہوتا ہے اور جب کسی ٹیکسی میں بیٹھتی ہیں تو ڈرائیور صرف یہ پوچھتا ہے، ’’جناب کس ڈاکٹر کے پاس؟‘‘

نفسیاتی اعتبار سے ہماری سہیلی نرگسیت میں مبتلا ہیں۔ خود پسند اتنی کہ چاند بھی اُتر کر سامنے آئے تو یہ اسے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں۔ ان کی نظر میں کوئی نہیں جچتا۔ لوگ باگ پیٹھ پیچھے ان کے نفسیاتی تجزیے تو بہت کرتے ہیں لیکن منہ در منہ آتے ہیں تو چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ ان کے ماتھے پر ہر دم ایک سو گیارہ کا ہندسہ دیکھا جا سکتا ہے۔

بولتی ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں جو جھڑپوں کی طرح لگتے ہیں۔ اس لیے ہر شخص کو ان کا سامنا کرنے کی جرات نہیں ہوسکتی۔ چونکہ انٹیلی جینشیا میں سے ہیں اس لیے وہ خود کو بھی منہ لگانا پسند نہیں کرتیں۔ معیار بلاشبہ ان کا ماؤنٹ ایورسٹ سے کچھ اونچا ہی ہے۔ ہم نے کہا نا کہ اپنی دنیا میں مگن رہتی ہیں اور اس دنیا میں اچھے لوگوں کی طرح کتابیں ان کی رفیق و دمساز ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہی ان کا اوڑھنا اور یہی ان کا بچھونا نہیں تو غلط نہ ہوگا۔

یہ ان دنوں ہی میں اونچی اونچی کتابیں پڑھا کرتی تھیں جب ہم لوگ طفل مکتب تھے۔ پہلے پہل ان پر ترقی پسندی کا موڈ طاری ہوا تو انھوں نے نعرہ باز ادیبوں کو پڑھ ڈالا۔ ہم نے منٹو، عصمت، علی سردار جعفری اور پتا نہیں کس کس کے نام انھی سے سن کر یاد کیے تھے۔ قاسمی کو یہ ہمیشہ نظر انداز کر دیتیں کہ وہ ان کی نظر میں جرأت مند و جانباز نہ تھا۔ شاعروں کو پسند نہیں کرتیں کہ یہ محض باتونی اور خیالی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہم نے شروع میں انھی کو ہی مجاز اور ساحر کے شعر موقع بے موقع استعمال کرتے دیکھا۔ اور بحث نہ کی کہ یہ ہمیشہ کی کج بحث ہیں۔

پھر ترقی پسندوں کی صف ہی میں یہ ولی دکنی، جعفر زٹلی، میر امن، حیدر بخش حیدر بلکہ امیر خسرو تک کو لے آئیں۔ ان کا رشتہ ناتا کچھ ادھر سے جوڑ رہی تھیں۔ ایک بار ہم نے ایسا قدامت پسندی کا طعنہ دیا تو بولیں نہیں یہ گپ نہیں لیکن اس حقیقت کو ایک تھیسیس کے ذریعہ ثابت کروں گی۔ معلوم نہیں وہ تھیسیس کب مکمل ہوگا۔ اس کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ مرزا رسوا کی بھی بڑی مداح ہیں۔ جنھوں نے امراؤ جان ادا لکھی۔

مغربی ادب میں انھوں نے بہت سوں کو پڑھا ہے۔ کچھ کا ایسا اثر قبول کیا جو بعد میں جاتا رہا۔ جن سے نفرت کی جو بعد میں اچھے لگنے لگے۔ اس کے بعد ترقی پسند کے ضمن میں انھوں نے اشتراکیت کا بنظر غائر مطالعہ کر ڈالا۔ اسی ضمن میں معاشیات کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ لیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں انھوں نے دساور سے برآمد کی تھیں۔ اس سلسلے میں انھیں نطشے، ہیگل، کانٹ اور فرائیڈ اور جانے کس کس سے دلچسپی ہوگئی۔ یہیں کہیں سے وہ صوفیوں کی طرف پلٹیں۔ ان کے مطالعہ میں وہ ایسی ڈوبیں کہ اب تک نہ ابھر سکیں۔ اسی دوران چشمہ ان کی غزال سی آنکھوں پہ آن چڑھا۔

اب سچ تو یہ ہے کہ ان کے سامنے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہ بھی نفسیاتی و جنیاتی تجزیہ کرنے لگ جاتی ہیں کبھی صوفی ازم کی مار مارتی ہیں۔ اب ان کا کچھ کچھ رجحان سیاست کی طرف ہے۔ دیکھیے یہ کیا رنگ لاتا ہے۔ شبہ یوں پڑتا ہے جیسے اگلے انتخابات میں کچھ کر دکھانے کے ارادے ہیں۔ چونکہ مطالعہ ان کی ضرورت ہے، اس لیے انھیں شاید ہی وقت ملتا ہو وہ کوئی اور مشغلہ بھی اپنا سکیں، ماسوائے کبھی دھوپ میں بیٹھ کر چھینکنے کے۔

اپنے آپ کو اسکالر سمجھنے سے پہلے انھوں نے متعدد مشاغل اپنائے اور ان کے ہر مشغلے کے آگے 'انگ' آتا تھا۔ دروغ ان کی اپنی گردن پر لیکن جیسا کہ وہ بتاتی ہیں بچپن میں وہ ٹکٹ 'کلیکٹنگ' کے پیچھے پڑی رہتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ 'رائٹنگ' سے بھی دلچسپی تھی۔ میٹرک میں پہنچیں، نئے خون نے جوش مارا تو 'ایکسٹرا انرجی' کے مصرف کے لیے 'رائڈنگ' کو پسند کیا۔ چنانچہ انھوں نے البم پھاڑ ڈالی اور ٹکٹ بچوں میں تقسیم کر دیے۔ 'رائیڈنگ' میں وہ بڑی ماہر ہوگئی تھیں۔ کہتی ہیں ہالی وڈ کے کسی فلمساز نے مری میں اُچھلتے کودتے گھوڑے پر اکڑے ہوئے دیکھا تو اپنی کسی معرکہ آرا فلم میں انھیں کام کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ واللہ عالم۔

بہرحال ہم اپنی سہیلی کے اس مشغلے کے متعلق کچھ نہیں

کہیں گے کہ وہ میٹرک میں برقع اوڑھتی تھیں اور پھر ان کا گھر ایسے محلے میں تھا جہاں صرف چیونٹی ہی فرّاٹے بھر کر گزر سکتی ہے۔ پھر ایک دور آیا، وہ نازک اندام بجلی سی لڑکی ہوگئیں۔ ان کے زرخیز ذہن نے سوچنا ہی سوچنا شروع کر دیا۔ اس دور کا یادگار مشغلہ 'پینٹنگ' ہے اور وہ بھی تجریدی۔ سنا ہے ان کے کئی اچھوتے شاہکار دوستوں کے گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ یہ خیالی لڑکیوں والی بات بھی انھیں زیادہ عرصہ پسند نہ رہی تو انھوں نے 'گارڈننگ' شروع کی۔

کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ہارٹیکلچر کے منعقدہ پھولوں کے میلے میں جو گلاب کا پھول اوّل آیا، وہ انھیں کا پروردہ اور ان سے مستعار لیا گیا تھا۔ لوگ بھی تو ستم ظریف ہیں جو دوسروں کے بل بوتے پر شہرت حاصل کرتے ہیں اور یہ کہ ماڈرن باغبانی کے مصنف نے انھی کے خیالات چرائے ہیں۔ 'گارڈننگ' ہابی کے طور پر تو خوب رہی لیکن وہ جفاکشی و محنت سے کچھ مردانہ وار ہوگئیں۔ پھر یہ اس سے دست بردار ہوگئیں۔ اب ایک خوبصورت حادثے نے انھیں 'سوئمنگ' کی طرف مائل کیا۔ اس میں انھوں نے خوب حوصلے نکالے۔ پنڈی میں انھوں نے کئی بار سوئمنگ کی سہولتیں نہ ہونے کی شکایت کی۔

آج کل یہ 'ڈائٹنگ' کر رہی ہیں۔ غضب ہوا کہ پچھلے دنوں ان کا وزن نوے پونڈ سے اکیانوے پونڈ ہوگیا۔ باقی 'سوئنگ، میچنگ' تو ساتھ ہی ساتھ چلتی ہیں۔ ان کے پاس انگریزی رسالے اتنے آتے ہیں کہ اب ان کی اماں جان کا ردی والے سے مستقل جھگڑا رہنے لگا ہے۔ یہ اور بات کہ اس قسم کی عام چیزیں یہ نمائشوں سے خرید لاتی ہیں۔ پچھلے سال سنا تھا کہ ہوم اکنامکس کالج میں یہ 'ہاؤس کیپنگ' پر لیکچر دیا کریں گی۔ اب پتا نہیں اس خبر کا کیا بنا......

ان کی روزمرّہ زندگی صبح کی بیڈٹی سے شروع اور رات کی کافی پر ختم ہوتی ہے۔ بیڈٹی کے بعد اپنے کمرے کے خوابیدہ ماحول میں ریڈیو سیلون کی نشریات سنتی اور ساتھ ہی ساتھ کسی کتاب کا مطالعہ کرتی ہیں۔ آج کل یہ پامسٹری کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں اور ہمارے ہاتھ سمیت کئی ہاتھوں کے پرنٹ 'اسٹڈی' کر رہی ہیں۔ بیڈٹی میں دیر ہوجائے تو ان کے گھر میں تہلکہ مچ جاتا ہے... پھر لیٹے لیٹے لباس کا انتخاب کرتیں اور ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ کلر کا فریم آنکھوں پر لگاتی ہیں۔ بیگ میں ردّوبدل ہوتا ہے۔

بستر سے اُٹھنے سے پہلے کوئی بچہ حاضر ہوتا ہے جو زور زور سے تین چار بار مکے ان کے پٹھوں پر جماتا ہے۔ چند منٹوں بعد بیگ لہراتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوجاتی ہیں۔ کہنے کو تو یہ ایک گاڑی بھی لے سکتی ہیں لیکن عام لوگوں والی باتیں کرنا انھیں پسند نہیں ورنہ انفرادیت کہاں رہے۔ کئی شامیں ان کی ادھر ادھر ادبی و ثقافتی اجتماعوں کی نذر ہوجاتی ہیں۔ واپسی پر کچھ دیر گرم پانی کے ٹب میں گزارتی ہیں۔ پھر دھوپ سینکتی اور غور کرتی ہیں کہ زندگی کتنی جلد بیت رہی ہے۔

◆◆◆

پہلا ٹچ اسکرین فون

دنیا کا پہلا اسمارٹ فون 16 اگست 1994 کو امریکا کی معروف کمپنی آئی بی ایم نے متعارف کرایا تھا جس کا نام پہلے اینگلر رکھا گیا مگر بعد میں اسے سائمن پرسنل کمپیوٹر کہا جانے لگا۔ یہ مارکیٹ میں دستیاب پہلا ٹچ اسکرین فون تھا جسے اسٹائلس یا انگلی کی مدد سے آسانی سے استعمال کیا جاتا تھا جبکہ اس میں کیلنڈر، کیلکولیٹر، ایڈریس بک اور نوٹ پیڈ جیسے فنکشن انسٹال تھے۔

صدر ایوب خان دہلی میں

اس دور کا دلچسپ قصہ، جب پاکستانی حکمران دیرینہ قضیے حل کرنے اچانک بھارت جا پہنچے

عبدالقدیر رشک

یہ جولائی 1959ء کی ایک سنہری صبح کا واقعہ ہے۔ پاکستان میں فوجی انقلاب آ چکا تھا۔ ایوب خاں نتھیا گلی کے ''صدر گھر'' میں سبزہ زار پر چہل قدمی کر رہے تھے کہ ان کے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملا اور ان خیالات کا اظہار کیا جائے جو کچھ عرصے سے ان کے ذہن میں جنم لے رہے تھے۔ ایوب خان کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کے برسرِ اقتدار آنے پر پنڈت جواہر لعل نہرو ناپسندیدگی ظاہر کر چکے ہیں۔

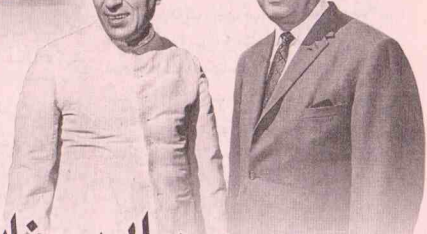

ایوب خان ان دنوں زرعی اصلاحات، بنیادی جمہوریتوں اور اعلیٰ سرکاری ملازمین کی چھان پھٹک میں مصروف تھے۔ اتنی مصروفیت کے باوجود انھوں نے نئی دلی جانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ذہنی طور پر طے کیا کہ جو مختصر وفد

دلی جائے گا اس میں وزیر خارجہ شیخ منظور قادر اور قدرت اللہ شہاب کے علاوہ ایک دو پرانے صحافی شامل ہوں گے جو پنڈت جواہر لعل نہرو اور کانگریس لیڈروں کو جانتے ہوں۔ پرانا صحافی اور شیخ سر عبدالقادر کا دیرینہ نیاز مند ہونے کے باعث مجھے بھی دلی جانے کا موقع ملا۔ پاکستان کے وزیرخارجہ شیخ منظور قادر، سر عبدالقادر کے بڑے صاحبزادے تھے۔

ستمبر کی یکم تاریخ کو پی۔ آئی۔ اے کا طیارہ ''سٹی آف لاہور'' محوِ پرواز تھا۔ پروگرام کے مطابق سٹی آف لاہور کو صرف ڈیڑھ گھنٹہ پالم کے ہوائی اڈّے پر ٹھہرنا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا یہ عرصہ وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور ایوب خاں کی گفتگو کے لیے وقف تھا۔ ہم کراچی سے روانہ ہوئے تو ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا۔ ''سٹی آف لاہور'' فضا کی بلندیوں میں محوِ پرواز ہوا تو بادلوں نے فضا کو ڈھانپ لیا۔ مشرق سے اُبھرتے سورج کی ترچھی شعاعیں دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ خوشگوار موسم میں پی۔ آئی۔ اے کی دو خوبصورت میزبان لڑکیاں مسکراتی ہوئی آئیں اور انھوں نے ہر مسافر کو لیمن کا گلاس پیش کیا۔

پاکستان کا طیارہ پالم کے ہوائی اڈّے پر اُترا۔ وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سفید رنگ کی خوبصورت اچکن پہنے اور اچکن کے ایک کاج میں سرخ رنگ کا گلاب لگائے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انھوں نے چوڑی دار پاجاما پہن رکھا تھا۔ سر پر گاندھی کیپ تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہم سے ملے۔ ان کی ایوب خان سے ڈرامائی ملاقات پر سیکڑوں فوٹوگرافر پالم کے ہوائی اڈّے پر جمع ہو گئے۔ فوٹوگرافروں کے نرغے سے نکل کر ایک کمرے میں بیٹھے، جہاں ایک گھنٹہ تنہائی میں گفتگو ہوئی۔ ایوب خان نے وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کے ہوادار کمرے میں جو گفتگو کی اس کا لب لباب یہ تھا:

''جناب وزیراعظم! یقین جانیے مجھے آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا۔ یہاں آنے کا پہلا مقصد آپ کی طرف دستِ رفاقت بڑھانا ہے۔ دوسرا مقصد آپ کی سوچ بچار کے لیے چند باتیں چھوڑ جانا ہے۔ یہ باتیں ہمارے باہمی تعلقات کے متعلق ہیں۔ اگر آپ کو ان باتوں میں کوئی تعمیری پہلو نظر آتا ہے تو میں اپنی طرف سے انھیں لباس عمل پہنانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر اس کے برعکس آپ کو ان میں کوئی نئی بات نظر نہ آئی تو براہ کرم انھیں بھول جائیں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہ ہو گا۔'' ایوب خاں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''جناب وزیراعظم! مجھے یقین ہے کہ آپ کا ملک اور میرا ملک ایک دوسرے کے متعلق ایسا طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہیں جو معقول ہونے کے بجائے اپنے اندر تخریبی عناصر لیے ہوئے ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ ہمیں ہمسائیگی کا احساس نہیں۔ میں بھائی چارے کا لفظ استعمال نہیں کروں گا کیونکہ میرے نزدیک یہ لفظ فرسودہ ہو چکا۔ ہاں اگر ہمیں ہمسائیگی کا مناسب احساس نہ ہوا تو دونوں ملکوں کے غریب باشندے جو اس سبب گزشتہ بارہ برس سے تکالیف کا سامنا کر رہے ہیں، غیر معین عرصہ تک تکالیف کا شکار رہیں گے۔''

انھوں نے ایک تجربے کار جرنیل کی حیثیت سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''فوجی سوچ کے مطابق اگر ایک ملک کے پاس بہت بڑی فوج اور زیادہ تعداد میں اسلحہ موجود ہے تو وہ کسی وقت بھی اپنے ارادے بدل کر تشدد پر اُتر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مثال تلاش کرنے کے لیے ہمیں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ نے 1950ء اور پھر 1951ء میں ہماری سرحدوں پر فوجیں کھڑی کی تھیں حالانکہ اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آتی تھی۔''

ایوب خان نے حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا ''جب تک ہمارے تعلقات بہتر نہ ہوں گے، ہم یا تو کسی بیرونی حملہ آور سے شکست کھا جائیں گے یا ایک دوسرے سے تنگ آ کر کسی غیر ملکی حکومت کو اپنے یہاں

مدعو کرنے پر مجبور ہوں گے۔ برصغیر کی تاریخ کے مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارا داخلی انتشار ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کو دعوت دیتا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس بات کے حق میں نہیں کہ تاریخ خود کو دہرائے۔ جناب وزیراعظم! خارجی حملہ آور کی طرف میں نے جو اشارہ کیا، اسے سمجھنے میں آپ کو کوئی دقت نہ ہوئی ہو گی۔ انسان بڑی چیز ہے۔ مشکلات میں یہ گدھے کو بھی باپ بنانے پر تیار ہو جاتا ہے۔''

اس سارے عرصے میں اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کا ہجوم وی۔ آئی۔ پی روم کے باہر منڈلاتا رہا جہاں دونوں لیڈر گفتگو میں مشغول تھے۔ اس وقت پالم کے ہوائی اڈے پر نہ صرف بادل چھائے ہوئے تھے بلکہ کراچی کی طرح بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس خوشگوار موسم میں مجھے ایک جانی پہچانی نسوانی شکل نظر آئی جس کی عمر ڈھل چکی تھی۔ کھنڈر بتاتے تھے کہ کبھی یہ عمارت خوبصورت ہو گی۔ یہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن وجے لکشمی تھیں۔ وہ روس میں بھارت کی سفیر تھیں اور کسی وجہ سے پالم کے ہوائی اڈے پر آئی تھیں۔ ان سے مختصر سی گفتگو ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کبھی فرصت کے وقت دلی آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ وہ بھارت میں کچھ عرصہ ٹھہرنے کا ارارہ رکھتی تھیں۔ گفتگو کے بعد ایوب خاں اور پنڈت نہرو کمرے سے باہر نکلے تو اخبار نویسوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

''سٹی آف لاہور'' ڈیڑھ گھنٹہ پالم کے ہوائی اڈے پر ٹھہرنے کے بعد محو پرواز ہوا تو پنڈت نہرو نے مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک خوبصورت ٹوکری میں سیب، ناشپاتیاں، ہری چھال والے کیلے اور شربت روح افزا کی دو بوتلیں ہمارے حوالے کر دیں۔ ایوب خان بھی بہت سے پھل اور سوچ بچار کا مواد چھوڑ آئے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات

میں پنڈت نہرو سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ پنڈت نہرو نے ایک موقع پر اپنا تعارف ہم صحافیوں سے اس طرح کرایا:

''الٰہ آباد میں میری والدہ ایک جلوس میں شامل تھیں۔ ایک سڑک پر جلوس رکا تو کسی نے میری والدہ کے لیے کرسی ڈال دی۔ وہ سڑک پر جلوس کے آگے بیٹھ گئیں۔ کانگریس کے چند کارکن ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے جن میں میرا اسیکرٹری بھی شامل تھا۔ پولیس ان سب کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس نے جلوس پر دوبارہ حملہ کیا۔ میری والدہ کرسی سے گر پڑیں۔ ان کے سر پر پے در پے کئی بید پڑے، جن سے ان کا سر پھٹ گیا۔ میری والدہ کے سر سے خون بہنے لگا اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔ وہ اس حالت میں دیر تک سڑک پر پڑی رہیں۔ جب سڑک جلوس والوں سے صاف ہو گئی تو ایک پولیس افسر نے انھیں وہاں سے اُٹھایا۔ یہ پولیس آفیسر میرا جاننے والا تھا۔ اس نے والدہ کو موٹر میں ڈال کر آنند بھون پہنچایا۔

اسی رات الٰہ آباد میں افواہ پھیل گئی کہ والدہ انتقال کر گئی ہیں۔ غصے سے بپھرے عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ انھوں نے عدم تشدد کا فلسفہ پس پشت ڈال کر پولیس پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے جواب میں گولی چلائی، جس سے کئی شہری ہلاک ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ہندو اور مسلمان شامل تھے۔ مجھے جیل میں ایک اخبار پڑھنے کے لیے ملتا تھا۔ حادثے کے اگلے روز مجھے اپنی والدہ کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو میرے دل پر یہ سوچ کر گہری چوٹ لگی کہ میری بوڑھی اور نحیف والدہ سڑک کے گرد و غبار میں خون سے لت پت پڑی تھیں۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو نہ جانے میرا اپنا رویہ کیا ہوتا؟ میں عدم تشدد پر کہاں تک قائم رہتا؟ مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے پچھلے بارہ برس میں جو سبق سیکھا تھا، دردناک منظر دیکھ

کر اسے بھول جاتا۔

رفتہ رفتہ والدہ صحت یاب ہو گئیں لیکن اگلے مہینے وہ مجھے جیل میں ملنے آئیں تو ان کے سر پر بدستور پٹی بندھی تھی۔ لیکن بظاہر وہ خوش تھیں۔ وہ اس بات پر فخر کرتیں کہ دوسرے کارکنوں کے ساتھ انھیں بھی لاٹھیاں اور بید کھانے کا موقع ملا لیکن والدہ کی وقتی صحت یابی حقیقی نہیں تھی۔ یہ محض ظاہر داری تھی۔ چوٹ لگنے سے بوڑھی عمر میں انھیں شدید صدمہ پہنچا تھا۔ پولیس کے حملے نے ان کا سارا جسم ہلا کر رکھ دیا۔ ان چوٹوں نے ایک سال بعد خطرناک صورت اختیار کر لی اور بالآخر وہ چل بسیں۔''

پنڈت نہرو جب پاکستان آئے

پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے خاندان کی پہلی جانی قربانی کی داستان اس وقت سنائی جب وہ 1943ء میں امرتسر ''موگا کانفرنس'' سے خطاب کرنے آئے۔ 1943ء میں انگریز حکومت نے نہروں کے موگے چھوٹے اور آبیانہ میں ڈیڑھ گنا اضافہ کر دیا تھا۔ گیانی کرتار سنگھ اور معروف کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے نہ صرف احتجاج کیا بلکہ امرتسر میں موگا کانفرنس بلائی جس میں بہت سے سیاسی لیڈر شریک ہوئے۔ جن اضلاع کے آبیانہ میں اضافہ کیا گیا، ان میں امرتسر، فیروز پور، لدھیانہ، گورداسپور اور جالندھر کے کچھ علاقے شامل تھے۔

یہ ایک قسم کی کسان کانفرنس تھی۔ کانفرنس کی صدارت کا کام پنڈت جواہر لعل نہرو کو سونپا گیا۔ امرتسر سے اطلاع ملی کہ پنڈت جی موگا کانفرنس سے پہلے پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ لاہور سے جن اخبار نویسوں نے پنڈت نہرو کی پریس کانفرنس میں شرکت کی، ان میں روزنامہ پرتاب کے مہاشہ کرشن، ملاپ کے نانک چند ناز، زمیندار کے اظہر صاحب، احسان کے سعید بزمی اور راقم الحروف شامل تھے۔

مہاشا کرشن نے پریس کانفرنس میں جیل میں پنڈت جی کے مشاغل کے متعلق دلچسپ سوال پوچھا۔ پنڈت جی جواب میں مسکرائے اور کہا ''جیل میں میرے عجیب و غریب مشاغل تھے مثلاً گلہریاں پالنا۔ میں کبوتروں کے دانے دنکے کے لیے پریشان رہتا۔ مینا کے بچوں سے گھنٹوں جی بہلاتا۔ جیل میں مینا کے ایک جوڑے نے میری کوٹھڑی کے دروازے پر گھونسلا بنا دیا تھا۔ مینا اور اس کے بچوں کی خوراک کا انتظام میرے ذمے تھا۔ ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ میرے پاس چلی آتی اور شور مچا کر خوراک طلب کرتی۔ لکھنؤ جیل میں اکثر ایسا ہوتا کہ ایک گلہری میری ٹانگ پر آ کر بیٹھ جاتی اور ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ ایک بار مجھے اس قسم کی تین گلہریاں مل گئیں۔ یہ گلہریاں اس قدر چھوٹی تھیں کہ انھیں پالنا مشکل تھا۔ آخر یہ مسئلہ ایک نئی ترکیب سے حل ہوا۔ میں نے فاؤنٹین پین میں روشنائی ڈالنے والی نوک پر ذرا سی روئی لگا کر اس سے دودھ پلانے کی بوتل کا کام لیا۔''

پنڈت جواہر لعل نہرو سے میری آخری ملاقات اس وقت

ہوئی جب وہ 1959ء میں سابق صدر ایوب خاں کی دعوت پر پاکستان آئے۔ پنڈت جی کے سرکاری دورہ کا پس منظر کچھ اس طرح تھا۔ اکتوبر 1958ء میں ایوب خان برسر اقتدار آئے تو انھیں تنازع جموں وکشمیر گفت وشنید سے حل کرنے کا خیال آیا۔ ایوب خاں پاکستان کے پہلے سربراہ تھے جو بلا دعوت اپنے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب کے ساتھ نئی دہلی گئے۔ اس وقت اس دورہ کا لب لباب یہ تھا کہ دونوں لیڈر سفارتی تکلفات چھوڑ کر تنازع جموں وکشمیر پر گفتگو کریں۔ یہ دیرینہ بین الاقوامی مسئلہ باہمی گفت وشنید سے حل کر لیا جائے۔ بقول ایوب خاں اس وقت پاکستان اور بھارت میں دو ایسی مضبوط حکومتیں موجود تھیں جو عوام کو اعتماد میں لے کر کشمیر تنازع طے کر سکتی تھیں۔ نئی دہلی کی ملاقات میں پنڈت جواہر لعل نہرو کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی گئی۔

ایوب خاں کی دعوت پر پنڈت جواہر لعل نہرو پاکستان آئے تو قدرت اللہ شہاب کے تعاون سے ان سے اخبار نویسوں کی ملاقات کرائی گئی۔ میں بھی ان اخبار نویسوں میں شامل تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کو قریب سے دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا یہ دوسرا موقع تھا۔ تیکھے نین نقش کے 68 سالہ کشمیری پنڈت میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی گفتگو میں مولانا ابوالکلام آزاد کا سلجھا ہوا لہجہ موجود تھا۔ وہ مجھے پہلی نظر میں میں آنجہانی گاندھی کی بے چین اور جبتی جاگتی ''آتما'' نظر آئے۔

نہرو خاندان کے چشم و چراغ پنڈت جواہر لعل نہرو 14 نومبر 1889ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے نہرو کہلانے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے والد پنڈت موتی لعل نہرو کا مکان نہر کنارے واقع تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نہرو خاندان مشہور ہو گیا۔ ان کے والد معروف کانگریسی اور ہندو نیشنلسٹ لیڈر تھے۔ نہرو رپورٹ ان کا ایسا ''شاہکار'' تھا جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی راہیں ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئیں۔ جواہر لعل نہرو کی تعلیم کا زیادہ عرصہ یورپ میں گزرا۔ انھوں نے 1912ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں ان کی ملاقات سوشلسٹ ادیب پرفیسر لاسکی سے ہوئی۔ پنڈت جی آخری عمر تک ان کے عقیدت مند رہے۔ وہ جب بھی لندن جاتے، پروفیسر لاسکی سے ضرور ملتے۔ ان کی سوشلسٹ سوچ میں پروفیسر لاسکی کا بڑا دخل تھا۔

1914ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی شادی ایک دبلی پتلی اور بھولی بھالی سترہ سالہ لڑکی کملا سے ہوئی۔ دونوں کی عمروں میں بڑا فرق تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ فرق ان کی سوچ میں تھا۔ دونوں کے خیالات کی بنیادیں الگ الگ تھیں۔ اس اختلاف کے باعث اکثر دونوں میں ان بن رہتی۔ لیکن ذہنی اختلاف کے باوجود دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ شادی کی 21 ماہ بعد پنڈت جی کی اکلوتی بیٹی اندرا پیدا ہوئی۔ اٹھارہ سال کی پرآشوب زندگی نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو بوڑھا بنا کر رکھ دیا۔ چہرے پر جھریاں ابھر آئیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے، سر کے بال اڑ گئے، جو بچے رہے سفید ہو گئے۔ اس کے برعکس کملا کی شکل پر وہی لڑکپن اور کنوارپن کی کیفیت موجود تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کملا اور پنڈت نہرو کہیں اکٹھے سفر کرتے تو لوگ انھیں پنڈت جی کی لڑکی سمجھتے۔ اندرا اور کملا بھی انقلابیوں کی صف میں شامل ہو گئیں۔ دیگر انقلابیوں کی طرح نازک بدن کملا کو بھی جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ ان کی زندگی کا باقی حصہ عدالت میں گزرا۔ آخر ہندوستان کی یہ شوہر پرست خاتون اپنے خاوند کو داغ مفارقت دے گئیں اور پنڈت جی سچ مچ بوڑھے ہو گئے۔

میں نے دوسری ملاقات میں پنڈت جواہر لعل نہرو کو امرتسر کی ملاقات یاد دلائی۔ ان کی اس گفتگو کا حوالہ دیا جو انھوں نے جیل کے مشاغل کے متعلق کی تھی۔ میں نے پوچھا

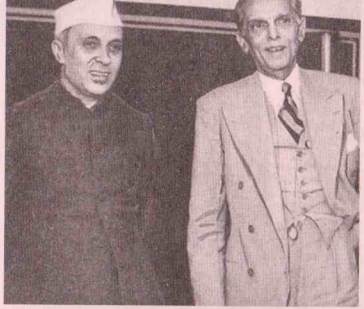

''پنڈت جی! حسرت موہانی جیسے لیڈروں کو جیل میں بڑی مشقت اٹھانا پڑی۔ وہ جیل میں چکی پر آٹا پیستے اور ہاتھ سے مونجھ بٹتے تھے لیکن آپ کو جیل میں محنت مشقت کا کیوں سامنا نہ کرنا پڑا؟''

پنڈت جواہر لعل حسب عادت جواباً مسکرائے اور کہا۔

''میں نے انگلستان میں تعلیم پائی۔ اس انگریز مجھے اپنے سے قریب تر سمجھتے تھے۔ ملی سیاسی سرگرمیاں چاہے کتنی ہی نامعقول ہوں، وہ اپنے معیار کے مطابق مجھ کم سے کم مہذب ضرور مانتے اور میرے ساتھ خاص رعایت کی جاتیں۔ جب میں ان مراعات کا مقابلہ اپنے ساتھیوں سے کرتا تو مجھے تکلیف ہوتی اور شرم آتی۔ مجھے ملنے والی مراعات کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ میں نے جیل میں 'تاریخ عالم کی جھلکیاں' جیسی معروف کتاب لکھی۔''

پنڈت نہرو سے پوچھا گیا ''آپ یورپ سے نیا دل و دماغ لے کر آئے۔ آپ گاندھی کی صحبت میں کیسے بیٹھ گئے؟''

پنڈت جی نے مسکرا کر کہا ''ہم دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتیں، تقریباً ہر موضوع پر بحث ہوتی۔ معاشیات، سیاست اور زندگی کے دیگر مسائل کے متعلق ہمارے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میری طبیعت کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا۔ چنانچہ مجھے مناسب آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔''

میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''جموں و کشمیر میں جنگ بندی بھارت کی درخواست پر ہوئی تھی۔ بھارت اور پاکستان نے اقوام متحدہ میں کشمیری عوام کا حق خود ارادیت تسلیم کیا تھا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اب بھارت کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے سے انکاری ہے؟'' پنڈت جواہر لعل نہرو کا چہرہ خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا۔

انھوں نے اچکن پر لگے گلاب کے پھول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''حق خود ارادیت کشمیریوں کا حق ہے۔ میں اور آپ حق خود ارادی کے راستے پر چل کر آزاد ہوئے ہیں لیکن اقوام متحدہ کی قرارداد منظور ہوئے عرصہ بیت گیا ہے۔ حالات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اگر پاکستان 1947ء یا اس کے فوراً بعد رضامند ہو جاتا تو کشمیر کے عوام اقوام متحدہ کی قرارداد سے مستفید ہو چکے ہوتے۔''

یہ تھی وہ آخری ملاقات جو اس کانگریس لیڈر سے ہوئی جن کی زندگی میں 1925ء سے 1927ء کا زمانہ بڑا پرآشوب تھا۔ وہ دو سال کی مدت میں اٹھارہ بار گرفتار ہوئے۔ لیکن انھیں اپنے ساتھیوں کی نسبت کم مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ یہ لیڈر 1910ء سے 1912ء تک دنیائے مغرب میں ''ہندوستان کا شہزادہ'' مشہور تھا۔ ان کے کپڑے پیرس میں دھلتے اور حجام وینس سے طلب کیا جاتا تھا۔

◆◆◆

عالمی ادب

کاروبار بڑھانے کا انوکھا گُر

پیٹر کنگ/ابوالفرح ہمایوں

بہت دنوں کا ذکر ہے، چند باصلاحیت اداکار دوستوں نے ایک تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ ہیرالڈ کولٹ کو تمام تجارتی انتظامات کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔ ہیرالڈ کولٹ ایک انتہائی ذہین منتظم تھا۔ اس نے پہلے ہی دن اندازہ لگا لیا کہ غیر معروف اداکار جس

ایک شخص کی قہقہہ بار کتھا، اُسے موقع سے فائدہ اُٹھانا خوب آتا تھا

قدر بھی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں، کمپنی اس وقت تک ترقی نہیں کر سکے گی، جب تک کوئی عوام کا پسندیدہ اور مقبول اداکار اس میں شامل نہ ہو۔

اس نے فی الفور ہنری گرانٹ سے رابطہ قائم کیا اور اسے اپنی ٹیم میں شامل ہونے پر آمادہ کرلیا۔ یہ کمپنی کی پہلی کامیابی تھی کہ انھیں ایک ہر دل عزیز اداکار کا تعاون حاصل ہو گیا۔ ہنری گرانٹ چار پانچ سال قبل ہی اداکاری کے میدان میں وارد ہوا تھا اور اس مختصر سے عرصے میں اس نے ہر طرف اپنی شہرت اور مقبولیت کا ڈنکا بجوا دیا تھا۔

ہنری گرانٹ کی شمولیت کسی بھی ڈرامے کے لیے کامیابی کی ضمانت سمجھی جانے لگی تھی۔ اس لحاظ سے ہیرالڈ کولٹ نے اپنی کمپنی ''دی فرینڈز تھیٹریکل'' کے لیے شہرت، دولت اور کامیابی کے خزانے کی چابی حاصل کرلی۔

بالآخر پہلے کھیل کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے لیے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے ''ہیملٹ'' کا انتخاب ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی یورپ کے دوسرے ممالک کے شائقین بھی ڈرامے دیکھنے کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ ہیرالڈ کولٹ انھیں بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ دوسرے ممالک سے آنے والے انگریزی زبان سے نابلد ہوں گے، یا اگر تھوڑی بہت جانتے بھی ہوں گے تو اس کی بنیاد پر کھیل کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یقیناً کوئی انتظام کرنا چاہیے کہ وہ ڈرامے کی کہانی اور اصل روح سے پہلے ہی واقف ہو جائیں، تاکہ انھیں ڈراما سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اس مشکل کا حل کولٹ کے زرخیز ذہن نے فوراً تلاش کرلیا۔ ڈرامے کے اہم نکات اس نے جمع کیے اور اس کا اطالوی، ہسپانوی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں ترجمہ کروا کے چھپوا لیا۔

ایک دن کولٹ کو ایتھنز سے ایک خط موصول ہوا، جس کے ساتھ کافی بڑی رقم کا ایک چیک بھی منسلک تھا۔ مسٹر کرلامبو نے لکھا تھا کہ وہ پچاس شائقین پر مشتمل ایک وفد کے ہمراہ ''ہیملٹ'' دیکھنے آ رہے ہیں۔ کولٹ نے بلا تاخیر مسٹر کرلامبو کو نشستیں روانہ کر دیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اُسے اچانک خیال آیا کہ پمفلٹ یونانی زبان میں تو شائع کرایا ہی نہیں۔ اس نے فوراً بھاگ دوڑ شروع کر دی، لیکن یونانی زبان جاننے والا کوئی نہیں مل رہا تھا۔ کولٹ کے لیے سخت مشکل آن پڑی۔

''یہ مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہونا چاہیے اور وہ بھی جلد از جلد۔'' کولٹ نے ایک اداکارہ کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں تو ایسا آدمی شاید ہی کوئی مل سکے۔'' اداکارہ سوزان نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''تم ایڈنبرا یونیورسٹی کیوں نہیں چلے جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں کوئی نہ کوئی یونانی زبان جاننے والا مل جائے گا۔''

''مشورے کا شکریہ۔ ایڈنبرا یونیورسٹی آنا جانا کچھ آسان نہیں۔ کوئی اور صورت اگر نہیں بنی تو پھر مجبوراً تمھاری تجویز پر عمل کروں گا۔''

کولٹ کچھ دل برداشتہ ہو کر اُٹھ گیا۔ سامنے ہی اسے ہنری گرانٹ نظر آ گیا۔ اس نے گرانٹ سے اپنی مشکل کا ذکر کر دیا۔

''یہ کون سی ایسی پریشانی کی بات ہے۔ تم فوراً وان فزجیرالڈ کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمھاری مشکل حل کر دے گا۔'' گرانٹ نے شان بے نیازی سے کہا۔

''یہ کون ذات شریف ہیں؟'' کولٹ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وان فزجیرالڈ ایک آئرش دکاندار ہے۔ ہائی اسٹریٹ پر اس کی ریڈی میڈ گارمنٹ کی بہت بڑی دکان ہے۔ وہ

ایک ہنس مکھ اور زندہ دل انسان ہے۔ ''تم آج ہی وہاں چلے جاؤ۔ اسے میرا حوالہ دینا، تمہارا کام فوراً ہو جائے گا۔''

''لیکن وہ آئرش ہے، کیا وہ یونانی زبان پر دسترس رکھتا ہے؟'' کولٹ نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ یونانی زبان بالکل اہل زبان کی طرح جانتا ہے۔ کافی عرصہ وہ ایتھنز میں رہا ہے اور اب بھی کاروباری سلسلے میں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' گرانٹ نے کولٹ کو آگاہ کیا۔

''یار! تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم خود ہی اس کے پاس چلے جاؤ اور ترجمہ کروا کے پمفلٹ بھی چھپوا لو۔ اخراجات کیشئر سے لے لینا۔'' کولٹ نے گویا گرانٹ کو حکم دیا اور گرانٹ نے فوراً ہامی بھر لی۔ ''میں وان کو ابھی پکڑتا اور جلد از جلد کام مکمل کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔'' دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے اپنے کام پر چل پڑے۔

تین دن بعد گرانٹ نے ترجمے کا پلندہ لا کر کولٹ کے حوالے کر دیا۔ ترجمہ چھپوا لیا گیا۔ پھر بالآخر وہ رات آن پہنچی، جس کا بے شمار لوگوں کو نہایت بے چینی سے انتظار تھا۔ پہلا شو انتہائی کامیاب رہا۔ ڈراما ختم ہونے کے بعد کولٹ نے چیدہ چیدہ شخصیتوں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران بات چیت ہوتی رہی اور تبصرے بھی ہوتے رہے۔

کولٹ نے مسٹر کرلامبو سے ان کی رائے دریافت کی۔

''واہ! ایسا عمدہ ڈراما اور پیشکش کا انداز اتنا خوبصورت، اداکاری بھی لاجواب تھی۔ میں تو آپ لوگوں کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوا۔'' مسٹر کرلامبو نے شاندار خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے یہ پمفلٹ ہمیں کیوں نہیں دیا تھا؟'' اور اس نے پمفلٹ کولٹ کے سامنے کر دیا، جو وان فزجیرالڈ نے یونانی زبان میں شائع کروایا تھا۔

کولٹ کے چہرے پر ایک فاخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''دراصل یہ آپ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ معززین کے لیے نہیں ہے۔ کمپنی نے ڈرامے کے اہم خیالات کا یونانی زبان میں ترجمہ کروایا ہے، تاکہ جو لوگ انگریزی زبان سے کما حقہ واقف نہیں، وہ ڈرامے کی روح کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔''

''کیا آپ نے اس ترجمے کو پڑھا ہے؟'' مسٹر کرلامبو نے چبھتی ہوئی نگاہ مسٹر کولٹ پر ڈالی۔

''نہیں، میں یونانی زبان سے ناواقف ہوں۔'' کولٹ نے اعتراف کیا۔

''ترجمے کا کام آپ لوگوں نے کس سے کروایا تھا؟'' مسٹر کرلامبو نے سوال کیا۔

''یہاں ایک دکاندار ہے، وان فزجیرالڈ، جو تیار شدہ ملبوسات کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ یونانی زبان جانتا ہے۔ ہم نے سارا کام اسی سے کروایا ہے۔'' کولٹ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا اچھا! میں سمجھ گیا۔ وان فزجیرالڈ بہت ہی چلتا پرزہ ہے۔ میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' مسٹر کرلامبو نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔ ''تجارت میں اس کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا خوب جانتا ہے۔''

''لیکن بات کیا ہے؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' کولٹ نے جز بز ہو کر کہا۔ ''آپ کو اس ترجمے میں کیا خامی نظر آئی ہے؟ براہ کرم بتائیے تاکہ میں اسے درست کروا لوں۔''

''میں آپ کو اس پمفلٹ کا ترجمہ انگریزی میں سناتا ہوں، تب آپ کی بے چینی رفع ہو جائے گی اور آپ لوگ جان لیں گے کہ وان فزجیرالڈ کتنا بڑا فن کار ہے۔'' اور مسٹر کرلامبو نے وہ پمفلٹ پڑھنا شروع کیا:

''ڈراما ''ہیملٹ'' مصنف: ولیم شیکسپیئر

بھارت کے سابق کرکٹ کپتان سارو و گنگولی کی سوانح عمری A Century is not Enough شائع ہو چکی۔ ایک دلچسپ اقتباس میں گنگولی بتاتے ہیں کہ جب 2004 میں بھارتی ٹیم پاکستان کے دورے پر تھی تو ایک رات وہ سیر سپاٹے کے لیے چوری چھپے ہوٹل سے نکل گئے لیکن ان کی واپسی سے قبل ہی اس بات کی اطلاع تب کے صدر پرویز مشرف کو پہنچ چکی تھی، جنہوں نے خود انہیں کال کر دی۔ گنگولی کہتے ہیں، انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ وسیم اکرم کی قاتل بالنگ کا سامنا کرنا اس سے زیادہ آسان ہوتا، لیکن صدر مشرف نے بات کی تو ان کا لہجہ نرم تھا۔

بھارتی ٹیم کو لاہور کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا اور سکیورٹی بے حد سخت تھی۔ پاکستان کے خلاف فتح حاصل کرنے کے بعد بھارتی کپتان اس قلعہ نما سکیورٹی کے حصار سے نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔ گنگولی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "نصف شب کے بعد کی بات ہے، مجھے پتہ چلا کہ میرے دوست لاہور کی مشہور فوڈ سٹریٹ جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے تاکہ وہاں کباب اور تندوری ڈش کا لطف اٹھا سکیں۔ میں نے اپنے سکیورٹی افسر کو مطلع نہیں کیا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ وہ ہمیں روک دے گا۔ میں نے صرف ٹیم منیجر رتنا کار شیٹھی کو بتایا اور ترچھی ٹوپی سے چہرے کو چھپاتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اصولوں کی خلاف ورزی ہے لیکن میں وہاں سے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ ہم کھانا ختم کرنے والے تھے کہ مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھے صحافی راجدیپ سردیسائی کی مجھ پر نظر پڑ گئی اور وہ چلا اٹھے ''سارو، سارو۔'' اب ہم مصیبت میں تھے۔ پھر میرے چاروں طرف لوگ جمع ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے بل ادا کر کے نکلنے کی کوشش کی لیکن دکاندار نے بل لینے سے انکار کر دیا۔"

گنگولی بخیر و عافیت واپس تو آ گئے لیکن ہوٹل پہنچے پر پتا چلا کہ صدر مشرف کو ان کی شرارت کی خبر پہنچ چکی تھی اور وہ فون پر ان سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں "صدر مشرف کا لہجہ نرم مگر ٹھوس تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگلی بار آپ باہر جانا چاہیں تو پلیز سکیورٹی کو مطلع کریں، ہم آپ کے ساتھ حفاظتی دستہ بھیجیں گے۔ لیکن پلیز مہم جوئی سے گریز کریں۔"

''ڈرامے کے ایک سین میں ایک کردار پولونیس اپنے بیٹے لاریز کو ملبوسات کے انتخاب کے بارے میں سمجھاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مختلف مواقع پر کون کون سے ملبوسات کب اور کس سلیقے سے استعمال کرنے چاہئیں۔ لباس کا درست انتخاب واقعی ایک مشکل کام ہے لیکن اس سے زیادہ نازک کام دکان کا انتخاب ہے۔ یوں تو لندن میں ہزاروں دکانیں ہیں، جہاں طرح طرح کے ملبوسات بھرے پڑے ہیں، لیکن ہائی اسٹریٹ پر واقع وان فزجیرالڈ کا اسٹور کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ وہاں انواع و اقسام کے ملبوسات موجود ہیں۔ مناسب دام، خوبصورتی، پائیداری اور بہترین تراش خراش اس دکان کا خاصہ ہے۔ 'ہیملٹ' کا ہیرو ہنری گرانٹ اپنا لباس یہیں سے خریدتا ہے۔ یہ دکان ہائی اسٹریٹ پر واقع ہے۔

جس طرح 'ہیملٹ' ایک ناقابل فراموش کھیل ہے، اسی طرح وان فزجیرالڈ بھی عظیم ہے۔ آپ اگر ایک بار وہاں چلے گئے تو پھر آئندہ کسی اور دکان پر جانے کا نام بھی نہ لیں گے۔''

عظیم ماں

فیروز الدین احمد

کڑی دھوپ میں گھنا سایہ

زندگی میں ہر سختی کو اللہ کی آزمائش جاننے والی باہمت ماں کا ولولہ انگیز ذکرِ حیات

وہ چار سال کی تھیں کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دس برس کی نہ ہوئی تھیں کہ ماں اللہ کو پیاری ہوئیں، تیس برس کی تھیں کہ شوہر چل بسے۔ بیوگی کو مشکل سے سال گزرا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہوا۔ بیوگی کا بوجھ کیا کم تھا کہ اس میں خانہ بربادی کا بوجھ بھی شامل ہو گیا۔ سر چھپانے کا ٹھکانا اور دال روٹی کا سہارا بھی گیا۔ چھے چھوٹے چھوٹے بچے سینے سے لگائے، آباؤ اجداد کا شہر دلی چھوڑ، خالی ہاتھ، اللہ کے آسرے پر، پنجاب کے ایک گاؤں میں گوشہ نشین ہو گئیں۔ بُرا وقت پڑا تھا، ایسے میں دُور پرے کے رشتہ دار تو کیا یاد رکھتے، اپنے سگے بھی بھلا بیٹھے۔

کسمپرسی اور گم نامی کا ایک طویل دور شروع ہوا جس میں دال روٹی کھاتی اور اللہ کا شکر بجا لاتی رہیں۔ دنیا کی تمام دلچسپیاں ختم ہو گئیں، صرف ایک آرزو رہ گئی تھی کہ میرے بچے، میری زندگی میں، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ دعا ماں کے دل سے نکلی تھی، بھلا کیسے قبول نہ ہوتی لیکن ابھی دو تین بچے مشکل سے اس قابل ہی ہوئے تھے کہ اپنی سدا کی دکھی ماں کو سکھ کی چند گھڑیاں دے سکیں کہ اُوپر والے کا بلاوا آ گیا ”اے بچوں کی رکھوالی ماں! تیری زندگی کا مشن پورا ہو گیا۔ تو نے عمر بھر بہت ذہنی صدمے اور جسمانی تکالیف اُٹھائیں۔ اب تجھے بھی سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ آ اور میری رحمت کے سائے میں آرام کی نیند سو جا۔“ یوں معصوم پاک روح اپنے مالک سے جا ملی۔

امی جان کو دنیا سے رخصت ہوئے خاصا عرصہ بیت چکا۔ لوگ کہتے تھے وقت کے ساتھ دل کے گھاؤ بھر جاتے ہیں۔ لیکن خدایا! یہ کیسا زخم ہے؟ اتنا وقت گزر چکا لیکن کسک کم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ بار بار وہ پیارا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ ستواں ناک، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، چھوٹا سا حساس دہانہ، کھچڑی بال، بلند اور روشن پیشانی، میانہ قد، گورا رنگ اور چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ جو ہر وقت چودھویں رات کی نکھری دودھیا چاندنی کے مانند نورانی چہرے پر بکھری رہتی۔

جب زیادہ خوش ہوتیں تو یہ مسکراہٹ اور دل فریب ہو جاتی۔ ایسا لگتا فرشتہ مسکرا رہا ہے۔ بے اختیار دل چاہتا کہ انھیں چوم لوں۔ لاکھ کوشش کی کہ وہ ممتا بھری مسکراہٹ مجھے یاد نہ آئے۔ ان کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کرتا، کوئی ذکر چھیڑتا بھی ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ بات کا رخ موڑ دوں لیکن اُن کی یاد ایک جھرنے کی طرح، دل دماغ اور روح پر گرتی رہتی ہے۔ وقت بے وقت وہ نظروں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ پہلے ان کا جیتا جاگتا مسکراتا چہرہ اور پھر اچانک راولپنڈی کے سنٹرل گورنمنٹ اسپتال کے ایک بے رحم وارڈ میں ان کی سرد میت! جسم پر ٹھنڈی سفید چادر، مسکراتے سفید نازک چہرے کے گرد بندھی سفید کپڑے کی ایک پتلی سی پٹی اور ہونٹوں پر وہی فرشتوں والی مسکراہٹ جسے موت بھی نہ ہٹا سکی۔

نعمت کی صحیح قدر اس کے چھن جانے کے بعد ہوتی ہے۔ جب تک وہ زندہ تھیں ہمیں احساس ضرور تھا لیکن اس شدت اور گہرائی سے نہیں کہ ماں کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد زندگی میں کتنا بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی ہر محبت میں آلائش ہو سکتی بلکہ ہوتی ہے۔ صرف ایک ممتا ہر آلائش سے پاک، کھرے سونے کی طرح ہے۔

وہ ایک عظیم ماں اور صحیح معنوں میں ایک مومنہ تھیں۔ ان کی ساری زندگی پریشانیوں، بیماریوں، تکلیفوں اور صدموں میں گزری۔ ان کی جگہ کوئی باحوصلہ مرد بھی ہوتا تو شاید حوصلہ ہار دیتا، لیکن انھوں نے ہر سختی کو اللہ کی طرف سے آزمائش جانا اور اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

چودہ جولائی 1946ء کو میرے والد، چالیس برس کی عمر میں، حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے تو قدرت نے ہم چھے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیا۔ والد کے انتقال سے ہم نہ صرف اپنے باپ کے سائے اور محبت سے محروم ہوئے بلکہ اس آمدنی سے بھی جوان کے دم سے تھی۔ لے دے کے دلی کی شہری جائیداد کا کرایہ رہ گیا جو بمشکل دو سو روپے ماہوار ہو گا۔ یہ آمدنی ہم چھے بھائی بہنوں کے تعلیمی اخراجات اور پورے گھر کے خرچ کے لیے یکسر ناکافی تھی۔ اس نشتر کی چبھن وہی محسوس کر سکتا ہے جس پر یہ بپتا پڑی ہو۔

مجھے یاد ہے والد کے انتقال کے بعد ہمارے کھانے پینے، رہن سہن اور تعلیمی سہولتوں کا معیار بہت گر گیا۔ ہمیں

انگریزی اسکولوں سے اُٹھ کر محلے کے پرائمری اسکول میں آنا پڑا۔ گھر میں اکثر آلو اور ساگ کی سبزی پکتی۔ گھر میں چہل پہل کے بجائے ہر وقت ایک مردنی سی چھائی رہتی۔ گھر میں ہم بچے، امی جان، دادی اماں اور ایک نوکر رہتے تھے۔

یہ وقت امی جان کے لیے بہت کٹھن تھا۔ ایک طرف جوان شوہر کی موت کا غم، دوسری طرف چھے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کی بھرپور ذمہ داری، تیسری طرف سخت مالی مشکلات کا سامنا، چوتھی طرف اپنی بوڑھی ساس یعنی ہماری دادی اماں کو سنبھالنا جو اپنے اکلوتے بیٹے کی جوان جہان موت کی وجہ سے دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے بیزار ہو گئی تھیں۔ ایک تیس سالہ بیوہ کے لیے جس کی ساری زندگی گھر کی چار دیواری میں بسر ہوئی ہو، اس سے بڑا کٹھن امتحان اور کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ ناقابل یقین عزم کے ساتھ اس امتحان میں پوری اُتریں۔ ان کے دل پر جو گزر رہی ہو گی، وہ ہر حساس انسان محسوس کر سکتا ہے۔ ہم بچوں کے سامنے وہ معمول کے مطابق کام کرتیں کہ ہمارے دل سے یہ احساس اگر ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے کہ ہم یتیم ہو گئے ہیں۔ وہ اب ہمارے لیے صرف ماں ہی نہیں باپ بھی بن گئی تھیں۔ اس عظیم سانحے کو ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ 1947ء کے خوں ریز فسادات شروع ہو گئے۔ بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ، صدیوں سے اسلامی سلطنت ہند کے مرکز اور نشان دلی میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔

دلی میں ہمارے محلے تراہا بیرم خاں کے پچھواڑے، ہندو اور سکھوں کے محلے تھے۔ سکھ اور ہندو غنڈوں کے خوں خوار جتھے بھیڑیوں کی طرح راتوں کو مسلمانوں کے محلوں پر شب خوں مارتے۔ پولیس اور فوج تماشا دیکھتی رہتی یا الٹا ان درندوں کی مدد کرتی۔ بعض اوقات رات رات بھر ایک طرف سے ست سری اکال اور دوسری طرف سے اللہ اکبر کے نعرے گونجتے رہتے۔ رات کے سناٹے میں جب یہ بھرپور نعرے گونجتے تو دل پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔ جن گھروں میں مرد تھے، وہ مسلح ہو کر ساری ساری رات اپنے گھروں کی حفاظت کرتے۔ ہمارے گھر کا واحد جوان مرد دلی کے ایک قبرستان میں منوں مٹی تلے سو رہا تھا اور گھر میں اس کی بوڑھی بیوہ ماں، جوان بیوہ اور چھے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے، بے یار و مددگار پڑے تھے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اُن دنوں امی جان کے دل اور دماغ میں کیا محشر بپا تھا؟ رات کی وحشت ناک تاریکی میں ان کے اعصاب کا کیا حال ہوتا ہو گا؟ لیکن ان کے چہرے پر وہی نورانی سکون اور ہونٹوں پر فرشتوں کی مسکراہٹ بھی رہتی۔

وہ بلاشبہ قیامت کا دور تھا۔ ہزاروں خاندان جن کے گھروں میں مرد تھے، دلی میں قیام کے دوران یا پاکستان ہجرت کے وقت زخمی یا شہید کر دیے گئے۔ اس گھر میں جہاں دو بیوہ عورتوں اور چھے کم سن یتیموں کے سوا کوئی نہ تھا، کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ امی جان اپنے چھے بچوں اور بوڑھی ساس کو دامن میں سمیٹے ہوائی جہاز کے ذریعے دلی سے پاکستان آ

ذکر اللہ کے فوائد

☆ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔
☆ دل سے فکر و غم دور کرتا ہے۔
☆ دل میں فرحت اور سرور پیدا کرتا ہے۔
☆ بدن کو اور دل کو قوت بخشتا ہے۔
☆ چہرے اور دل کو منور کرتا ہے۔
☆ رزق کو کھینچتا ہے۔
☆ قیامت کے دن انسان حسرت سے محفوظ رہتا ہے۔
☆ ذکر کرنے والے کو ہیبت اور حلاوت کا لباس پہناتا ہے۔

فیروز الدین احمد اکتوبر 1937ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی، قائداعظم یونیورسٹی اور ہارورڈ سے تعلیم پائی۔ 1962ء پاکستان کی سول سروس سے وابستہ ہوئے۔ ریٹائرمنٹ تک مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی میں مضامین بھی قلمبند کرتے رہے۔ زیرنظر تحریر آپ کے مجموعہ مضامین ''اوراقِ پریشاں'' سے لی گئی ہے۔

گئیں۔ مالی پریشانی کے باوجود نہ صرف گھریلو ملازم بلکہ اس کے چھوٹے بھائی کو بھی ہوائی جہاز کا کرایہ دے کر ساتھ لائیں۔

والد کے انتقال کے بعد مالی تباہی میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ 1947ء کی ہجرت نے پوری کر دی۔ آمدن کا آخری سہارا بھی ختم ہو گیا۔ ملتان کے ایک گاؤں کبیر والا میں، ہماری نئی مہاجرانہ زندگی کا آغاز اس شان سے ہوا کہ پلنگ تھے نہ بستر، پتیلی، پیالی نہ سردیوں سے بچاؤ کے لیے مناسب کپڑے۔ جمے جمائے پشتینی گھر کا تنکا تنکا دلی میں رہ گیا تھا اور یہاں اللہ کے نام کے سوا کچھ نہ تھا لیکن امی جان کے چہرے پر وہی سکون اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ سب کچھ ہو گیا تھا لیکن ان کو دیکھ کر لگتا کہ کچھ نہیں ہوا۔ کبھی کبھی جب پرانی یادیں بہت ستاتیں تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہ نکلتی لیکن جلد ہی روزمرّہ کے کاموں میں لگ جاتیں۔ چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ آ جاتی جسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ برسات کے سورج کا خیال آتا۔ جب برسات کی کالی گھنگھور گھٹائیں برس چکتی ہیں، بادل چھٹتے ہیں اور ان کے پیچھے سے دھلا دھلایا، چمکیلا سورج تبسم ریز نمودار ہوتا ہے، کچھ ایسی ہی مسکراہٹ ان کے چہرے پر ہوتی۔

ماضی کی کتاب انھوں نے بند کر دی تھی۔ ان کی توجہ اب پوری طرح حال اور مستقبل پر تھی۔ اپنے نہیں، بچوں کے حال اور مستقبل پر۔ اس دوران وہ کئی موذی بیماریوں کا شکار ہوئیں۔ دو تین بار بڑے جان لیوا آپریشن ہوئے، سارا زیور بک گیا اور پھر کپڑوں کی باری آئی۔ لیکن وہ بڑے حوصلے سے سب کچھ سہتی رہیں۔ کہتی تھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں ہیں اور میں اپنے مولا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھ گنہگار کو ان آزمائشوں میں پورا اُترنے کی توفیق دے۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے لیکن انسان ناسمجھ ہے، اگر کوئی چیز اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی تو بے چین ہو جاتا ہے۔

ایک آدھ دفعہ ہم بچوں نے اس موضوع پر ان سے بحث کی۔ انھوں نے بڑے تحمل سے سمجھایا، ''دیکھو تم میرے بچے ہو، تم نہیں جانتے لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے دل میں تمھارے لیے کتنی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ماں باپ سے ستر گنا زیادہ چاہتا ہے۔ اگر انسان خود ہی نافرمان اور سرکش نہ ہو تو خدا تعالیٰ ہر چیز میں اس کے لیے بہتری کرتا ہے۔ بعض چیزیں ہمیں شروع میں بری لگتی ہیں لیکن اگر اللہ سے بہتری کی امید رکھو تو آخر کار تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ بظاہر بری چیزوں میں ہی بالآخر تمھارے لیے بہتری تھی۔''

یہ سبق نہ صرف قول بلکہ عمل سے اتنی بار میرے سامنے دہرایا گیا کہ آج یہ میرے ایمان کا جزو بن چکا اور میرے تجربے نے اس کو حرف بحرف صحیح ثابت کیا۔ نماز پڑھتیں تو اتنے خضوع و خشوع سے، جیسے اللہ تعالیٰ اُن کی پرانی جائے نماز کے بالکل سامنے کھڑا ہے۔ نماز کے بعد، گڑگڑا، گڑگڑا کر دعا مانگتیں۔ بچوں کی امان و سلامتی کی دعائیں لب پر ہوتیں۔ میں جب تعلیم کے سلسلے میں کراچی یا بعد میں انگلینڈ گیا تو ان کا خط ہمیشہ اس طرح شروع ہوتا ''برخوردار فیروز میاں سلمہ، بعد دعائے سلامتی ایمان و درازی عمر کے واضح ہو۔'' بیٹے کے لیے

عمر کی درازی سے پہلے ایمان کی سلامتی کی دعا ہوتی۔

زندگی کے آخری چند برس میں، جب نسبتاً کچھ آسودگی ہوئی تو بیواؤں، یتیموں اور غرباء کو دلی کے بیتے دنوں کی طرح، چھپ چھپاتے، حسب توفیق زکوٰۃ، صدقات اور خیرات دینے کا پرانا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہم تک کو علم نہ تھا کہ کس کس کو اور کیا دیتی ہیں؟ یہ انکشاف اس وقت ہوا جب ان کی میت آخری آرام گاہ میں اُتارنے کے لیے راولپنڈی سے کبیر والا پہنچی جہاں ان کی تھوڑی سی ذاتی زرعی زمین تھی۔ ایک دن پہلے کبیر والا میں ہمارے جاننے والوں کو اس سانحے کی اطلاع مل گئی تھی۔ جونہی جنازہ پہنچا جاننے والوں کے علاوہ بوڑھی بیوائیں اور عورتیں جنھیں میں نے پہلے کبھی دیکھا تک نہ تھا، اپنی لاٹھیاں ٹیکتی، خاموشی سے، روتی دھوتی اپنی محسنہ کا آخری دیدار کرنے پہنچ گئیں۔

ان تمام نیک اعمال کے باوجود دل میں بے حد خوفِ خدا تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ کسی نے خدا کا نام لیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایک طرف حوصلے اور عزم کا یہ عالم کہ آپریشن پر آپریشن ہو رہے لیکن آنکھ میں آنسو اور ماتھے پر شکن تک نہیں، دوسری طرف دل گدازی کا یہ عالم کہ کسی کو ذرا سی تکلیف پہنچی یا فلم یا ٹی وی پر کوئی غمناک منظر آیا تو آنسو رواں ہو گئے۔ جب اس طرح کا کوئی المناک منظر شروع ہوتا تو ہم تفریحاً کن انکھیوں سے انھیں دیکھتے کہ اس پر وہ روتی ہیں یا نہیں؟ ذرا سی دیر میں پرس کھلتا، سفید رومال نکلتا اور آنکھوں کے پاس پہنچ جاتا۔ عینک اُترتی اور رومال کی نوک آنکھوں کے گوشے صاف کر رہی ہوتی۔ ہم ہنستے کہ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ بچوں کی سی معصومیت سے کہتیں، ''میاں! کیا کروں؟ اللہ نے دل ہی ایسا بنایا ہے۔''

طبیعت میں بے حد سادگی تھی۔ میک اپ تو بڑی بات، ہم نے انھیں زیور کا شوقین بھی نہ دیکھا۔ جوانی میں جب عورتوں کو زیورات کا شوق ہوتا ہے، ان کا زیور ان کی ساس کے پاس محفوظ رکھا رہا۔ زیور کام آیا تو جسم کی زینت بن کر نہیں، ہمیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے۔ اچھی ساڑیوں کا شوق تھا لیکن وہ خریدنے کے بعد الماریوں یا صندوقوں میں بند پڑی رہتیں اور خود سادہ سوتی ساڑی پہنتیں۔ گھر میں مسہریاں موجود تھیں لیکن ہمیشہ بان کی چارپائی پر سوتیں۔ کہتیں مجھے اسی پر راحت ملتی ہے۔ بہت محنت سے خوش ذائقہ کھانے پکاتیں لیکن دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتیں۔ خود پورے دن میں صرف ایک وقت کھاتیں، وہ بھی بہت تھوڑا سا اور بالکل سادہ۔ کھانے کی میز پر تازہ کھانوں کے ساتھ اگر بچا ہوا کھانا ہوتا تو دوسروں کو تازہ سالن پیش کرتیں اور خود باسی کھانا اپنی پلیٹ میں ڈالتیں۔ جواب یہی ہوتا کہ مجھے اس میں مزہ آتا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کے مقابلے میں، جو کار سے اُتر کر دو قدم چلنا کسر شان سمجھتی ہیں یا چار قدم چل کر تھک جاتی ہیں، انھوں نے آخر دم تک روزانہ شام کو تین چار میل سیر کا معمول جاری رکھا۔

شعبان کی بات ہے، رات کے کھانے کے بعد باتیں شروع ہو گئیں۔ امی جان نے کہا جن لوگوں کو آنے والے سال میں مرنا ہوتا ہے، ان کا نام پندرہویں شعبان کی رات آسمانوں میں مُردوں کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے۔ دنیا کے لوگ انھیں زندہ کہتے ہیں لیکن آسمانوں میں ان کا شمار مُردوں میں ہوتا ہے۔ بات ہنسی ہنسی میں ختم ہو گئی۔ رمضان شروع ہوا تو میں نے اس بار آپ کافی کمزور لگ رہی ہیں۔ روزے نہ رکھیں۔ کہنے لگیں، ''اچھا ٹھیک ہے۔'' ایک دو روزے گزر گئے، میں نے خیال نہ کیا۔ تیسرے چوتھے دن، ان کو زیادہ کمزور دیکھ کر پوچھا ''کیا آپ نے پھر روزے شروع کر دیے؟'' چہرے پر عجیب سی دل فریب مسکراہٹ پھیل گئی بولیں، ''میاں! خبر نہیں، یہ مبارک مہینا پھر دیکھنا نصیب ہو نہ ہو۔ دُکھ، بیماری تو زندگی کے ساتھ ہے لیکن یہ مبارک مہینا بار بار نہیں آتا، روزے مجھے رکھنے دو۔'' انھوں نے یہ بات کچھ اس حتمی انداز میں کہی کہ مجھے کچھ اور کہنے کا یارا نہ رہا۔

رمضان المبارک کی سات تاریخ، صبح کے ساڑھے دس بجے ہوں گے، میں اپنے دفتر میں تھا۔ ایک میٹنگ میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ بہن کا فون آیا: ''فوراً پہنچیں، امی جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' وہ ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے مطب سے بول رہی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا: ''بس آپ فوراً پہنچ جائیں، ڈاکٹر صاحب سب کچھ بتا دیں گے۔''

میٹنگ جہنم میں گئی، میں فوراً پہنچا۔ ڈاکٹر کے مطب میں امی جان لکڑی کے ایک کھرے بنچ پر لیٹی تھیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا آخری دفعہ دل کا دورہ پڑا تھا۔ درد کی شدت سے تڑپ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا آپ انھیں فوراً سنٹرل اسپتال راولپنڈی کے امراض قلب کے سپیشلسٹ کے پاس لے جائیے۔ میں نے انھیں اپنی کار کی پچھلی نشست پر لٹایا۔ ان کا سر میری بہن کی گود میں تھا۔ سفید اور سیاہ بالوں کی لٹیں بے ترتیبی سے لٹک رہی تھیں، چہرے پر پسینے کی لڑیاں بہہ رہی تھیں، سانس اُکھڑا ہوا تھا، طبیعت سخت بے چین تھی، درد کی شدت سے بے پناہ کراہ رہی تھیں لیکن ساتھ ساتھ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا ورد جاری تھا۔

سڑک پر بے حد رش تھا اور کار نکالنے کی جگہ نہ تھی۔ ان کے درد کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''خدایا'' میں نے دل میں کہا: ''کیا میری ماں، طبی امداد ملنے سے پہلے میری نظروں کے سامنے دم توڑ دے گی؟'' میری کار بڑی مشکل سے، ہجوم اور قسم قسم کی گاڑیوں کو چیرتی باہر نکلی۔ راستہ صاف ملتے ہی میں نے گاڑی کو بھگایا اور تھوڑی دیر میں مری روڈ پر پہنچ گیا جو سیدھی سنٹرل گورنمنٹ اسپتال جاتی ہے۔ کار کی پچھلی نشست سے کلمہ طیبہ کا ورد، سانس کی دھونکنی اور درد سے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ لیکن میں نے اپنے پر پورا ضبط کر کے کہا: ''امی جان حوصلہ کیجیے۔ اگر آپ نے ہمت ہار دی تو بہت مشکل پیدا ہو جائے گی۔''

یہ سنتے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں، ''میاں فکر نہ کرو، ریاحی تکلیف ہے۔ انشاء اللہ جلد دُور ہو جائے گی۔'' بیماری پر فتح پانے کا یہ جذبہ دیکھ کر میرے تمام وسوسے دُور ہو گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جس طرح ماضی میں انھوں نے بڑی بیماریوں اور جان لیوا آپریشنوں کا مقابلہ کیا، اسی طرح وہ اپنے عزم اور ہمت سے اس موذی مرض کو بھی فتح کر لیں گی۔ دل کے مریض دل کے دورے کے دوران یہ نہیں کہا کرتے:

''یہ ریاحی تکلیف ہے انشاء اللہ جلد دور ہو جائے گی۔''

کار سنٹرل گورنمنٹ اسپتال راولپنڈی کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ ان کے درد کی شدت میں اچانک اضافہ ہوا۔ میں نے کہا، آپ کار میں لیٹی رہیے، میں امراض قلب کے سپیشلسٹ کو یہاں بلا کر لاتا ہوں۔ مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ میں کتنا بڑا احمق ہوں۔

اگلے آدھ پون گھنٹے، مجھ پر اور امی جان پر جو کچھ گزری، وہ اتنی شرم ناک حد تک ناقابل یقین داستان ہے کہ اگر یہ آپ بیتی نہ ہوتی تو میں یقین نہیں کرتا۔ میں جب امراض قلب کے سپیشلٹ صاحب بہادر کے کمرے میں، جن کا نام ڈاکٹر حفیظ اختر تھا داخل ہوا تو وہ ایک ماڈرن خاتون سے محوِ گفتگو تھے۔ میں نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب میری والدہ کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ وہ باہر کار میں ہیں۔ ازراہِ کرم انھیں دیکھ لیں۔'' سپیشلسٹ صاحب بہادر نے کہا: ''آج میں ڈیوٹی پر نہیں۔'' میں نے چونک کر دیکھا، دل چاہتا تھا کہوں، ''ڈاکٹر حفیظ اختر صاحب! اگر آپ ڈیوٹی پر نہیں، تو اسپتال میں کیا کر رہے ہیں؟'' ڈاکٹر کی ڈیوٹی تو دکھی انسانیت کی خدمت ہے۔ ایک مرتے شخص کو بچانے کے لیے ڈیوٹی کے گھنٹے مقرر تو نہیں ہوا کرتے اور پھر یہ تو دن کا وقت تھا۔ وہ سرکاری اسپتال کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کو رات کے دو بجے گھر سے تو نہیں

بلایا جا رہا تھا۔

یقین نہ آتا تھا کہ ایک ایسے شخص کے منہ سے جس نے انسانی جانیں بچانے کا مقدس حلف اُٹھایا ہے اور جو ایک انتہائی سینئر اور ’ذمے دار‘ ڈاکٹر ہے، یہ الفاظ نکل سکتے تھے۔ جب میں ان کے زہریلے الفاظ کے وار سے کچھ سنبھلا تو کہا ”ڈاکٹر صاحب! میں شاید آپ کو سمجھا نہیں سکا۔ میری والدہ کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور اسپتال کے دروازے کے باہر کار میں پڑی ہیں۔“

صاحب بہادر نے بہت اطمینان سے کہا: ”اس صورت میں آپ انھیں ایمرجنسی روم کے ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔“

غصے اور پریشانی میں اب بے بسی بھی شامل ہو چکی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے کہا: ”ڈاکٹر صاحب! میں انھیں ایک مطب سے سیدھا آپ کے پاس لا رہا ہوں۔ اس ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ کیس عام ڈاکٹروں کا نہیں بلکہ امراض قلب کے سپشلسٹ کی فوری توجہ چاہتا ہے۔ یہ میری والدہ کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر آپ باہر نہیں جا سکتے تو میں انھیں یہیں لے آتا ہوں، آپ صرف ایک منٹ انھیں دیکھ لیں۔

”صاحب بہادر ناراض ہو گئے اور قدرے درشتی سے کہا: ”اگر یہ واقعی ان کی زندگی کا سوال ہے تو آپ یہاں اپنا وقت اور ان کی زندگی ضائع کر رہے ہیں۔ اُنھیں فوراً ایمرجنسی میں لے جائیے۔“ مجھے معلوم تھا کہ ایمرجنسی کا ڈاکٹر امراضِ قلب کا ماہر نہیں ہو سکتا لیکن دیوار گریہ سے مزید سر پھوڑنے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں اُلٹے پاؤں اپنی کار کی طرف بھاگا۔ دل کے مریض کے لیے زیادہ ہلنا جلنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ظالم اسپتال میں میرے لیے یہ خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے درد دل سے کراہتی ضعیف ماں کو کار کی پچھلی نشست سے اُٹھایا۔ پسینے سے شرابور، سانس اُکھڑا ہوا، بے چارگی سے ہائے ہائے کرتیں، وہ میرا اور میری بہن کا سہارا لیے، اسپتال کی کھچا کھچ بھری نیم تاریک غلام گردش میں، لوگوں کے دھکے کھاتیں اور اپنے آپ کو گھسیٹتیں ایمرجنسی وارڈ پہنچیں۔

میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر کو بتایا کہ یہ گزشتہ تقریباً ایک گھنٹے سے دل کے شدید درد میں مبتلا ہیں اور اب تک کوئی طبی امداد نہیں ملی۔ ڈاکٹر نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی، جاں بہ لب مریض کو گھورا، ایک کاغذ نکالا اور پوچھا: ”نام؟“ بتایا گیا۔ ولدیت یا زوجیت؟ بتائی گئی۔ عمر؟ عرض کی گئی۔ اس کے بعد آپ نے، پورے اطمینانِ قلب سے، دو تین کالم اور پ

اخلاق، نیت و اعمال

☆ مومنوں میں کمال ترین ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

☆ صاحب ایمان شخص اپنے اچھے اخلاق سے بھی ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں جو رات بھر نفل نماز پڑھتے اور دن بھر روزے رکھتے ہیں۔ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

☆ تم میں مجھ کو زیادہ محبوب اور آخرت میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب وہ شخص ہو گا جس کے اخلاق اچھے ہوں اور تم سب میں مجھے سب سے زیادہ برا لگنے والا اور آخرت میں سب سے زیادہ دور رہنے والا وہ شخص ہو گا جن کے اخلاق برے ہوں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

☆ خوش اخلاق کی لوگ عزت کرتے ہیں اور اللہ کے ہاں بھی بہت عزت ہوتی ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

☆ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

لیے۔ میں عجب کرب کے عالم میں تھا۔ یہ اسپتال تھا یا مجسٹریٹ کی عدالت؟ یا قصائی کی دکان؟ دل کے جان لیوا مرض میں مبتلا مریض کو فوری توجہ کی ضرورت تھی اور یہاں دفتری خانہ پُری میں انتہائی نازک وقت ضائع کیا جا رہا تھا۔ دل کہتا تھا کہ اس شخص کا قلم توڑ دوں، لیکن دماغ جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں۔ میں نے کہا: ”ڈاکٹر صاحب! آپ شاید میری ماں کی حالت نہیں دیکھ رہے۔ انھیں آپ کی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر نے میری اس مہمل درخواست پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس دوران، اسپتال کے ایک چپراسی نے ڈاکٹر کی طرف کاغذ کا ایک اور پرزہ بڑھایا جو کسی اور کام کے بارے میں تھا اور کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب فوراً چپراسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ دل کے مریض کے سامنے لڑائی دنگا مریض کی فوری موت کا سبب بن سکتا ہے لیکن جلادوں کے اس منحوس مرگھٹ میں میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اچانک میری رگوں میں خون ابلنے لگا۔ میں پوری قوت سے چپراسی پر چلایا: ”میری ماں مر رہی ہے اور تم لوگ وقت ضائع کر رہے ہو۔ خدا کی قسم! اگر انھیں کچھ ہو گیا تو میں تم سب کو بھی جان سے مار دوں گا۔“ سب لوگ اُچھل پڑے۔ امی جان نے چونک کر مجھے خاموشی سے دیکھا، آنکھوں میں درد تھا اور احتجاج بھی۔ میری اس چیخ کا وہ اثر ہوا جو اتنک میری کئی عاجزانہ درخواستوں کا نہ ہوا تھا۔ شوروغل یک دم ختم ہو گیا، چپراسی گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ایمرجنسی کے ڈاکٹر صاحب ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ امی جان کو ساتھ کے کمرے میں لے جا کر انجکشن دیا، معائنہ کیا اور فوراً کہا کہ یہ کیس بہت سنجیدہ نوعیت کا اور امراض قلب کے سپیشلسٹ کا ہے، فوراً ان کے پاس چلے جائیے۔ میں نے کہا: ”حضور! انھوں نے ہی تو آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ کہنے لگے: ”یہ میرا نہیں، ان کا کیس ہے، فوراً لے جائیے اور یہ پرچی ساتھ لے جائیں۔“

اسپتال کی کھچا کھچ بھری غلام گردش میں، ایک بار پھر امی جان میرا اور میری بہن کا سہارا لیے لوگوں کے دھکے کھاتی، شوروغل برداشت کرتی، ایمرجنسی سے پا پیادہ دوبارہ سپیشلسٹ صاحب بہادر کے کمرے میں پہنچیں۔ موصوف نے اپنی بھویں سکیڑ کر مجھے پھر گھورا، میں نے گھبرا کر صرف پرچی آگے بڑھائی۔ آپ نے ایک نگاہِ غلط انداز پرچی پر ڈالی، کچھ چونکے اور اسپتال کے ایک ملازم کو بلا کر کہا ان کو ابھی سامنے والے کمرے میں لے جائیے اور فوراً ای سی جی کیجیے۔ یہ وہ معمولی سا کام تھا جس کے لیے امراض قلب کے سپیشلسٹ صاحب بہادر نے دل کے جان لیوا مرض میں مبتلا ایک روزے دار ضعیف خاتون کا علاج کرنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ ضائع کیا تھا اور مرض بھی وہ جس میں فوری اور مناسب علاج نہ ملنے کی صورت دل کی دھڑکن کسی بھی لمحے بند ہو سکتی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت میں یہ مرکزی حکومت کا سب سے بڑا اسپتال تھا جو بنیادی طور پر سرکاری ملازمین اور ان کے اہل خانہ کے علاج کے لیے بنایا گیا تھا۔ آج یہاں مرکزی حکومت کے ذمے دار سرکاری ملازم کی جاں بہ لب ماں کا علاج اس طرح کیا گیا کہ ایسی موذی بیماری میں جہاں مریض کو اسپتال میں قدم رکھتے ہی اسٹریچر پر ڈال کر فوری طبی امداد، ای سی جی اور آکسیجن دینی چاہیے، کم سے کم آدھا انتہائی قیمتی اور اہم گھنٹا ضائع کیا جا چکا تھا۔

بہرکیف امی جان کو ای سی جی کے کمرے میں لے جایا گیا۔ بدستور پیدل پریڈ جاری تھی۔ ان کا لباس پسینے سے شرابور ہو چکا تھا، ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں۔ وہ آج بھی روزے سے تھیں لیکن پیاس سے ان کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ انھوں نے پانی مانگا۔ دارالحکومت کے سب سے بڑے اسپتال میں دل کے مریض کو پانی دینے کے لیے ایک

گلاس تک نہ تھا۔ شاید جان بہ لب مریض کو روزے کا احترام کرنا مقصود تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ایک کمرے سے دوسرے میں گیا لیکن کہیں سے ایک گلاس نہ مل سکا۔ اس یزیدیت سے مایوس ہو کر اسپتال سے باہر بھاگا۔ سڑک پار کی اور سامنے ہوٹل سے ایک خالی گلاس مانگ کر لایا۔ روزے دار ماں نے، مرض الموت کی شدت میں، اپنا ساتواں اور زندگی کا پہلا اور آخری روزہ توڑا۔

ای سی جی لینے کے بعد اسپتال کے اسسٹنٹ صاحب نے حکم دیا کہ بستر خالی کریں۔ وہ امراض قلب کے وارڈ میں کام کر رہے تھے۔ ان سے زیادہ یہ بات کون جانتا ہوگا کہ دل کے مریض کے لیے چلنا پھرنا کس قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ان کا حکم تھا کہ بستر خالی کیا جائے، چنانچہ خالی کیا۔ میری بہن اور میں نے امی جان کو پھر سہارا دیا اور وہ درد میں تڑپتی، پیدل گھسٹتی، ایک برآمدہ، سپیشلسٹ صاحب بہادر کے کمرے میں پہنچیں اور ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئیں۔ اس بار صاحب بہادر کو کچھ رحم آیا۔ آپ نے اسسٹنٹ کو بلا کر ڈانٹا کہ قلب کے مریض کو مستقل بستر یا اسٹریچر پر رکھا جاتا ہے، تم ان کو بار بار کیوں چلا پھرا رہے ہو؟ اس ڈانٹ کے بعد، اب اسٹریچر کی تلاش شروع ہوئی۔ امی جان بدستور کرسی پر ڈھلکی درد سے کراہتی رہیں۔ خبر نہیں کتنی دیر بعد اسٹریچر آیا تو تکیہ غائب تھا۔ سپیشلسٹ صاحب ایک بار پھر ناراض ہوئے۔ اب تکیے کی تلاش شروع ہوئی۔

بالآخر ایک بدبودار میلا چیکٹ تکیہ آیا اور وہ کام جو امی جان کے اسپتال میں قدم رکھتے ہی شروع ہونا چاہیے تھا تقریباً پون گھنٹہ بعد اس کی ابتدا ہوئی۔ یعنی انھیں اسٹریچر پر ڈال اس وارڈ میں داخل کیا گیا جہاں دل کے ان مریضوں کو رکھا جاتا ہے جن کی زندگی سخت خطرے میں ہو۔ وارڈ میں پہنچتے ہی فوراً انھیں آکسیجن لگا دی گئی اور وہ آنکھیں میچ کر بستر پر لیٹ گئیں۔ وہ ایک ایسی معصوم، بے بس، بے یار و مددگار بچی کی طرح لگ رہی تھیں جس کے بال قبل از وقت سفید ہو گئے ہوں۔ میں نے بے ساختہ جھک کر زندگی میں پہلی بار، ان کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ بوجھل پپوٹے اٹھے، ماتا بھری بیمار نظریں مجھ پر پڑیں، غور سے دیکھا اور گھٹی ہوئی آواز میں کہا:

"فیروز میاں! میرے بیٹے! مجھے تو رونے سے منع کر رہے تھے اور خود رو رہے ہو۔" یہ منگل کا دن تھا، رمضان کی ساتویں اور ستمبر کی چوبیس تاریخ تھی۔

منگل سے ہفتے تک، وہ چار دن اس وارڈ میں رہیں۔ عالمی طبی روایات کے مطابق اس وارڈ میں مریض چوبیس گھنٹے ڈاکٹروں کی مستقل نگرانی میں رہتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اسپتال میں مریضوں کو اس سے زیادہ توجہ کسی اور وارڈ میں نہیں ملتی، لیکن چار دن کے مختصر عرصے میں، میں نے طبی توجہ اور عالمی روایات کی پاسداری کے وہ عبرت ناک مناظر دیکھے کہ اب بھی جب یاد آتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ جب اس وارڈ میں بے رحمی کا یہ عالم ہے تو دوسرے وارڈوں میں کیا ہوتا ہوگا؟

جمعے کی شب میں رات بھر امی جان کے پاس رہا۔ یہ ان کی زندگی کی آخری رات تھی۔ ان کو کئی طاقتور خواب آور انجکشن دیے گئے تاکہ وہ آرام کرتی رہیں۔ میں گدا بچھائے ان کے بستر کے ساتھ نیچے زمین پر بیٹھا تھا۔ رات کے کسی پہر اچانک ان کی آنکھ کھلی، مجھ پر نظر پڑی، بے چین ہو کر کہا: "تم سو کیوں نہیں جاتے؟" میں نے دل میں کہا: "بیماری ماں! خدا تجھے رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ اس حالت میں بھی، تجھے اپنا نہیں، اپنے بیٹے کی نیند کا خیال ہے؟" عرض کیا: "دن میں خوب سو چکا تا کہ رات کو جاگ سکوں۔" اس جواب سے مطمئن ہو گئیں، آنکھ لگ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہڑبڑا کر جاگ اٹھیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں آہستہ آہستہ پھر میری طرف اٹھیں، کچھ دیر غور سے دیکھتی رہیں پھر دھیمی آواز آئی۔

"اگر سوتے نہیں ہو تو کم از کم لیٹ ہی جاؤ۔ بیٹھے کیوں ہو؟"

میں نے کہا: "ابھی اوّل وقت ہے بیٹھنے کو دل چاہ رہا ہے۔" خاموش ہو گئیں لیکن ماتا کو قرار کہاں آتا تھا۔ بیٹے کی تکلیف کے احساس نے تمام طاقتور خواب آور انجکشنوں کا اثر زائل کر دیا تھا، بے چین ہو کر بولیں: "اگر بیٹھا ہی ہے تو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھو اور دیکھو تکیہ کمر کے پیچھے رکھ لو۔" رات کی تاریکی میں خبر نہیں، کہاں سے گرم گرم پانی میرے رخساروں پر بہنے لگا۔ خدایا! یہ کیسی ماتا تھی کہ زندگی کی صرف چند گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں، موت سر پر منڈلا رہی تھی لیکن بیٹے کی نیند کا خیال بار بار اُن کی نیند اُڑائے دے رہا تھا۔

پھر اچانک مجھے کہا: "بیٹے! اپنے بچوں میں سے کسی کو ڈاکٹر ضرور بنانا۔ خاندان میں ایک ڈاکٹر ضرور ہونا چاہیے، اس کے بغیر یہ اسپتال والے توجہ نہیں دیتے۔" اسپتال کی انتظامیہ پر کتنا گہرا لیکن کتنا شریفانہ طنز تھا۔ خیالات کی رو، وہ دوبارہ اپنے ساتھ والے بستر کے مریض کی طرف گئی۔ پوچھے لگیں:

"میرے ساتھ والے بستر پر بے چارہ ٹرک ڈرائیور کل بہت تکلیف میں تھا، اب کیسا ہے؟" میں انھیں کیسے بتاتا کہ وہ مظلوم کل اس اسپتال کے ظالم عملے سے ہمیشہ کے لیے جا چکا۔ میں نے گول مول جواب دیا جس میں صداقت کا عنصر بھی موجود تھا۔ "پہلے سے بہت بہتر ہے۔" کہنے لگیں:

"اللہ کا شکر ہے، بے چارہ بہت تکلیف میں تھا۔" میں نے انھیں سرخ گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ دکھایا جو کل میں گھر کے باغیچے سے خاص طور پر ان کے لیے بنوا کر لایا تھا۔ پُرشفقت مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ سفید گلاب سا کھڑا کھل اٹھا۔ محبت سے پھولوں کو دیکھا اور کہا: "پھولوں سے مجھے عشق ہے۔"

دن چڑھے میں گھر واپس آ گیا۔ میرا چھوٹا بھائی اور بہن ان کے پاس پہنچ گئے۔ تھوڑا سا ستانے کے بعد دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسپتال سے فون آیا۔ اس بار پھر میری بہن بول رہی تھی: "فوراً اسپتال پہنچیں۔" پہلی بار میرے اندر کوئی بولا: "منحوس خبر سننے کے لیے تیار رہو۔" جب میں اسپتال پہنچا تو میرا بھائی اور بہن حالتِ صدمے میں، وارڈ کے باہر غلام گردش میں کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور وارڈ کا عملہ اندر تھا۔ میں نے بھائی سے پوچھا: "تم نے امراضِ قلب کے سپیشلسٹ کو اطلاع دی؟"

اس نے ایسے اپاہج لہجے میں جیسے وہ کسی دوسری دنیا سے بول رہا ہو، کہا: "نہیں" اور بدستور ساکت و جامد کھڑا رہا۔ لگتا تھا کسی نے اس کی سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی ساری قوتیں سلب کر لی ہوں۔ میں سپیشلسٹ صاحب بہادر کو بلانے بھاگا، بڑی مشکل سے وہ دستیاب ہوئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد، جب میں انھیں ساتھ لے کر وارڈ میں پہنچا تو دروازہ کھل چکا تھا۔ امی جان کی ناک سے آکسیجن کی نالی نکالی جا چکی تھی۔ نازک سے گورے کھڑے کے گرد سفید کپڑے کی ایک پتلی پٹی بندھی تھی۔ سرخ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ تر و تازہ ان کے پاس رکھا تھا۔ سفید گلاب کی پنکھڑیوں پر زردی کھنڈ چکی تھی۔ گہرے نیلے آسمان کے نیچے سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ آج رمضان کا گیارہواں دن تھا۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔

اسپتال سے میت لے جانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میرا دل پھٹ رہا تھا لیکن ایمبولینس حاصل کرنے کے لیے اسپتال کے ایک کمرے سے دوسرے تک اور ایک سے دوسرے شخص تک پھرتا رہا۔ بڑی مشکل اور بہت احسان کے ساتھ ایک غلیظ ٹرک نما ایمبولینس مہیا کی گئی۔ ان کی پاک میت اس میں رکھی گئی اور میں خود کار میں بیٹھ کر سینرل گورنمنٹ اسپتال راولپنڈی سے نکلا۔ زندگی میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ بیٹا ایک گاڑی میں اور ماں دوسری میں سوار تھے۔ کار اور ایمبولینس مری روڈ سے گزر رہے تھے۔ یہ وہی مری روڈ تھا جہاں بارہا وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ کر گزری تھیں اور آج ان کی میت اس سڑک پر سفر کر رہی تھی۔ عمر بھر، مجھے کبھی کوئی سڑک اتنی

سنسان اور ویران محسوس نہیں ہوئی۔

امی جان کے انتقال کے بعد کچھ دیر تک تو یقین نہ آیا کہ وہ واقعی مر چکی ہیں۔ جب یقین آیا تو دلوں پر قیامت گزر گئی۔ ہم راتوں رات ان کی میت لے کر راولپنڈی سے کبیر والا روانہ ہو گئے۔ زندگی کی سب سے قیمتی متاع لکڑی کے تابوت میں ڈالے، آنکھوں میں نیند کی جگہ آنسوؤں کی آبشار لیے اگلے روز کبیر والے پہنچے۔ یہ وہی قصبہ تھا جہاں دلی چھوڑنے کے بعد، انھوں نے زندگی کے سولہ سال گمنامی اور غربت میں گزارے تھے۔ ان کو اس جگہ سے پیار تھا، اکثر کہتی تھیں میری خواہش ہے کہ میرا اپنا کوئی کونا ہو جہاں میں سکون سے رہوں اور کوئی مجھے تنگ نہ کرے۔ قدرت نے آج انھیں وہ سکون اور کونا میسر کر دیا تھا جہاں اب کوئی انھیں کبھی تنگ نہ کرے گا۔ کورے سفید لٹھے کی معطر چادر میں لپٹی، نہائی دھوئی، وہ ایک چارپائی پر لیٹی تھیں۔ آج بھی وہ مسہری پر نہیں، بان کی چارپائی پر تھیں۔

گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو گھر آپنے، سانجھ بھئی چودیس

آنکھیں بند تھیں اور ایک دل فریب تبسم اب بھی ہونٹوں پر تھا جو مومن کی نشانی ہے۔ جو بھی ان کا چہرہ دیکھتا، کہتا ارے یہ تو سو رہی ہیں۔ خدا کی قسم! اتنا عظیم الشان بے کراں سکون تو میں نے زندگی میں بھی ان کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔ عصر کے قریب میت اُٹھانے کا وقت آیا۔ میں آخری دیدار کے لیے جھکا۔ کیا بتاؤں ان چند لمحوں میں دل پر کیا گزر گئی؟ میں نے بلند بخت پیشانی کا بہت نرمی اور انتہائی ادب سے بوسہ لیا۔ ادب سے کیونکہ وہ ایک عظیم ماں تھیں، نرمی سے کہ ان کی آنکھ نہ کھل جائے، بیٹے کی بے آرامی کا خیال آ کر کہیں پھر بے چین نہ ہو جائیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب کو روکے رکھا، کہیں یہ نہ کہہ دیں: ”بیٹے مجھے تو رونے سے منع کرتے تھے، خود رو رہے ہو۔“ پیشانی برف کی طرح سفید اور سرد تھی۔

رمضان کی بارہ تاریخ، نماز عصر کے بعد، انھیں لحد کی گود میں اُتار دیا گیا۔ لگتا تھا جیسے کوئی معصوم بچی، سارے دن کے بعد تھک ہار کے، اپنے پنگھوڑے میں جا لیٹی ہو۔ مٹی دینی شروع کی گئی۔ یقین نہ آتا تھا کہ اپنی ماں کو ہم اپنے ہی ہاتھوں سے مٹی تلے دبا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شفاف آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ میری نظروں کے سامنے جمعے کی رات اور اس کی شفاف چاندنی گھومنے لگی اور اس کے بعد کا طوفان، تیز ہوائیں اور گہرے سیاہ بادل۔ اگر اس وقت کوئی میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتا: ”بس اب تیاری کر لو اُوپر والے کی طرف سے تمہارا بلاوا بھی آن پہنچا ہے، تو بخدا مجھے، خوشی، غم اور نہ ہی حیرت ہوتی۔ میں بغیر کسی احساس کے اپنے آپ کو بلانے والے کے حوالے کر دیتا۔ زندگی اور موت دونوں بے مقصد لگ رہے تھے۔

میں جب کبھی ان کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک معصوم اور پاک روح تھی جو لاکھوں کروڑوں سال اپنی باری کا انتظار کرتی رہی کہ وہ دنیا میں آئے، خود غم سہے لیکن دوسروں کے دکھ بانٹے، اپنے تمام عزیز و اقارب کی دل و جان سے خدمت کرے، بچپن میں اپنی ماں، نانی اور اپنے بھائی کی۔ جوانی میں اپنے شوہر اور اپنی ساس کی، ضعیفی میں اپنے بچوں کی، اور جب اس کا مشن پورا ہو جائے تو کسی کو دکھ دیے بغیر، کسی سے کچھ کہے بغیر، کسی سے کچھ لیے بغیر، خاموشی اور سکون سے، دوبارہ اپنے اصل مقام پر پہنچ جائے جہاں وہ قیامت تک آرام کرتی رہے گی۔ جب اس روز پیدا کرنے والا پوچھے گا: ”اے چھے بچوں کی رکھوالی ماں! تو نے دنیا میں کیا کیا؟“ تو وہ اپنا سفید سر اُٹھا کر، بصد احترام، آہستہ آہستہ کہے گی: ”میرے مولا! تو نے جس کام کے لیے مجھے دنیا میں بھیجا تھا میں اپنی بساط بھر اس کو پورا کیا۔“ اور پھر کائنات کی بسیط فضاؤں میں، ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تجلی تبسم ریز ہوگی۔ دنیا کی ہر چیز منور ہو جائے گی

اور حکم ہوگا کہ جنت الفردوس کو ابھی اُٹھا کر لاؤ اور ممتا کے قدموں میں لا کر رکھ دو۔

☆☆☆

امی جان کی نصیحت اکثر یاد آتی ہے کہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ خود کو بہت قائل کرتا، سمجھاتا ہوں۔ زمانہ بھی کتنا بیت چکا لیکن اب بھی جب اکیلا ہوتا ہوں اور رات کی تنہا ساکن گھڑیوں میں، اس پیاری ماں کی یاد رات کی رانی کی خوشبو کی طرح، دل، دماغ، جسم اور جان میں پھیل جاتی ہے تو ایک ہُوک سی اٹھتی ہے اور دل چیختا ہے: ”فیروز! اپنے خدا سے پوچھ، تیرے ہر کام میں بہتری سہی، لیکن میری پیاری ماں کو مجھ سے یوں چھین لینے میں آخر کیا بہتری تھی؟“

اچانک وہ پیارا مسکراتا چہرہ اُبھرتا ہے۔ آنکھیں روشن ہیں ہونٹوں پر وہ فرشتوں والی مسکراہٹ پوری طرح جلوہ گر ہے۔ روشن آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہیں، جیسے کہہ رہی ہوں: ”بیٹے! کیا میرے جاتے ہی، زندگی بھر کا بار بار پڑھایا ہوا سبق اتنی جلدی بھلا بیٹھے؟“

میرے والد کے انتقال کے ساڑھے پانچ ماہ بعد، ماہنامہ ”ادیب“ دہلی کے شمارہ جنوری 1947ء میں، امی جان کا تحریر کردہ ایک خط شائع ہوا۔ عنوان تھا۔ ”بچھڑے ہوئے ساتھی سے۔“ متن حسب ذیل ہے:

”ساتھی تو کیا گیا، دل کی دنیا ہی برباد ہو گئی، تیرے ساتھ، یہ دنیا کتنی رنگین کس قدر دل فریب اور کیسی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا میں اکیلی ہی نہیں دنیا اور اس کی ہر چیز میرے ساتھ مسکرا رہی ہے۔ مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب کوئی نہیں۔

وہ شام کا انتظار کتنا دل فریب ہوتا تھا۔ گھنٹے پر بار بار نظر جاتی۔ پانچ بج گئے، اب دفتر کا کام ختم ہوگا، بس اب آنے والے ہوں گے، ”لو وہ آ گئے“ آنکھیں سر سے لے کر قدموں تک نثار ہوتیں، دل خوشی سے پھولا نہ سماتا، تیری ایک محبت بھری نگاہ دل کے باغ کو ہرا کر دیتی اور تیری ذرا سی تکلیف سے روح بے چین ہو جاتی لیکن اب وہ سب باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔

تُو چند دن کے لیے پردیس جاتا، دل اُداس ہو جاتا۔ گھر میں سب ہوتے مگر تیرے بغیر ویران معلوم ہوتا۔ کان روزانہ ڈاکیے کی آواز پر لگے رہتے۔ وہ چند دن ماہ و سال کے برابر معلوم ہوتے۔ انتظار کے دن ختم ہو جاتے، واپسی کا دن مژدہ جاں فزا لاتا، پھولوں کا ہار تیار ہوتا۔ ابھی آنے میں چند گھنٹے باقی ہوتے مگر ہر آہٹ پر تیرے آنے کا گمان ہوتا اور جب تیرا چہرہ نظر آ جاتا تو دل کنول کی طرح کھل جاتا۔ پیارے ساتھی! اب وہ انتظار کہاں؟

تیرے بغیر یہ دنیا کتنی پھیکی کتنی اُداس اور کتنی ویران نظر آتی ہے، گویا اس میں اب کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ تیری ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ دل میں دھواں سا اُٹھتا ہے۔ آنکھیں مینہ برساتی ہیں۔ شام اب بھی ہوتی ہے، پانچ کی ٹن ٹن پر آنکھیں حسب معمول دروازے پر استقبال کو جاتی ہیں لیکن ناکام واپس آتی ہیں۔ پیارے ساتھی! تو اب کہاں ہے؟

آنکھیں تیری صورت اور کان تیری آواز سننے کو بے قرار ہیں، لیکن تو جہاں گیا ہے وہاں سے کوئی واپس نہیں پلٹا لیکن جو یہاں ہے ان میں ہر ایک وہاں جائے گا۔ قانون قدرت میں کسی کو دخل نہیں، تیرا وقت آ گیا تو چلا گیا۔ میرا وقت آ رہا ہے، پروردگار عالم سے دست بہ دعا ہوں کہ ایمان کے ساتھ تجھ سے ملائیں۔

”خاک ایسی زندگی پر، تم کہیں اور ہم کہیں
چھوٹ جائیں موت کے ہاتھوں، جو نکلے دم کہیں“

28 ستمبر 1974ء کو وہ ”ایمان کے ساتھ“ اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی سے جا ملیں۔ ”تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، میرے نیک بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“ (القرآن کریم) ◆◆◆

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

چمنِ خیال

مجرم کی آزادی جرم کی آزادی

جس ملک میں قانون پر عملدرآمد نہ ہو اور قانون شکنی عام ہو، وہاں معاشرتی بگاڑ ایک لازمی امر ہے۔ ایسے معاشرے میں مجرم بے خوف ہو جاتا ہے۔ اسے قانون شکنی سے ڈر نہیں لگتا۔ یوں مجرم کی آزادی گویا جرم کی آزادی بن جاتی ہے۔ جرم کو جب موقع ملے وہ بڑھتا، پھیلتا اور خوب پروان چڑھتا ہے۔ ایسے معاشرے میں جب ایک چھوٹا مجرم اپنے سے بڑے مجرم کو آزاد بنا خوف و خطر دندناتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا حوصلہ بھی بلند ہو جاتا ہے۔ یہ چیز اسے ترغیب دیتے ہوئے مزید جرم پر آمادہ کرتی ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ جہاں قانون کئی کئی قتل کرنے والوں کو کچھ نہیں کہتا تو بھلا پھر وہاں اس کے ایک دو جرائم سے کون سا آسمان گر پڑے گا۔ چنانچہ ایک ایسی شروعات ہوتی ہے جس کا اختتام نہیں ہوتا۔ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ پھر کسی کے لیے کسی کی جان لینا گویا مچھر مارنے برابر ہو جاتا ہے۔ ایک سلسلہ وحشت اور بربریت کی نہ ختم ہونے والی شروعات ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص اربوں، کھربوں کی کرپشن اور لوٹ مار کرنے والوں کو آزاد، کھلے عام، بلا خوف و خطر اور پرتعیش زندگیاں گزارتے ہوئے دیکھتا تو اس کا بھی من للچاتا ہے۔

وہ یہ سوچتا ہے کہ جب سب ہی فیضیاب ہو رہے ہیں تو وہ کیوں نہ اس فیض میں شامل ہو جائے۔ اربوں، کھربوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ پایا تو بھلا ہزاروں اور لاکھوں کا کوئی کیا بگاڑ پائے گا۔ لالچ کی چنگاری اس کے من میں بھی پھوٹتی ہے۔ یہ چنگاری پھر حرص کے تھپیڑوں سے شعلہ بن جاتی ہے۔ یوں معمولی سی شروعات کا خاتمہ ممکن نہیں ہوتا۔ سینکڑوں، ہزاروں کی یہ لوٹ مار پھر لاکھوں کروڑوں پر بھی نہیں رکتی۔ چنانچہ اس ضمن میں اگر فوری اقدامات نہیں اُٹھائے جاتے تو آہستہ آہستہ پورا معاشرہ اس آگ کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ سب جرم کی ڈگر پر چل پڑتے ہیں اور اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس گنگا میں ہاتھ دھونا شروع کر دیتے ہیں۔

یوں کرپشن پروان چڑھتی اور معاشرے کے ہر شعبہ میں سرائیت کر جاتی ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ پھر اس سے بچ نہیں پاتا۔ دھوکا، فریب ہر طرف اور ہر چیز میں شروع ہو جاتا ہے۔ معاشرے کا ہر فرد، ادارہ، ہر طبقہ اور شعبہ اس کی زد میں آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ معاشرہ روحانی و اخلاقی انحطاط اور زبوں حالی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جزا اور سزا سے ماورا معاشرے میں کمزور اپنی کمزوری اور طاقتور کی دلیری سے ڈرتا ہے۔ لہٰذا چاپلوسی پروان چڑھتی ہے۔ خدا ترسی، صلہ رحمی کم اور شخصیت پرستی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایسے معاشروں میں فرد کی فوقیت کا سارا دارومدار مال اسباب پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اخلاقیات دم توڑ دیتی ہیں۔ اسٹیٹس اور مال و اسباب کی خاطر ساری اخلاقی اقدار بھسم ہو کر مٹی میں مل جاتی ہے۔ سرکشی سر چڑھ کے بولتی ہے۔ یوں مال، مال دار کی جانب اور غربت، غریب کی جانب دوڑی چلی جاتی ہے۔ اونچ نیچ کا جنم ہوتا اور بھوک و افلاس ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ اور انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی انفرادی طور پر جیتا ہے نا کہ اجتماعی طور پر۔ ہر طرف ''میں'' شروع اور ''ہم'' کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفادات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ برائی دیکھ کر بھی نظرانداز کر دی جاتی ہے۔ اعلیٰ اقدار رفتہ رفتہ دم توڑ دیتے اور ساتھ ہی ساتھ اچھائی اور برائی کی تشریحات بھی بدل جاتی ہیں۔

(ولی خیام، لاہور)

☆☆☆

غریب کی فکر

چینی بکے گی تو کاشتکار کو رقم ملے گی، پلازہ بنے گا تو مزدور کو دہاڑی ملے گی، پیزا بکے گا تو باورچی خانہ چلے گا، گاڑی چلے گی تو ڈرائیوروں کو روٹی ملے گی، بھٹا دہکے گا تو بھٹا مزدور کھانا کھائے گا اور بھی سارے کام صرف غریب کے درد کی خاطر کیے جاتے ہیں جبکہ غریب تو ان فیکٹریوں کا خام مال ہے۔ ادھر مرا دوسرا مل جاتا ہے۔ دہاڑی دار، دہاڑی دار ہی رہے گا اور شاید اس کی اولاد کا مقدر بھی دہاڑی ہی ہو لیکن مالک کی دولت بڑھتی رہتی ہے۔ ایک مل سے دوسری مل بنتی رہتی ہے۔ شور مزدور کے درد کا اور فکر اپنی دولت کے کم نہ ہونے کی۔ یہ نظام بدل نہیں سکتا جب تک ان دولت مندوں لٹیروں کے نمائندے شکل بدل بدل کر قوم پر مسلط ہوتے رہیں گے۔

اللہ کا فرمان ہے کہ یہ دولت جو ہم نے تمہیں دی ہے اس میں غریبوں کا حق ہے۔ اس لیے مزدوری کے علاوہ منافع میں بھی غریب کا حصہ ہونا چاہیے۔ اس کی صحت، رہائش اور بچوں کی تعلیم بھی مالکان کا فرض ہونا چاہیے۔ اس طرح مزدور کی اولاد کو بھی آگے بڑھنے کا موقع مل سکے گا۔ ورنہ موجودہ نظام سے تو غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

کراچی شپ یارڈ میں ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ ہے کوئی جو انصاف دلائے؟ شپ یارڈ منسٹری آف دفاعی پیداوار کے ماتحت ہے جہاں یونین پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ جب سے لاک ڈاؤن کا سلسلہ ہوا ہے، ہمارا ایم ڈی سب کو ملازمت پر بلا رہا ہے۔ میں تو گاڑی یا موٹر سائیکل سے چلا جاتا ہوں کیونکہ اب میں بھی انتظامیہ کا حصہ ہوں مگر بے چارہ غریب مزدور کیسے جائے؟ کہاں شپ یارڈ کہاں سرجانی ملیر یا کوئی اور علاقہ۔

اسی حماقت میں اب تک تین سے چار مریض کرونا میں مبتلا ہو چکے مگر وہ کہتا ہے میں مراد علی شاہ یا عمران خان کے ماتحت نہیں۔ ہم فوجی لوگ ہیں اور اپنی مرضی سے ادارہ چلائیں گے۔ جو نہیں آرہے ان کی چھٹیاں کاٹ لی ہیں اور

وارننگ جاری کردی ہے۔ پہلے تو یونین آواز اُٹھاتی تھی مگر اب وہ نہیں ہے۔ ہو سکے تو یہ معاملہ حکمرانوں تک پہنچا دیجیے، بے چارے غریب ملازمین کا بھلا ہوگا۔

(پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی، کراچی)

☆☆☆

ویب سائٹ اور شمارہ اپریل

اس دفعہ خوشگوار احساس ہوا اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ جب ویب سائٹ پر پایا۔ ہماری حسرت تھی کہ کبھی اردو ڈائجسٹ کا شمارہ ویب سائٹ پر پڑھتے اور وہ بھی بالکل تازہ شمارہ۔ خوبصورت انداز میں پی ڈی ایف شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا اور ساتھ ہی ہر مضمون انفرادی طور پر خوبصورت رنگوں اور تصاویر کے ساتھ بھی موجود تھا۔ یہ ایک خوبصورت اقدام تھا بھلے کورونا وائرس کی وجہ سے اُٹھایا گیا مگر ہمیں اچھا لگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ہمیں ڈیجیٹل شمارہ بھی پڑھنے کو ملتا رہے گا۔

مضامین بھی اچھے تھے خاص طور پر تاریخ کا بدلتا دھارا بے حد نفع اور جامع تھا۔ الفاظ ایسے کہ قارئین کے دل میں اُترتے محسوس ہوئے، لہجہ ایسا جو کورونا جیسی آفت کے آگے ڈھال کے مانند محسوس ہوا۔ تجاویز ایسی کہ دل اش اش کر اُٹھا۔ یقیناً محترم طیب اعجاز قریشی مبارک باد کے حقدار ہیں جن کے قلم کی بدولت یہ خوبصورت تجزیہ ہم تک پہنچا۔

نامساعد حالات اور وبا کی غیر معمولی صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے کامیابی سے پرچہ نکالنا بلاشبہ داد طلب کاوش ہے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ اردو ڈائجسٹ نے ہمیشہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے شمارہ اپریل تمام قارئین تک بخوبی پہنچایا۔ شکریہ اُردو ڈائجسٹ۔ (حمید بلوچ۔ کوئٹہ)

☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ نام کے ساتھ ہی بے شمار معتبر اور مستند لکھاریوں کا نام ذہن میں آ جاتا ہے اور بلا شبہ یہی اس جریدے کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ اس کے ساتھ بے حد معزز اور بڑے نام جڑے ہیں۔ جن کی تحاریر کا اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونا ہی اس کے مستند اور منفرد ہونے کا ثبوت ہے۔

خاص طور پر تاریخی اور اسلامی مضامین ہم بے جھجک اس یقین کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ اس میں اگر تحریر شامل ہے تو یقیناً مستند معلومات پر مبنی ہوگی۔ اردو ڈائجسٹ اس لیے بھی ہمارا فخر ہے کہ اس نے کبھی معیار پر سمجھوتا نہیں کیا۔ تحریروں کی تعداد پر نہیں بلکہ معیار کو ملحوظ خاطر رکھا۔ آج کل کے مفاد پرست دور میں بھی اردو ڈائجسٹ اپنی برسوں پرانی پہچان اور شناخت قائم رکھے ہوئے ہے۔ پیسے کے لالچ میں بھی اس جریدے میں ہم نے بے تکے اوٹ پٹانگ اشتہار چھپتے نہیں دیکھے۔ حالانکہ آج کل کے دور میں اشتہاروں کے ذریعے پیسا کمانا کیا مشکل ہے؟ مگر آفرین ہے اس میگزین کی اخلاقی اقدار اور روایات پر، کہ اس نے روپے کمانے کا ذریعہ بنانے کے بجائے اسے ہمیشہ قارئین اور نسلِ نو کو نافع اور سبق آموز پیغامات دینے کا ذریعہ بنایا اور قوم کی تربیت کا بیڑا اُٹھاتے ہوئے اس میں کبھی اخلاق سوز تحاریر یا کہانیاں شامل نہ کیں۔

اداریے ہوں یا تجزیے، مدیران نے ہمیشہ سچی اور کھری دو ٹوک بات کر کے یہ ثابت کیا کہ ہر ادارہ چاپلوسی نہیں کرتا بلکہ حق بات کہنے والے آج بھی موجود ہیں۔ اللہ پاک اس میگزین کو اسی طرح دن دگنی رات چوگنی ترقی سے نوازے اور مدیران اور ان کی ٹیم بلاشبہ مبارک باد کی مستحق ہے۔

(محمد اویس شیخ، لاہور کینٹ)

●●●

تبصرۂ کتب

عافیہ جہانگیر

آج کا زمانہ عجب نفسا نفسی کا ہے۔ خصوصاً نسلِ نو میں اسلام اور قرآن سے متعلق معلومات کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ سوائے ان کے، جن کا مضمون اسلامیات ہو۔ قرآن زندگی کے ہر معاملے میں، ہر مسئلے میں نہایت وضاحت کے ساتھ ہمیں مکمل راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ راہنمائی ہر موضوع کے اعتبار سے بالکل مکمل اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت کا واضح ثبوت ہے۔

میرے ہاتھ میں اس وقت انتہائی خوبصورت کتاب ہے۔ میں ورق ورق اسے پڑھ رہی اور مجھے خوشی ہے کہ مصنفہ نے کس طرح ہمارے معاشرتی پہلو اور مسائل کو قرآن کی روشنی میں انتہائی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قرآن کو اگر سمجھنا ہے تو یہ کتاب بہت معاون ثابت ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کتاب کو مرتب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ ایسا کون سا خیال تھا جس نے مصنفہ کو یہ کارِ خیر کرنے پر اُکسایا۔ آیئے خود مصنفہ کے خیالات جانتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''خیال ہے کہ ہمیں متحد ہونا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک جیسا سوچیں۔ متحد ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہماری ہر چیز ہر بات ایک جیسی ہو۔ متحد ہونے کا مطلب ہے کہ ایک دوسرے سے اختلافات ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو برداشت کریں۔ خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ اسے متحد ہونا کہتے ہیں۔ اسلام کے فریم ورک میں رہتے ہوئے ہم اپنا جو بھی نظریہ رکھتے ہیں، اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں۔

''دنیا میں ہر کام ہماری منشا کے بنسبت ہوتا یا جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا نہیں ہوتا۔ ہم اپنے عقائد و نظریات کے معاملے میں ایک دوسرے کو نہیں بلکہ اللہ کو جواب دہ ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ ہم کیا ہیں اور کہاں کہاں غلطی کرتے ہیں مگر وہ معاف کرنے والا رحیم و کریم ہے۔ وہ ذات ہمیں معاف کر دیتی ہے۔

''ہمیں تو بس یہ سیکھنا ہے کہ اختلافِ رائے کو کس طرح برداشت کیا جائے..... کس طرح اپنے اندر اتنی قوتِ برداشت لائی جائے کہ ہم ایک دوسرے کو آزادی سے سکون کا سانس لینے دیں۔ ہم ایک امت ہیں، ہمارا کلمہ ایک ہے، ہمارا آخری رسول ﷺ ایک ہے، ہمارا قبلہ ایک ہے، ہماری کتاب ایک ہے، قرآن ایک ہے۔ جب ہم ان باتوں پر متحد ہیں تو ہمیں اختلافِ رائے کو برداشت کرتے ہوئے متحد رہنا ہوگا۔''

یہ کتاب پڑھتے ہوئے میرے دل میں بھی یہی خیال اُجاگر ہوا کہ متحد رہنے کے لیے قرآن پڑھنا اور سمجھنا بہت ضروری ہے۔ قرآن ہر موضوع ہر مسئلے پر ہماری راہنمائی کرتا ہے، چاہے وہ ذاتی ہو یا معاشرتی۔

قرآن پاک اتنی مکمل، جامع اور واضح کتاب ہے جس

میں ہر نصیحت ہر انسان کے لیے انتہائی آسان کر دی گئی ہے۔ اسے سمجھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا کبھی زندگی کے کسی مقام پر گھاٹے میں نہیں رہ سکتا۔ یہ کتاب ہر صاحبِ ایمان کے لیے ہدایت، علم اور حکمت کا سر چشمہ ہے۔ بات صرف اس پر غور کرنے کی ہے۔ یہ ہر دور کی کتاب ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے دل کی بصیرت ہونا ضروری ہے۔ دل کا روشن ہونا ضروری ہے۔

ہماری کوتاہی یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو سمجھنا تو درکنار، پڑھنا بھی کم کر دیا ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت صرف تب محسوس ہوتی ہے جب ہم پر کوئی مشکل آن پڑے، جب ہمارا کوئی عزیز ہم سے بچھڑ جائے، اس کے ایصالِ ثواب کے لیے یا جب مادی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں تو دولت زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے وظیفہ کے طور پر اس کی پاک سورتیں پڑھنا ہی ہمارے لیے اب قرآن کا مفہوم رہ گیا ہے۔

مصنفہ کا تعلق چونکہ بحیثیت پیشہ قانون سے ہے لہٰذا انھوں نے اس کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کی کہ زندگی کے ہر شعبے میں قانونِ دنیا واضح کرنے کے لیے سب سے پہلے قرآن سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ جس نے قرآن پالیا اس نے دنیا کا ہر قانون ہر اُصول سمجھ لیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو سمجھ گیا، اور جو خود کو سمجھ لے اس کے لیے پھر کوئی مشکل کوئی پریشانی بڑی نہیں رہتی۔ اسے قرآن سے مکمل راہنمائی مل جاتی ہے کہ اسے کس مقام پر کب اور کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔

قرآن پاک تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایک نصیحت کی کتاب ہے اب جو چاہے اپنے رب کی راہ لے لے۔ پوری دنیا کے انسانوں میں سے جو بھی چاہے اللہ کی راہ اختیار کر لے۔

''ترجمہ: اور بے شک ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے، پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟'' (54:القمر:17)

صاف اور واضح بات صرف یہ ہے کہ رب سب کا ہے اور سب رب کے ہیں۔ رب کا پیغام سب کے لیے ہے۔ قرآن پاک پوری انسانیت سے مخاطب ہے اور ایمان لانے والوں کو انسانیت کے احترام کا پابند بناتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ کسی قسم کی تفریق کے بغیر انصاف کا حکم دیتا ہے۔ (ص 73)

اب خود سوچیے کہ جب زندگی کے چھوٹے سے لے ہر بڑے مسئلے تک کی راہنمائی اس مقدس و پاک و آخری کتاب میں بیان کر دی گئی تو کیا انسان کو زیب دیتا ہے کہ وہ بغض و عناد رکھے یا زندگی کے کسی بھی مقام پر مایوس ہو کر غلط قدم اُٹھا بیٹھے یا لوگوں سے اختلاف کر کے انھیں اپنا دشمن بنا کر بے وجہ کی دردسری مول لے۔ خود بھی پریشان رہے اور دوسروں کو بھی جینے سے آزار کرے۔ جبکہ وہ مسلمان بھی ہے اور قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان بھی لاتا ہے۔ جبکہ وہ یہ بھی جانتا اور مانتا ہے کہ اس کا اور سب کا رب ایک ہے۔ تو پھر اس مادی دنیا کے پیچھے کیوں اپنی آخرت خراب کی جائے اور دنیا کے معاملات بھی بگاڑے جائیں۔ ہر مشکل و پریشانی میں کیوں نہ صرف رب اور رب کی کتاب قرآن سے رجوع کیا جائے۔ ذرا سوچیے اور آج ہی اس کتاب کو اپنی ذاتی لائبریری کا حصہ بنا لیجیے۔ اپنے بچوں اور عزیز و اقارب کو یہ کتاب پڑھنے کی ترغیب دیجیے۔ شاید اس کتاب کے مطالعے سے ان کے دلوں میں قرآن کی محبت مزید بڑھے اور آپ ان کے لیے صدقۂ جاریہ بن جائیں۔

کتاب کا نام: رب سب کا، سب رب کے
مصنفہ: نگہت خان جتوئی
قیمت: 600 روپے
ملنے کا پتا: دار الشعور 37 مزنگ روڈ، بک اسٹریٹ لاہور 03009426395

تخیّل کی کاریگری

ترجمہ: ابوالفرح ہمایوں

چار سالہ خوبصورت بچے کے لیے آپریشن کی تیاری مکمل تھی۔ سرجن بالکل پر اعتماد تھا۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر مکمل بھروسا تھا کہ وہ بچے کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تمام ڈاکٹر بھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے کا سر بری طرح پھٹ چکا اور اُن کا کام آسان نہیں۔ جب بچے کو آپریشن ٹیبل پر لٹایا جا رہا تھا تو وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ دل میں خوف سمانے کی وجہ سے اُس کی حالت مزید بگڑ گئی تھی۔ بے ہوشی کی دوا بھی کارگر نہیں ہو رہی تھی۔

ایسے نازک وقت میں سرجن کو ایک عجیب بات سوجھی۔ کیوں نہ بچے کے خیالات کے مطابق پلاسٹک کا ایک خلائی ہیلمٹ اُسے پہنا دیا جائے۔ اس طرح تصور میں وہ بچہ خلا میں پہنچ جائے گا۔ اسے ایسا محسوس ہوگا گویا کہ وہ چاند پر جا رہا ہے۔

اگرچہ یہ بڑا ہی اچھوتا اور نادر خیال تھا مگر اس تجربے نے اپنا کام کر دکھایا۔ ہیلمٹ پہنتے ہی بچہ انجانے خیالات میں مگن ہو گیا اور آپریشن بخوبی انجام پزیر ہوا۔ وہ ہیلمٹ ایک

تصوّر کی طاقت انسان میں مثبت جذبوں کو جنم دے تو کبھی اُسے منفی بھی بنا ڈالے

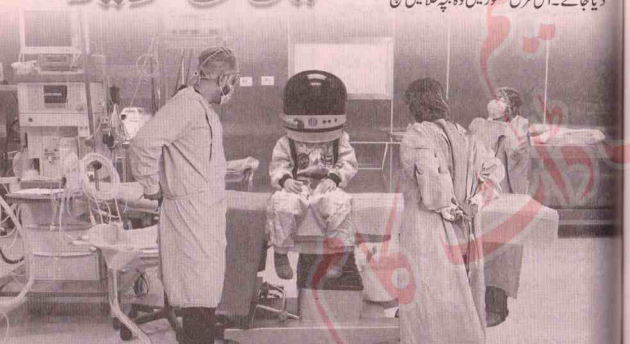

نشہ آور دوا کے سلینڈر سے جڑا ہوا تھا۔ ہیلمٹ پہن کر بچے کا سارا خوف جاتا رہا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ ایک زبردست تفریحی سیر کے لیے چاند پر جا رہا ہے۔

یہی بات اس کی موت کا باعث بھی بن سکتی تھی مگر ایک کارگر علاج بھی ثابت ہوتی۔ اچھے اور برے، دونوں اثرات اپنا اپنا کام کر سکتے تھے۔ اس ضمن میں کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

☆☆☆

ایک روز صبح ہی صبح ایک نوجوان عورت کو پیرس کے اسپتال میں لایا گیا۔ جب بیماری کی نوعیت پوچھی گئی تو ڈاکٹر کو بتایا گیا کہ اس عورت کو یقین ہے چند روز قبل ایک زندہ چھپکلی اس نے نگل لی تھی۔ اس دن سے پیٹ میں پاپل مچی ہوئی ہے۔

اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہ رہا کہ وہ ایک وہم کا شکار ہو چکی اور نہ جانے کیوں سمجھ رہی کہ زندہ چھپکلی یا کوئی اور چیز اس کے حلق میں چلی گئی ہے۔ اس عورت کو جھوٹا ثابت کرنا بھی ناممکن تھا۔

ڈاکٹر کے خیال میں اب اس کا علاج صرف یہی تھا کہ عورت کے جسم کے کسی حصے سے ایک چھپکلی برآمد کر لی جائے۔ اس نے عورت کو کلوروفارم سنگھایا اور جسم کے ایک نرم حصے پر چیرا لگا دیا۔ عورت کو جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی چھپکلی بستر سے اُچھل کر گری اور فوراً رینگ کر کہیں دُور چلی گئی۔

یہ چھپکلی پالتو جانوروں کی ایک دکان سے خریدی گئی تھی۔ عورت نے اسے دیکھ کر سکون کی گہری سانس لی اور اس کا سارا درد کافور ہو گیا۔ چند ہی منٹ بعد وہ ہشاش بشاش نظر آنے لگی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران ایک نوجوان ہوابار کو اس کے کمانڈنگ آفیسر نے حکم دیا کہ وہ ہوائی جہاز سے دوسری جگہ چلا جائے۔ ہوابار نے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اسے خطرہ ہے، اگر وہ آج جہاز پر بیٹھا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی مگر افسر نے مجبور کیا کہ حکم کی تعمیل کی جائے۔

''ٹھیک ہے۔'' ہوابار نے افسردگی سے کہا، اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میں مجبور ہوں لیکن اگر میں مر گیا تو میں آپ کی جان بھی نہیں چھوڑوں گا۔

وہ جہاز پر سوار ہوا اور اتفاق کی بات کہ واقعی جہاز گر پڑا اور وہ ہوابار مارا گیا۔ معلوم ہوا کہ بعد میں اس کمانڈنگ آفیسر کا دماغ پھر گیا۔ وہ مستقل یہی بات دہراتا رہتا کہ مردہ ایئر مین اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر میری گردن کو دبوچنا چاہتا ہے۔

سب لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ صرف اس کا وہم ہے لیکن جب کمانڈنگ آفیسر کو مرده حالت میں ہسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں نے دیکھا کہ اس کے حلق پر واقعی انگلیوں کے سیاہ نشانات موجود تھے۔

اسی طرح ایک ریلوے مزدور اپنے تخیل کی بنا پر موت سے ہمکنار ہو گیا۔ ایک حادثے میں ایک دن ایسے ٹھنڈے بکس میں بند ہو گیا جو ایک ریل سے منسلک تھا۔ جب ریل اپنی منزل مقصود پر پہنچی اور بکس کو کھولا گیا تو مزدور مر چکا تھا۔ بکس کی دیوار پر چاک سے اس نے یہ جملہ لکھ دیا تھا، میں مر رہا ہوں۔ خدا حافظ۔

بعد میں پتا چلا کہ صندوق کا درجۂ حرارت نارمل تھا۔ ٹھنڈا کرنے والا آلہ بے کار ہو چکا تھا لیکن وہ مزدور یہی سمجھتا رہا کہ زبردست ٹھنڈک ہو رہی ہے اور وہ اس میں زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اس وحشت کے عالم میں وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایک بار ایک ڈاکٹر ایسی مریضہ کے پاس پہنچا جو آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ وہ ایک قسط وار ناول پڑھ رہی ہے جس میں ہیروئن بھی اس بیماری میں مبتلا ہے جس میں وہ خود تھی۔ ڈاکٹر نے وہ ناول مریضہ کے ہاتھ سے لے لیا اور مصنف کا پتا تلاش کیا۔ پھر وہ مصنف کے پاس پہنچا اور کہانی کے بقیہ حصے کے بارے میں دریافت کیا۔ مصنف نے بتایا کہ پندرہ دن کے اندر وہ کہانی کی آخری قسط لکھے گا۔ اس قسط میں ہیروئن مر جائے گی۔

''اے کہانی نویس! خدا کے لیے یہ انجام بدل دیجیے اور اپنی ہیروئن کو زندگی بخش دیجیے۔'' ڈاکٹر نے مصنف سے درخواست کی۔ مصنف نے اس کی خواہش منظور کر لی۔

مریضہ جس نے اپنی زندگی کو ہیروئن کے ساتھ منسلک کر لیا تھا، رفتہ رفتہ صحت یاب ہونے لگی۔ چند ہی روز میں صحت یاب ہو کر اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دینے لگی۔

تخیل کی پرواز کا ایک اور حیرت انگیز واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک ملاح دیگر بارہ آدمیوں کے ہمراہ ایسے جزیرے میں پھنس گیا جہاں کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ چوتھے روز کھانے کا تمام سامان ختم ہو چکا تھا۔ دو تین روز مزید روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھا کر انھوں نے گزارہ کیا اور پھر وہ بھی ختم ہو گیا لیکن وہ ملاح نہایت خوش وخرم اور چاق و چوبند رہا۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہاری صحت کا راز کیا ہے تو اس نے کہا: ''میں نے فرض کر لیا تھا کہ ایک انتہائی لذیذ گوشت کا ٹکڑا کھا چکا ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے اپنے گھر پہنچ جاتا جہاں میری بیوی، میرے لیے مزیدار کھانا تیار کرتی اور اسی کھانے کی وجہ سے میری صحت برقرار ہے۔'' ملاح نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔

پندرہ دن بعد ان سب کو بحفاظت جزیرے سے نکال لیا گیا۔ کمزوری اور نقاہت سے سب کی حالت بری تھی، سوائے اس ملاح کے۔ تصور کی خوش ذائقہ غذا نے اس کو تازہ دم رکھا ہوا تھا۔

◆◆◆

سبز چائے کے کمالات

ایک ہفتے میں کم از کم 3 بار سبز چائے پینے والے افراد زیادہ لمبی اور صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔ یہ بات چین میں ہونے والی ایک طبی تحقیق میں سامنے آئی۔ چائنیز اکیڈمی آف میڈیکل سائنسز کی تحقیق میں ایک لاکھ سے زائد ایسے افراد کا جائزہ لیا گیا جن میں ہارٹ اٹیک، فالج یا کینسر کی تاریخ نہیں تھی۔ ان افراد کو 2 گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروپ وہ جو چائے پینے کے عادی تھے (ہفتہ بھر میں تین یا اس سے زیادہ بار) اور دوسرا گروپ جو اس گرم مشروب کو پسند نہیں کرتے تھے یا عادی نہیں تھے (ہفتہ بھر میں 3 بار سے کم پیتے تھے)، پھر ان کا جائزہ 7 سال تک لیا گیا۔

نتائج سے معلوم ہوا کہ چائے پینے کے عادی افراد زیادہ صحت مند اور زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ تجزیے کے مطابق چائے پینے کے عادی 50 سال کی عمر کے افراد میں امراض قلب اور فالج کا امکان اس گرم مشروب سے دور رہنے والوں کے مقابلے میں اوسطاً 41.1 سال بعد سامنے آتا ہے جبکہ وہ 26.1 سال زیادہ زندہ رہتے ہیں۔

محققین کا کہنا تھا کہ چائے پینے کے فوائد ان افراد میں ہی سامنے آتے ہیں جو اس کے عادی ہوتے ہیں اور اس کی وجہ چائے میں موجود بایو ایکٹیو مرکبات پولی فینولز ہیں۔ سبز چائے پینا امراض قلب اور فالج کے جان لیوا دورے اور کسی بھی وجہ سے موت کا خطرہ 25 فیصد تک کم کر دیتا ہے مگر سیاہ چائے سے کوئی نمایاں اثرات جسم پر مرتب ہوتے نہیں دیکھے گئے۔ سبز چائے پولی فینولز سے بھرپور ہوتی ہے جو دل کی جانب جانے والی شریانوں سے جڑے امراض سے تحفظ اور اس کا باعث بننے والے عناصر بائی بلڈ پریشر وغیرہ کا خطرہ بھی کم کرتے ہیں۔

ابوبکر شیخ

جب ٹھگوں کا راج تھا

ماضی سے آشنائی کا ایک عمدہ ذریعہ آپ بیتیاں اور سفرنامے بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک آپ بیتی لطف اللہ کی بھی ہے، جس میں ''آپ'' بہت کم البتہ ''بیتی'' کچھ زیادہ ہے۔ یہ بھی کیا کمال سے کم ہے کہ ایک شخص اپنی داستانِ زندگی سننے کی دعوت دے اور پھر داستان میں اپنا ذکر کم اور زمانے کا تذکرہ زیادہ سے زیادہ کرے! یہ کمال میاں لطف اللہ ہی کر سکتے تھے اور کر گئے، بلاشبہ یہ سب کے بس کی بات نہیں۔

لطف اللہ 4 نومبر 1802ء کو جاڑوں کی موسم کی ابتدا میں ریاست ماہو کے شہر دھرنگر میں پیدا ہوا۔ آج یہ شہر مدھیہ پردیش میں شامل ہے۔ وہ ایک ذہین اور زندگی کی مشکلات سے برد آزمائی کرنے والا شخص تھا۔ وہ سندھ میں چھتیس برس کی عمر یعنی 1838ء میں آیا تھا اور ایک برس تک یہاں رہا۔ لطف اللہ نے اپنی آپ بیتی انگریزی میں تحریر کی تھی۔ یہ اپنے زمانے میں مشہور کتاب ثابت ہوئی اور مسلسل تین بار شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مبارک علی نے انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ آپ بیتی ان دنوں کی تصویر ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں اپنے اقتدار کو بڑھا رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک وہ ہندوستان جہاں نو آبادیاتی نظام اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ جبکہ دوسری جانب راجاؤں، نوابوں اور سرداروں کا ہندوستان جہاں قدیم روایات اور ادارے تھے۔ نو آبادیاتی نظام اندھیرے دھیرے دوسرے ہندوستان کو نگل رہا تھا۔''

اسی زمانے میں ان ''پھانسی گروں'' کا راج بھی تقریباً اپنے اختتام کو پہنچا جو چکنی چپڑی باتیں کرنے، مسافروں سے راہ و رسم بڑھانے اور پھر موقع ملتے ہی ان کے گلے میں رومال کا پھندا ڈال کر مار دینے میں مشہور تھے۔ انہیں ''ٹھگ'' بھی کہا جاتا تھا۔ صدیوں تک سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر راج کرنے والے ٹھگوں کو انگریزوں نے ختم کیا۔ یہ شاید ایک بڑا کام تھا جس کو انگریز نے بڑی تحقیق و جستجو سے مکمل کیا۔ ایک حوالے سے یہ انتہائی قبیح عمل تھا کہ تھوڑی ملکیت کے لیے چند افراد یا پورے کے پورے قافلے کو موت دے دی جائے۔ اور وہ بھی ایسی ملکیت جس کے ہونے نہ ہونے کا کوئی یقین نہیں ہوتا تھا۔

یہ قتل ایسے نہیں ہوتے تھے بلکہ باقاعدہ منصوبہ بندی پر عمل کر کے کیے جاتے جس میں غلطی کی گنجائش بس نام کی ہی ہوتی تھی۔ یہ چوری یا ڈاکے ڈالنے جیسا وقتی عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ پلان شروع سے آخر تک ہر پل اسی عمل سے جڑا رہتا تھا۔ اپنی جگہ پر یہ بھی ایک کمال تھا۔ ہر مشکل کام اور معاشرے سے چھپ کر عمل کرنے کے لیے پوشیدہ زبان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لیے ان 'ٹھگوں' کی اپنی الگ دنیا تھی جو پہلے پل سے آخر تک ایک پراسراریت کی دھند میں لپٹی رہی۔ یہ ہی سب ہے جو آج تک ٹھگوں کے زمانے، ان کی رسومات اور ٹھگی کی تکنیک پر پراسراریت کی چادر تنی ہوئی ہے۔

اس دھرتی پر سب سے مثبت اور سب سے خطرناک عمل سوچنے اور یہی تو برائی اور بھلائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ مگر جب کسی کے ذاتی مفادات کی بات آئے تو تمیز کی یہ لکیر دھندلی ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے 'ٹھگی' کے عمل کو جائز قرار دینے کے لیے دیومالائی داستانوں کا سہارا لیا گیا اور ایک مضبوط کہانی کو بنیاد بنا دیا گیا۔ یہ کہانی ہم کو ضرور سننی چاہیے کہ اس کہانی کے نشیب و فراز نے ایک مضبوط انسانی جتھا بنانے کا کام کیا۔

کہانی کچھ اس طرح ہے: پرانے زمانے کی بات ہے کہ اس دنیا میں ایک عفریت کا قبضہ ہو گیا۔ وہ ان تمام انسانوں کو، جو پیدا ہوتے تھے، ہڑپ کر جاتا۔ نتیجے میں دنیا سے آبادی ختم ہونا شروع ہو گئی۔ آخر کار کالی دیوی انسانوں کے بچاؤ کے لیے آگے آئی۔ اس نے عفریت پر حملہ کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مگر ہوا یہ کہ اس کے خون کے ہر قطرے سے ایک عفریت پیدا ہو گیا۔ دیوی ان کو قتل کرتی رہی، مگر ان کے خون کے قطروں سے عفریتوں کی تعداد برابر بڑھتی رہی، یہاں تک کہ ان کی تعداد خوفناک حد تک بڑھ گئی۔ دیوی نے تھک ہار کر اور مایوس ہو کر سوچا کہ انہیں قتل کرنے کا دوسرا طریقہ ڈھونڈنا چاہیے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ دیوی نے اپنی ذاتی کوششوں کو ترک کر دیا اور اپنے پسینے سے دو آدمیوں کو پیدا کیا اور انہیں رومال دیے تاکہ وہ ان

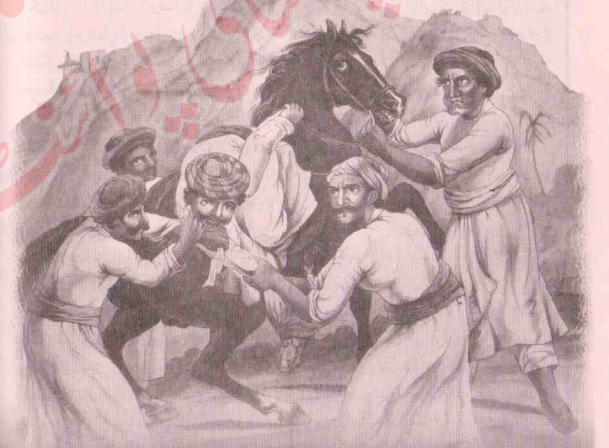

منصوبہ بندی اور بڑی عیاری سے قافلوں تک کو لوٹ لینے والے پُراسرار گروہ کا دلچسپ تذکرہ

عفریتوں کا خون بہائے بغیر رومال سے گلا گھونٹ کر مار دیں۔ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور عفریتوں کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ کام کی انجام دہی کے بعد ان دونوں نے اپنے رومال دیوی کو واپس کرنے چاہے، لیکن دیوی نے رومال واپس لینے سے انکار کر دیا اور دونوں سے کہا کہ ان رومالوں کو وہ اپنے شاندار کارنامے کی یاد میں اپنے پاس رکھیں۔ بلکہ ان کو استعمال کر کے منافع بخش ٹھگی کے پیشے کو اختیار کر لیں تاکہ ان کی آنے والی نسلیں پھل پھول سکیں۔

ایسی ہی کہانیوں نے عقیدے کا روپ دھار لیا اور گناہ کا تصور ان تصورات کے جنگل میں کہیں بھٹکے مسافر کی طرح گم ہو گیا۔ تاریخ کے صفحات میں سب سے پہلے ہمیں ''تاریخ فیروز شاہی'' (1266ء-1358ء) میں ٹھگوں کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اس تاریخی تذکرے میں بھی ٹھگوں سے نہایت نرم رویہ موجود ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مصنف، ضیاء الدین برنی، جن کی زندگی کے آخری برس 'فیروز خان تغلق' کے قید خانے میں گزرے، وہ تحریر کرتے ہیں:

''کچھ ٹھگ شہر میں گرفتار کیے گئے۔ ایک ہزار سے زائد ٹھگوں میں سے ہی ایک نے انہیں گرفتار کروایا تھا۔ سلطان جلال الدین نے ان میں سے ایک کو بھی قتل نہیں کیا اور سب کو حکم دیا کہ کشتیوں میں سوار کر کے ان کو بنگال کی طرف لکھنوتی کے علاقے میں لے جا کر چھوڑ دیں تاکہ یہ ٹھگ مجبوراً لکھنوتی کے علاقے ہی میں پڑے رہیں اور پھر اس طرف نہ آ سکیں۔''

یہ احکامات تقریباً سات سو برس قبل ایک سلطان نے جاری کیے تھے۔ ان احکامات میں ایک چھپی ہوئی پراسراریت اور عجیب ڈر محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ٹھگوں سے منسوب کئی کہانیاں موجود ہیں جن کا جنم تو اتفاقات سے ہوا مگر استعمال ٹھگوں کے بھلے کے لیے ہوئیں۔

مثال کے طور پر کسی نے چغلی کھا کر ٹھگوں کے کسی گروہ کو قانون کے حوالے کیا اور اتفاق سے وہ خود کسی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ یا پھر کسی وبا کی وجہ سے اس کے خاندان کے کچھ لوگ مر یا بیمار پڑ گئے تو یہ ''کالی ماتا'' کا انتقام ہی سمجھا جاتا۔ ٹھگوں نے کالی ماتا پر جو بھروسا اور ایمان رکھا وہ کمال حد تک تھا۔ ٹھگوں کے گروہوں میں ہندو تھے اور مسلمان بھی۔ ویسے تو یہ افراد مذہبی طور پر اپنی اپنی جگہ پکے ہندو یا مسلمان ہوتے مگر جیسے ہی 'ٹھگ برادری' میں آ جاتے تو وہ کالی ماتا کے بھگت ہو جاتے۔ وہ پھر ٹھگوں کی بنائی ہوئی روایات پر دل اور ایمان و یقین کے ساتھ عمل کرتے۔

اس حوالے سے برطانوی فوجی افسر، فرانسس ٹکر نے اپنی کتاب 'پیلے رومال' (The Yellow Scarf) میں لکھا ہے:

''ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشکل سے ہی آپس میں کبھی بنتی ہے مگر ٹھگوں کی اس پوری کہانی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں برادری کے تمام لوگ، چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو، اپنی نفرتوں کو مٹا دیتے ہیں۔ دیوی کو اپنا سرپرست تسلیم کرتے ہوئے ان تمام رسومات کو اختیار کر لیتے ہیں، جو ان کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔ اس طرح ٹھگ برادری میں تمام ہندو ممنوعات کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ ان دونوں عقیدوں کو ماننے والے اس قابلِ نفرت تجارت میں ایک ہو جاتے ہیں۔''

1843ء میں جرمن سیاح 'لیوپولڈ اورلچ' (Leopold von orlich) نے ٹھگوں کے حوالے سے انتہائی باریک بینی سے تحقیق کی۔ وہ لکھتا ہے:

''ہندوستان کے ٹھگوں میں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ برہمن ٹھگ بھی ہیں۔ ٹھگوں کی اپنی علیحدہ زبان کے ساتھ اشارے اور علامتیں بھی الگ ہوتی ہیں۔ یہاں مختلف ٹھگوں کی کئی اقسام ہیں جیسے 'جمالدھی ٹھگ'، 'ملتانی ٹھگ'، 'چنگیزی' یا 'ناٹکی ٹھگ' جو ملتانیوں کی ایک شاخ ہے۔ 'سوئی ٹھگ' بھی ہیں اور دریائی ٹھگ جو دریاؤں میں کشتیوں پر سفر کرنے والے مسافروں کو اپنا شکار بناتے ہیں۔''

مسافروں کے شکار کے لیے ٹھگ پہلے سفر پر جانے والی ٹولی کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے۔ معلومات کے لیے شہروں میں ان کے اپنے ذرائع ہوتے۔ پھر حاصل کردہ معلومات کے مطابق وہ راستے کے متعلق پلاننگ کرتے اور بڑے سکون سے شکار تک پہنچتے۔ اگر قافلے کے لوگوں کو ان پر شک ہو جاتا تو وہ سے الگ ہو جاتے اور ٹھگوں کی دوسری ٹولی بھیس بدل کر اس قافلے میں شامل ہو جاتی۔

کبھی کبھار پانچ سے چھے ٹولیوں کے بھیس بدلنے تک وہ اپنے شکار کا پیچھا کرتے رہتے۔ ٹھگوں کی یہ ٹولیاں صرف مضبوط اعصاب رکھنے والوں کی ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اچھے اور اچھے فنکار بھی ہوتے۔ مختلف روپ دھارنے کے لیے اپنے ساتھ ضرورت کا ہر سامان رکھتے۔ غریب چرواہے سے لے کر مالدار زمیندار تک کا بھیس بدلنے کے لیے ضروری ہر سامان ان کے پاس ہوتا۔

جب وہ سمجھ جاتے کہ قافلے کے لوگ ان پر اعتبار کرنے لگے ہیں تو پھر وہ وقت آ جاتا جس کے لیے ٹھگ ساری محنت کرتے چلے جاتے اور انتظار کرتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ آخری لمحات جن میں سارے قافلے کو موت کی نیند سلانا ہے، وہ عمل جتنا جلد ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ وہ یہ سارے کام منظم حکمت عملی کے تحت کرتے۔ پوری ٹیم کو مخصوص زبان اور اشاروں کے ذریعے بتا دیا گیا ہوتا تھا کہ آخری لمحے کس جگہ پر آئیں گے۔ اس طرح ان کے دیگر ساتھی اتنے گڑھوں کا پہلے سے انتظام کر دیتے کہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے میں دیر نہ ہو۔ کیونکہ اس راستے سے مسافروں کی دوسری ٹولی یا قافلہ کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ اپنا ہدف حاصل کرنے کے بعد وہ اکثر اسی جگہ ڈیرا ڈال لیتے اور دفن لوگوں کی قبروں کے اوپر کھانا وغیرہ بناتے۔ وہیں رات کا قیام کرتے اور صبح ہوتے ہی نکل پڑتے۔ ایسا وہ محض اس لیے کرتے تھے کہ کھدائی کا کوئی نشان باقی نہ رہے اور لوگوں کو اس جگہ پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔

برطانیہ کے سیاح، فینی پارکس (Fanny Parkes) نے 1840ء میں ایک کتاب تحریر کی تھی ''Wanderings of a Pilgrim in Search of the Picturesque''۔ اس میں ٹھگوں کے متعلق بنیادی اور مشاہداتی معلومات درج ہے۔ اس کتاب میں ایک باب ہے، 'ایک ٹھگ کے اعترافات'، جس میں ٹھگ کہتا ہے:

''ہمارے ہاں پرانے ٹھگوں کی عزت ہوتی ہے اور وہ ٹھگ جو ضعیفی کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے، ان کے شاگرد، جنہوں نے ان سے رومال استعمال کرنا سیکھا ہوتا ہے، وہ مالی طور پر ان کی مدد کرتے ہیں۔''

اگر آپ ٹھگوں کی ''ٹھگی'' کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس پیشے کے کئی مثبت پہلو ملیں گے۔ ایک تو ہر کام سب کی شراکت اور رضامندی سے ہونا، اپنی کمزوریوں کو ظاہر کرنا، فطرت سے گہرا تعلق اور اکٹھے کام کرنے والوں کے تحفظ کا احساس آپ کو ان کے ہر عمل میں ملے گا۔ کوئی بھی اجتماعی طور پر کیے گئے فیصلے کی سرحد پار نہیں کرتا تھا۔ ان کے نزدیک کالی ماتا کا انتہائی احترام تھا۔ جب ماتا کا سالانہ میلہ لگتا تو ان دنوں میں ٹھگی کا کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا اور میلے کے دنوں میں میلے میں بھرپور شرکت کی جاتی تھی، پھر چاہے ٹھگ مسلمان ہو یا برہمن یا کوئی اور۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بھی ٹھگوں کو پکڑا جاتا اور ان سے سوال جواب کیے جاتے تب بھی ان کے ماتھے پر کبھی اپنے کیے ہوئے کاموں پر پشیمانی کی کوئی لکیر نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ جب ان کو پھانسی دینے کا وقت آتا تو وہ بڑی خوشی سے جلد پھانسی دینے کا مطالبہ کرتے۔

میں، 'گورنمنٹ گزٹ' میں چھپے اس خط کو یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جو 'فینی پارکز' نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک طویل خط ہے اس لیے مکمل نہیں البتہ اس

کے کچھ حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

جنابِ اعلیٰ!

میں ان گیارہ ٹھگوں کی پھانسی کے وقت موجود تھا جو بھیلسہ کے قریب گرفتار کیے گئے تھے۔ ان پر پینتیس مسافروں کے قتل کا الزام تھا (جن کی لاشیں بھوپال اور ساگر کے راستے میں مختلف جگہوں پر ملی تھیں) اس جرم کی سزا کے طور پر گورنر جنرل کے ایجنٹ، مسٹر اسمتھ نے انہیں پھانسی کی سزا دی تھی۔ جیسے ہی سورج طلوع ہوا اور ان گیارہ آدمیوں کو جیل سے باہر لایا گیا تو وہ لوگ پھولوں کے ہار پہنے ہوئے تھے اور بڑے سکون واطمینان سے پھانسی کے تختے پر آئے۔ ان کے چہروں سے کسی بھی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

جب انہیں پھانسی کے پھندے کے سامنے ایک ایک کر کے کھڑا کیا گیا، تو ان کے چہروں پر بشاشت آ گئی۔ سب نے مل کر ہاتھ بلند کیے اور یہ نعرے لگائے: 'بندھا چل کی جے، بھوانی کی جے۔' اگرچہ ان میں چار مسلمان، ایک برہمن اور دوسرے راجپوت ومختلف ہندو ذاتوں والے بھی تھے، مگر سب کا نعرہ ایک ہی تھا۔ اس کے بعد وہ پھانسی کے تختے پر گئے اور اپنے ہاتھوں سے پھانسی کے پھندے گلے میں ڈال کر ایک بار پھر جے بھوانی کا نعرہ بلند کیا۔

ان کا سالانہ میلہ مرزا پور (اب اتر پردیش) سے چند میل دور مغرب میں بارشوں کے موسم میں لگتا ہے۔ اس میلے میں پورے ہندوستان سے قاتل اور لٹیرے جمع ہوتے ہیں۔ جب وہ اس میلے کے لیے سفر کرتے ہیں تو کوئی جرم نہیں کرتے۔ یہ کسی مہم کے لیے نکلنے سے پہلے جو رسومات ادا کرتے ہیں ان کا زیادہ تر تعلق فطرت سے ہوتا ہے۔ شگون کے لیے وہ دائیں طرف کو اچھا اور بائیں کو برا سمجھتے ہیں۔ یہ تیتر، ہرن کے شگون کو اچھا سمجھتے ہیں جبکہ اگر ان کے سامنے بھیڑیا راستہ پار کر لے تو وہ اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اگر وہ کسی سیار کو دن اور تیتر کو رات میں بولتا سن لیں تو اس علاقے کو فوراً چھوڑ دیتے ہیں۔''

ہم یہاں 'بہرام'، 'سید امیر علی'، 'رمضان'، 'فتح خان'، 'بیراگی'، 'گنیشا' نامی ٹھگوں کا تفصیلی ذکر نہیں کر رہے، جن کے خلاف ہزاروں لوگوں کو گلا گھونٹ کر مارنے کے ثبوت ملے۔ ہم اس بہرام ٹھگ کی کہانی کی تفصیل میں بھی نہیں کرنے جا رہے جس نے چالیس برس کی عمر میں ''نوسو اکتیس'' مسافروں کو گلا گھونٹ کر مار دیا تھا اور قید کے دوران ایک سوال کے جواب میں اس نے یہ کہا تھا: 'اس کے علاوہ بھی قتل کی وارداتیں ہیں۔ آخر میں نے گنتی کرنا ہی چھوڑ دی تھی۔''

ہم اس امیر علی ٹھگ کی زندگی پر بھی بات نہیں کر رہے جس نے ''سات سو انیس'' لوگوں کا گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ اسے یہ بھی افسوس تھا کہ وہ قید میں نہ ہوتا تو یہ تعداد کم سے کم ایک ہزار تک ضرور پہنچ جاتی۔ یہ سارے قتل اس نے منصوبہ بندی سے کیے۔ امیر علی ٹھگ نے اپنی سگی بہن کو بھی اس رومال کے پھندے سے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

ٹھگوں کی پراسرار ٹولیاں ہندوستان کے سفری راستوں پر اپنی موت کا جال بچھاتی اور لوگوں کو ان میں پھنسا کر مار ڈالتی تھیں۔ 1830ء میں ایک ہزار سے زائد ٹھگ اپنے اس عمل میں مصروف تھے اور ایک برس میں اندازاً 30 ہزار لوگوں کو قتل کر دیتے۔ یہ صورتحال انگریزوں کے لیے ٹھیک نہیں تھی، کیونکہ اس طرح راستے غیر محفوظ ہو گئے اور تجارت پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ انگریزوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے مسافروں کی جان و مال کی حفاظت کریں اور تجارت کو فروغ دیں۔

گورنر جنرل ہندوستان نے ایک فوجی افسر، ولیم ہنری سلیمن کو ٹھگی کے خاتمے کے لیے مقرر کیا۔ اس نے منظم طریقے سے کام کیا۔ 1831ء سے 1837ء تک تیس ہزار ٹھگوں پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دی گئی۔ ان میں سے اکثر کو پھانسی کی سزا ملی۔ اس طرح ٹھگوں کا وجود اب فقط تاریخ میں رہ گیا۔

باتوں باتوں میں ہم لطف اللہ صاحب کو نہ جانے کہاں بھول آئے جو ہماری اس نشست کا اہم کردار ہیں۔ ہم نے اس تحریر میں ان راستوں اور پگڈنڈیوں کا ذکر کیا ہے جن پر لطف اللہ چل پھر کر بڑے ہوئے۔ ان راستوں پر سفر کے دوران انھیں بھی 'جمعہ ٹھگ' ملا تھا جس کا ذکر بڑی تفصیل سے انھوں نے اپنی آپ بیتی میں کیا۔

لطف اللہ نے بڑی ہی مشکل اور یادگار زندگی گزاری۔ ان کے پاس زبانیں سیکھنے کا ایک قدرتی ہنر تھا اس لیے وہ کئی زبانیں نہ صرف بول لیتا تھا بلکہ پڑھ بھی لیتا اور یہی کام اس کا ذریعہ معاش بنا۔ لطف اللہ 1835ء میں ایک فوجی دستے کے ساتھ سندھ میں صحرائے تھر کے ایک علاقے ''پارکر'' بھی آئے جہاں کھوسو برادری کے لوگوں نے بغاوت کر رکھی تھی۔ وہ ویران جگہ جہاں اب چند جھونپڑیاں اور کچھ دکانیں ہیں، وہاں اس زمانے میں چار سو کے قریب رہائشی گھروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ مرکزی شہر میں چھ سو کے قریب چھپرے نما دکان و مکان تھے۔

لطف اللہ نے جولائی 1838ء میں مترجم کی ملازمت ترک کر دی۔ نوکری چھوڑنے کی وجہ برطانوی سفارت کار، ای بی ایسٹ وِک کی طرف سے سندھ چلنے کی پیشکش تھی۔ ایسٹ وِک کے ساتھ اس کے کافی اچھے مراسم تھے۔ وہ کاٹھیاوار سے جوڑیا بندر آتے وقت ایک میمن فیملی کی مدد کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لیتے آیا۔ وہ یقیناً ایک رحمدل انسان تھا۔ وہ 'جوڑیا' سے 'منڈاوی' بندرگاہ پہنچا اور پہلی دسمبر کو وہاں سے 'جمعہ ملاح' کی کشتی پر سندھ کے لیے روانہ ہوا اور 6 دسمبر کو سندھ کے ساحل پر پہنچا۔ اگلے دن وہ نزدیک واقع ایک ماہی گیر بستی دیکھنے گیا۔

لطف اللہ کو شکایت تھی کہ سمندر کنارے پر رہنے والے لوگ تیز تیز آواز میں باتیں کرتے تھے۔ لیکن وہ تیز آوازوں کی وجہ جاننے کی کوشش میں اِدھر اُدھر دیکھتا تو ضرور کامیاب ہو جاتا۔ دراصل سمندر میں کام کرنے والے اکثر لوگ لہروں کے شور کی وجہ سے تیز آواز میں بات کرتے ہیں تاکہ دوسرا سن سکے۔ 7 دسمبر کو اس کی کشتی ''وکر بندر'' پر لنگر انداز ہوئی جہاں کیپٹن ایسٹ وِک نے اس کو خوش آمدید کہا۔ 8 دسمبر کو کرنل پوٹنجر حیدرآباد سے وکر بندر آ پہنچے۔ سندھ میں دوران قیام لطف اللہ نے سندھی زبان سیکھی۔ وہ لکھتا ہے:

''میں نے یہاں سندھی گرامر کا مطالعہ شروع کر دیا ہے جو مجھے آسان زبان معلوم ہوئی۔ جس شخص کو مشرقی زبانوں کی ذرا بھی سدھ بدھ ہو، اس کے لیے سندھی زبان سیکھنا زیادہ مشکل نہیں۔''

وکر بندر سندھ میں وہ پہلا مرکزی دروازہ تھا جہاں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں داخل ہوئیں۔ ان دنوں

انگریزوں کے پاس یہ بہانہ تھا کہ ان کو افغانستان جانے کے لیے سندھ کے راستے سے گزرنے دیا جائے۔ مگر اندرونی طور پر وہ سندھ پر قبضہ کرنے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ ڈاکٹر مبارک نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے:

''سندھ کے متعلق لطف اللہ کے مشاہدات بڑے دلچسپ ہیں، خاص طور پر میروں اور انگریزوں کے معاہدے کے متعلق مشاہدات۔ معاہدے خود انگریز لکھ لیتے ہیں اور میروں کے سامنے پیش کر کے انہیں اس کی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کرتے۔ میرانِ حیدرآباد جانتے ہیں کہ یہ معاہدہ ان کے حق میں نہیں، مگر انتہائی مجبوری اور لاچاری کی حالت میں اس پر دستخط کر دیتے۔ عام رعایا بھی اس عمل سے خوش نہیں، مگر برطانوی طاقت کے آگے وہ بے بس نظر آتے ہیں۔''

لطف اللہ وکر بندر میں ایک ماہ تک رہے۔ اس عرصے میں وہ ہمیں ایک متحرک کردار میں نظر آتے ہیں۔ بمبئی سے آیا ہوا سرکاری خزانہ جو 178 صندوقوں میں بھرا ہوا تھا، اس کی گنتی کی ذمہ داری بھی لُطف اللہ کو دی جاتی ہے۔ کراچی کے 'ناؤنمل' سے بات چیت کی ذمہ داری اور دوسری اہم ذمہ داریاں بھی اس کے ذمہ نظر آتی ہیں۔ 19 دسمبر کو بدھ کا دن تھا اور اس دن 'عیدالفطر' تھی۔ چونکہ فوج میں کوئی مسلمان مولوی نہیں تھا، اس لیے خطبہ اور نمازِ عید لطف اللہ نے پڑھائی۔ آپ اندازہ کریں کہ ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی بندرگاہ اور اس پر 10 ہزار سے زائد انسان، کتنی گہما گہمی رہی ہوگی، اور پھر ایسے موقع پر عید کا آنا، نماز کی ادائیگی اور شمال سے آنے والی یخ بستہ ہوائیں، اور اس سے بچنے کے لیے جلتے ہوئے الاؤ۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جس کے تصور سے ہی لگتا ہے کہ جیسے تسکین کے پانی نے روح کی جڑیں تر کر دی ہوں۔

23 دسمبر کو جب فوج ٹھٹھہ کی طرف نکلی تب وکر بندر میں ویرانی کا راج تھا۔ اس بارے میں لطف اللہ لکھتا ہے:

''رات کو میں کیپٹن ایسٹ وِک کے خیمے میں سویا۔ رات کو سخت سردی تھی۔ میں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے اس قدر سخت سردی کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ یہاں رک کر ہمیں تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ کل تک ہم دس ہزار فوجیوں کے ساتھ تھے اور آج دو چپڑاسی اور دو سندھی سائیس ہمارے ساتھ ہیں۔''

26 دسمبر کو 'وکر' لطف اللہ نے شاید آخری بار دیکھا ہوگا اور پھر وہ ٹھٹھہ کی طرف نکل پڑے۔ پھر سیہون، شکارپور، سکھر، حیدرآباد سے گھومتے گھامتے دسمبر 1839ء میں کراچی آ پہنچے۔ اس کے دوست اور آقا، اسٹوک بہت بیمار ہو گئے تھے۔ لطف اللہ بھی تھک چکا تھا لہٰذا اس نے اپنے آقا سے جانے کی اجازت مانگی۔ 20 دسمبر کو کراچی کی بندرگاہ سے 'رحمتی' نامی کشتی پر بیٹھ کر وہ سورت کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں الوداع کرنے کے لیے 'ناؤنمل' اور 'گورنر صادق شاہ' آئے تھے۔ وہ گزشتہ برس اسی مہینے اور ان ہی تاریخوں میں وکر بندر پہنچے تھے اور اتفاقاً اس کی واپسی بھی انہی تاریخوں میں ہو رہی تھی۔

لطف اللہ اچھا لکھاری اور تجزیہ نگار تھا مگر وقت نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس 'آپ بیتی' کی تحریر کے بعد ہمیں اس کی کوئی اور تحریر پڑھنے کو نہیں ملتی۔ حالانکہ اس نے اپنی آپ بیتی میں وعدہ کیا تھا کہ وہ زندگی کا بقیہ تمام احوال بھی ضرور تحریر کرے گا۔ لگتا ہے کہ شاید وقت نے اسے اجازت نہیں دی۔ ہم کو دکھ تب ہوتا ہے جب ہم اس کی آخری آرام گاہ اور تاریخ وفات کے متعلق جاننا چاہتے ہیں مگر معلومات دینے والے سارے ذرائع خاموش نظروں سے بس تکتے رہتے ہیں۔ ایک اچھے آدمی کے لیے تاریخ کی یہ روش یقیناً قابل تعریف نہیں۔

میروں اور انگریزوں کے دور میں وکر بندر انتہائی اہم بندرگاہ ہوا کرتی تھی۔ جب 1837ء میں برطانوی فوجی افسر، کمانڈر کارلیس نے سندھ ڈیلٹا کا سروے کیا تب وکر بندر کو

انتہائی اہم بندرگاہ کا درجہ دیا تھا۔ یہاں بندر کا اپنا ایک چھوٹا سا قلعہ بھی تھا جہاں ایک جہاز کھڑا رہتا جس پر چودہ کے قریب توپیں نصب تھیں۔ یہ جہاز 200 ٹن وزن اٹھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا حجم 28x70 تھا۔ تالپروں کو اپنی حکمرانی کے دوران 1836ء میں ایک لاکھ روپے کا محصول وصول ہوا تھا۔ مگر برٹش راج 1843ء کے بعد جلد ہی 'حجامڑو کریک' خشک ہونے سے یہ بندرگاہ اجڑ گئی اور قرب و جوار میں واقع چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں مقیم لوگوں نے 'گھوڑا باری' کی طرف نقل مکانی کر لی۔

مجھے وکر بندر کے آثار دیکھنے کی بڑی تمنا تھی کہ اور کچھ نہیں تو وہاں بھولی بسری تاریخ کی کوئی نشانی یا وہ زمین ہی دیکھ لوں جہاں لطف اللہ نے کئی دن گزارے تھے۔ جہاں ٹھنڈے دنوں میں آئی ہوئی عیدالفطر کی نماز پڑھائی گئی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی۔

میں مکلی، پیر پٹھو سے ہوتا ہوا 'گھوڑا باری' کے پرانے شہر پہنچا جس کے متعلق لطف اللہ نے لکھا تھا: ''میں یہاں (وکر بندر سے) گھوڑا باری دیکھنے گیا جسے ایک بڑا گاؤں تصور کیا جاتا ہے۔ وہاں ایک سو کے قریب خستہ سی جھونپڑیاں ہیں۔''

آج بھی صورتحال کچھ اچھی نہیں، مگر 1843ء کے بعد گھوڑا باری پر اچھے دن ضرور آئے تھے اور اسے تحصیل کا درجہ دیا گیا۔ انگریزوں کے مختیارِ کار مقرر کرنے سے پہلے تالپور حکومت کی طرف سے یہاں 'کمدار' مقرر تھا جو حکومت کی طرف سے بنائے گئے اناج کے گودام کا انچارج ہوتا تھا۔

کہتے ہیں کہ میروں کی حکومت کے آخری دنوں میں کمدار نے وہاں موجود اناج لوٹ لیا جو تقریباً چار ہزار خراڑ تھا۔ (ایک خراڑ میں 24 من اناج کے آتے ہیں۔ من میں 82 پونڈ اناج ہوتا ہے) اور خود کو علاقے کا حاکم کہلوانے لگا۔

بہرحال برٹش دور میں گھوڑا باری کو تحصیل کا درجہ دیا گیا اور ناؤنمل کی سفارش پر اس کے بھائی 'سکھرام داس' کو یہاں کا مختیارِ کار مقرر کیا گیا۔

گھوڑا باری کے ویران سے بازار جا کر جب میں نے مقامی صحافی عبدالرحمان خشک سے وکر بندر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا ''ہاں ایک زمانے میں یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر وکر بندر کے آثار ضرور تھے۔ مگر اب وہاں سمندر کی لہریں ہیں، سمندر کھا گیا وکر بندر کو۔''

اس جواب کے بعد مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں خاموشی سے بازار سے ہوتے ہوئے دریائے سندھ کے پشتے کے اوپر آ گیا۔ میں نے گھوڑا باری کے چھوٹے سے اجاڑ گاؤں کو دیکھا، جس کی آبادی پانچ چھے ہزار ہوگی۔ وہاں برٹش دور کے چند پرانے اور خستہ حال دفاتر ہیں۔ ان میں سے کچھ تو کب کے زمین بوس ہو چکے۔ اڈیرو لال کا آستانہ بھی ہے جو خستہ حالی کا شکار ہے۔ اس مزار کے آگے بنے وہ کنویں بھی کب کے خشک ہو چکے جو کبھی لوگوں کی تشنگی بجھاتے تھے۔

بس ایک تحصیل ہونے کا اعزاز ہی ہے جو اب بھی گھوڑا باری اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ میں پشتے سے مشرق جنوب کی طرف دور دور تک دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں، جہاں کسی زمانے میں وکر بندر رہا ہوگا۔ مگر مقامی لوگ کہتے ہیں کہ آپ اس بندر کی اب کوئی نشانی نہیں دیکھ سکتے کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں کہیں کھو گیا ہے۔ نہ جانے کتنی ایسی تمنائیں بھی جنم لیتی ہیں جنہیں شکل و صورت نصیب نہیں ہو پاتیں۔

میرے سامنے دریائے سندھ آنکھیں موندے خالی پیٹ لیٹا ہے، جہاں صبح، دوپہر، شام، جاڑا اور بہار کے موسم تو آتے ہیں بس نہیں آتا تو پانی نہیں آتا۔ دریا اور میرا دکھ شاید اتنا الگ نہیں ہے کہ میرے نصیب میں ''وکر'' نہیں اور اس کے نصیب میں ''پانی'' نہیں! ◆◆◆

نفسیات

زندگی پُرلطف بنا لینے کا آسان نسخہ

مدیحہ مدثر

بعض اوقات ہم بڑی خوشیوں کی آس لگائے زندگی میں اردگرد بکھری چھوٹی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم انھیں نظرانداز کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہی اصل خوشیاں ہیں جن سے روزمرہ کے معمول میں ہمارا ٹاکرا ہو جائے۔ ذیل میں ہم ایسی ہی خوشیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ انھیں یاد رکھیے اور محسوس کیجیے گا۔ آپ کو یقیناً ایسا لطف ملے گا جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

صاف ستھرا کمرہ

ایک گندے، بکھرے ہوئے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان سے بھری ہوئی آپ کی میز کیا آپ کو کوئی تخلیقی کام کرنے دے گی؟ لہٰذا اپنا کمرہ اور میز صاف ستھرا اور ترتیب سے رکھیں، ایسا کرنے سے آپ کی طبیعت اور سوچ پر مثبت اثر پڑے گا۔

صاف چادریں

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس چیز سے بہتر بھی کچھ ہو سکتا ہے کہ آپ گرم پانی سے غسل کریں اور پھر صاف ستھرے بستر پہ سر کے پیچھے تکیہ رکھتے ہوئے لیٹیں اور تازہ آکسیجن اندر اتار لیں؟

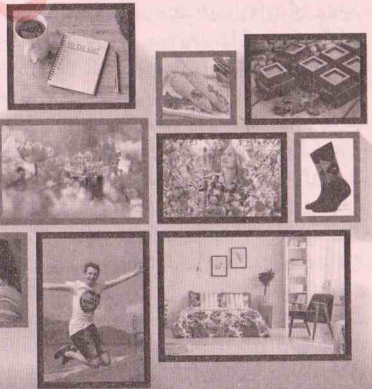

چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی روزمرہ کاموں میں ہمیں پریشانیوں اور ڈپریشن سے نجات دلاتی ہیں

مٹی کی خوشبو

گرمیوں کی بارش کے بعد زمین سے اٹھنے والی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چند لمحوں کے لیے آپ کا سانس روک دے گی۔ یہ خوشبو آپ کو بچپن کے زمانے میں لے جائے گی۔

خالی سنک

برتنوں سے خالی سنک ظاہر کرتا ہے کہ دن بھر کا کام تمام ہوا اور اب آرام کا وقت ہے۔ صاف باورچی خانہ اور دھلے برتن آپ کو یک گونہ سکون دیں گے۔ اب آپ کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کریں یا کوئی ٹی وی پروگرام دیکھ لیں، یہ آپ کی مرضی کی منحصر ہے۔ یہ احساس ہی بڑا فرحت بخش ہے کہ صبح دھلے ہوئے برتن ملیں گے۔

مزاح

عام تاثر یہ ہے کہ کوئی بھی مزاحیہ بات ہمارے لبوں پہ مسکراہٹ کا باعث بن جائے گی۔ لیکن وہ مزاح بھری بات سب سے زیادہ مزہ دیتی ہے جو اچانک یاد آئے اور آپ اپنے دوست کو سنا کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں، اتنا زور سے ہنسیں کہ سانس لینا بھول جائیں۔ چاہے آپ کے اردگرد کے لوگ آپ کو گاؤدی کیوں نہ سمجھیں، وہ آپ کے ماضی کی اس خوشگوار یاد سے واقف نہیں ہوں گے۔ لیکن یقین کیجیے کہ وہ شرارتی یاد آپ کو دلی خوشی سے ہمکنار کرے گی۔ اس لیے لوگوں کی پرواہ نہ کیجیے، مسکرائیے، آپ کا چہرہ روشن لگے گا۔

محبوب افراد کا پیغام

ماضی میں آپ کو اپنے پیاروں سے آدھی ملاقات کے لیے دنوں، ہفتوں اور مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دلوں میں چاہت بھی خوب ہوتی تھی اور لکھنے کو بے شمار باتیں بھی جمع ہوتی تھیں لیکن اب ہم ایک ہی لمحہ میں کسی بھی شخص تک باآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت روابط میں آسانی ہوگئی ہے۔ آپ اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پیاروں کو پیغام بھیجا کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ دوسروں کو غیر متوقع خوشی دے کر آپ بھی سکون محسوس کریں گے۔

نئی جرابیں

نئی جرابیں بھی آپ کو عجب خوشی دیتی ہیں۔ کیونکہ جرابیں ہمارے پاؤں کی ایسی دوست ہیں جو مشکل میں ساتھ دیتی ہیں، پاؤں کی حفاظت کرتی ہیں اور انھیں فنگس وغیرہ سے بچاتی ہیں۔

کاموں کی فہرست

کیا اس سے زیادہ خوشی دینے والی کوئی دوسری چیز ہو سکتی ہے کہ آپ کے کرنے کے کاموں کی فہرست میں شامل مشکل کام مکمل ہو جائیں اور آپ انھیں فہرست سے خارج کر دیں۔

بچے کے سر کی خوشبو

جی ہاں! نوزائیدہ بچوں کے سر سے عجب خوشبو آتی ہے۔ آپ بھی اس الوہی خوشبو کو محسوس کیجیے۔ آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ بچوں کو کیوں جنت کا پھول کہا گیا ہے۔

گہری چاکلیٹ

اگر میں یہ کہوں کہ چاکلیٹ اپنے اندر جادوئی خاصیت رکھتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح یہ آپ کی زبان پہ پگھلتی اور آپ کے منہ میں مکمل گھلتے ہوئے آپ کے چکھنے کی حس مطمئن کرتی ہے، ایسا اطمینان کھانے کی کوئی دوسری چیز نہیں دے سکتی۔

بہار کی ہوا

جب موسم انگڑائی لیتا ہے تو طویل اور اداس کر دینے والی شاموں اور ٹھنڈے محصور گھروں میں آپ طویل عرصے سے بند کھڑکیاں کھولتے ہیں۔ تب موسم بہار کی تازہ ہوا آپ کا استقبال کرتی ہے۔ بہار کو خوش آمدید کہیں اور بدلتے موسم میں وقت نکال کر ذرا گھر سے باہر نکلیں۔ کسی قریبی پارک میں جائیں، آپ بہت خوشی محسوس کریں گے۔

تازہ کٹی ہوئی گھاس کی خوشبو

کیا آپ نے کبھی تازہ کٹی ہوئی گھاس سے اٹھتی ہوئی خوشبو کو محسوس کیا ہے؟ اس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ خود گھاس کاٹیں، آپ ہمسائیوں کے لان سے یا باغ جا کر بھی یہ خوشبو محسوس کر سکتے ہیں۔

پھول توڑنا

آپ کسی بھی سٹور سے پھول خرید سکتے ہیں، یہ موسم بہار کی خوبصورت اور خوشبودار یاد دہانی ہوتی ہے۔ اپنے باغیچے یا صحن سے پھول توڑیئے، یاد کیجیے کہ کیسے مٹی میں ایک بیج بویا تھا، زمین کے پیٹ سے نکل کر، موسموں کی سختی سہنے کے بعد کیسا دلکش پھول آپ کے ہاتھ میں موجود ہے۔

اجنبی کو دیکھ کر مسکرانا

آپ کسی سٹور میں لائن میں کھڑے ہیں، یا اپنے کسی ملاقاتی کا انتظار کر رہے ہیں، یا کسی بوری سی میٹنگ کا حصہ بننے پر مجبور ہیں یا گھر کی جانب رواں دواں ہیں تو کسی اجنبی کی طرف خیر مقدمی مسکراہٹ اُچھالیے۔ آپ کو ایک لفظ بھی بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، آپ کی مسکراہٹ سب کہہ دے گی، آزمالیجیے۔

سرد دن میں گرم مشروب

باہر نا قابل برداشت ٹھنڈ ہو، ظالم موسم کسی قدر نرمی پر بھی آمادہ نہ ہو، ایسے میں گھبرایئے مت! گرما گرم چائے کا کپ یا اچھی سی کافی لیں اور بند گھر میں سے گرم مشروب سے لطف اٹھاتے ہوئے باہر کا منظر دیکھیں۔

قلفیاں

قلفی کا نام لیتے ہی بچے ذہن میں آتے ہیں۔ حالانکہ یہ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہے۔ رنگ دار قلفی کھائیں، ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ مزیدار ذائقے کو اندر اتارتے ہوئے بچپن کی یاد تازہ کریں۔

انٹرنیٹ بند کر دیجیے

بعض اوقات جو چیز ہمارے لیے بڑی نعمت ہوتی ہے، کثرت استعمال سے وہ زحمت بن جاتی ہے۔ انٹرنیٹ ان میں پہلے نمبر پر ہے۔ اگر انٹرنیٹ بند ہو جائے تو آپ موبائل، کمپیوٹر کچھ بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ لیکن ان سب چیزوں کے وقتی طور پہ نہ ہونے سے آپ کو سکون کا احساس بھی ہوگا۔ جو ای میلز، ویڈیوز، کالز آپ وصول نہ کر سکیں، انھیں بعد میں دیکھ لیجیے لیکن سکون کے ان لمحات سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع ضائع مت کریں۔

بچپن کی پسندیدہ کتاب پڑھیں

بڑا سا سبز رنگ کا کمرہ، جس میں ایک فون پڑا ہے۔ ایک سرخ رنگ کا غبارہ بھی ہے۔ ایک گائے کی تصویر بھی جو خوشی سے اچھل رہی ہے۔ یقیناً باقی کی کہانی آپ خود مکمل کر لیں گے۔ بہت دلچسپ کہانی تخلیق ہوگی۔ بچوں کی بعض کتابیں بڑوں کے لیے بھی یکساں پُرلطف ہوتی ہیں۔ آپ اپنے بچپن کی کوئی سب سے پسندیدہ کتاب لے کر پڑھیں۔ یقیناً آپ اس کتاب سے اتنی ہی محبت کریں گے جتنی آپ نے اِسے پہلی بار پڑھتے ہوئے کی تھی۔

خوشی میں چھلانگ

آپ کو ٹویوٹا کار خریدنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی کسی پروموشن کی، نہ لاٹری جیتنے کی، نہ کسی ٹی وی چینل سے منظور شدہ پروگرام کیلئے آپ خوشی سے اچھلیں۔ دراصل آپ

کو فطرتاً زندہ دل ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی بلا وجہ دونوں ایڑیاں جوڑ کر اچھلا کیجیے، شور مچایا کریں، آپ کو اچھا لگے گا۔

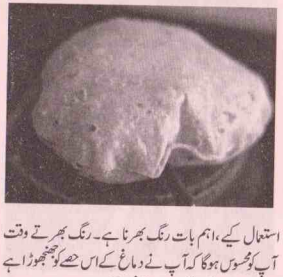

سورج کی گلابی کرنیں

آخری بار آپ نے کب سورج طلوع ہوتے دیکھا؟ یعنی آپ کب صبح سویرے اٹھے؟ اپنے کام پہ پہنچنے کی جلدی میں تیار ہوتے، بھاگتے، دوڑتے اچٹتی سی نگاہ سورج پہ ڈالی ہو گی۔ ممکن ہے، کئی دن سے آپ نے تسلی سے طلوع آفتاب کا منظر نہیں دیکھا ہو۔ افق کی جانب دیکھتے ہوئے سورج کی گلابی، سرخ، مالٹا، اور جامنی شعاعیں نہیں دیکھی ہوں گی۔ کل صبح سورج کو طلوع ہوتے ضرور دیکھیے گا، آپ کو یقین آجائے گا کہ ہم کس قدر خوبصورت دنیا میں جی رہے ہیں۔

بادلوں کی اشکال

کھلے آسمان تلے، کمر کے بل لیٹ کر بادلوں کی اشکال دیکھنا بچوں کا ہی کام ہے یا بیروزگاروں کا؟ بالکل نہیں۔ ایسے لیٹ کر بادلوں کی اشکال دیکھنا اعصاب اور روح کو پُرسکون بناتا ہے۔

ایڑیوں پہ چہل قدمی

گھر سے باہر سیر کو نکلنا بہت سے جسمانی اور ذہنی فوائد کا باعث بنتا ہے۔ تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں، موڈ بہتر ہوتا ہے، خون کی گردش بہتر ہوتی ہے، دل کی دھڑکنوں کی ترتیب درست ہوتی ہے اور وٹامن ڈی کا کوٹہ پورا ہوتا ہے۔ اگر اس چہل قدمی میں تھوڑی سی ورزش بھی شامل کر لیں تو نتائج مزید بہتر آئیں گے لہٰذا پیدل ضرور چلا کریں۔

تصویر میں رنگ بھرنا

آپ کو کبھی کوئی یہ نہیں کہے گا کہ کسی چیز سے لطف حاصل کرنے کے لیے آپ کا اس میں ماہر ہونا بھی ضروری ہے۔ کینوس پہ رنگ بھرنا آپ کی تخلیقی صلاحیت کو جلا بخشتا ہے۔ یہ چیز اہم نہیں کہ آپ نے کیسے اور کس قسم کے رنگ

استعمال کیے، اہم بات رنگ بھرنا ہے۔ رنگ بھرتے وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے دماغ کے اس حصے کو جھنجھوڑا ہے جو ہم میں سے اکثر لوگ استعمال نہیں کرتے۔

پکی اسٹرابیری کھانا

بیریز قدرتی ٹافیاں ہیں۔ تازہ، پکی ہوئی اسٹرابیری توڑ کر کھانے کا خوبصورت احساس آپ کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ چاہیں تو آپ کھانے کی بجائے ان کا شیک بھی بنا سکتے ہیں۔

کنگھی کرنا

آپ کسی کے بال نرمی اور محبت سے سلجھا دیں۔ اس سادہ عمل سے مقابل کو بہت اچھا لگے گا اور آپ بھی خوشی محسوس کریں گے۔

تازہ پکی روٹی کی خوشبو

ہم سب اپنے گھروں میں روٹی پکاتے اور اس کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کے پاس پکانے کا وقت نہیں تو تندور سے گرما گرم روٹی لیجیے اور کھانے کے ساتھ ساتھ اس کی خوشبو سے بھی لطف اٹھائیں۔

پرانا فوٹو البم

پرانی یادیں جب دھندلی پڑنے لگیں تو فوراً یادوں کی پٹاری کی جھاڑ پونچھ کیجیے۔ ماضی کو یاد رکھنا چاہیے۔ ایسے میں ایک پرانی تصویر بھی آپ کو بہت کچھ یاد دلا دیتی

ہے۔ تمام پرانے احساسات، خوشبوئیں، خاندان کے افراد، دوست غرض ہر چیز چھم سے ذہن کے پردے پہ لہرانے لگتی ہے۔

بچوں کے ساتھ کھیلنا

آپ چاہے نیٹ پہ جو مرضی کھیلیں لیکن یاد رکھیں بچوں کے لیے سب سے پیارا کھیل یہی ہے کہ آپ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جھولیں۔ جب آپ جسمانی طور پہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہوں گے تو تاعمر اس پُر لطف سرگرمی کو یاد رکھیں گے۔

ننگے پاؤں پارک میں چلنا

یاد کریں جب بچپن میں والدین آپ کو جوتے پہناتے تھے تو وہ بالکل ایک قید کی طرح لگتے۔ یقیناً کوئی وجہ تو ہے جو بچے بہت تیزی سے اپنے پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کراتے ہیں۔ اپنے جوتے اتاریے، ننگے پاؤں پارک میں گھومتے ہوئے گھاس، ریت، اور مٹی کو محسوس کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بچے کیوں ننگے پاؤں پھرنا پسند کرتے ہیں۔

صبح کی انگڑائی

جب آپ صبح بیدار ہوتے ہیں تو سب سے پہلے کیا کرتے ہیں؟ بہت سے لوگوں کی طرح فون چیک کرتے ہیں؟ اس کے بجائے گہرا لمبا سانس اور بھرپور انگڑائی لیں، بازو اوپر کر کے اپنی انگلیوں اور انگوٹھوں کو حرکت دیں، اپنے اعضاء کو پھیلائیں، گردن کو لمبا کریں یعنی پیچھے کی طرف موڑیں، بدن کے ہر حصے کو محسوس کروائیں کہ آپ جاگ گئے ہیں۔ پھر اپنا فون چیک کریں، اگر آپ نے لازمی چیک کرنا ہے۔

خوشگوار راز کی سرگوشی

بعض راز شیئر کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی اپنے کی محبت کا اظہار، یا کسی مہربان کی جانب سے کھانے کی دعوت، یا کسی خوشی کے موقع پر لی جانے والی دعوت۔ ایسی خوشیوں کو جب آپ خفیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کسی دوست کے کان میں سرگوشی کی صورت میں کہیں گے تو خود بھی سرشاری کی کیفیت سے گزریں گے۔

نئی کاپی کھولنا

ایک نئے کاغذ کی خوشبو بالکل خام مال کی خوشبو جیسی لگتی ہے۔ صفحے پر موجود خالی لائنیں اور ایک نئی کاپی کی شفاف جلد، آپ کو آنے والے دنوں میں کیے جانے والے کاموں کی امید اور ممکنات کی خوشبو دیتی ہے۔ اور آپ کو عملی طور پہ ترغیب دیتی ہے کہ آنے والے کاموں کی فہرست بنا لیجیے یا پھر اس کو یونہی صاف ستھرا رکھنا اور نئے صفحات دیکھنا بھی اچھا لگتا ہے۔

بیج بونا

ہم اپنے گردونواح میں پھل، پھول، درخت وغیرہ دیکھتے ہیں۔ کبھی سوچا کیسے یہ مٹی میں دبے ہوئے بیج نمو پاتے ہیں؟ کبھی کوئی بیج لے کر مٹی میں دبائیں۔ اس کو دباتے ہوئے مٹی کو محسوس کریں۔ پھر اس بیج کو پھلتے پھولتے دیکھیں۔ آپ کو روحانی مسرت ملے گی۔ آزمائش شرط ہے۔

شکر ادا کیجیے

اپنی زندگی میں موجود بہترین نعمتوں کو محسوس کرنے کا

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ شکر ادا کریں۔ جب ہم بے شمار نعمتیں پاتے ہیں تو ہم ان کی لذتوں میں کھو کر شکر ادا کرنا بھول جاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے پاس موجود انواع و اقسام کی نعمتوں کا دوام چاہتے ہیں تو شکر ادا کیجیے۔

بچوں کے ساتھ جھومنا

بچوں میں بہت سی خصوصیات ہوتی ہیں۔ لیکن ایک بات جو مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے، یہ کہ بچے شرمیلے نہیں بلکہ من موجی ہوتے ہیں۔ ایک بڑا بندہ جب رقص کرنے کی غرض سے سامنے آئے گا تو وہ ملنے جلنے میں آسانی محسوس نہیں کرے گا اور کسی کا ساتھ چاہے گا۔ جبکہ ایک بچہ خالی جگہ کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اچھلے گا، کودے گا اور موسیقی کی آواز پر جھومے گا۔ بور کر دینے والی گفتگو میں شامل ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ آپ اپنے لاڈلے بچے کے ساتھ اسی کے انداز میں رقص کر لیں۔

پسندیدہ گانا

ضروری نہیں کہ بہت مشہور، دل کو کھینچنے والا، یا موجودہ دور کا کوئی گانا ہی آپ کو پسند ہو۔ لیکن ہم سب کا کوئی نہ کوئی پسندیدہ گانا ضرور ہوتا ہے جسے ہم اپنی فہرست سے خارج نہیں کر پاتے۔ آن لائن اپنی پسند کا گانا منتخب کریں اور اسے سنیں، ساتھ ساتھ گائیں اور بھرپور لطف اٹھائیں۔

سکہ اٹھانا

اگر آپ چلتے ہوئے پگڈنڈی سے ایک سکہ اٹھا لیتے ہیں تو کون جانتا ہے کہ وہی آپ کی قسمت بدل دے گا؟ اس طرح کم از کم آپ ایک فیصد امیر ہو ہی جائیں گے۔ زمین پر پڑا کوڑا بھی ٹھکانے لگ جائے گا۔ سب سے بڑی بات آپ کو بچپن میں سکہ ملنے پر جو خوشی ہوتی تھی، ویسی ہی خوشی اب بھی محسوس ہوگی۔

نہاتے ہوئے گنگنانا

ہر شخص نہاتے ہوئے بہت اچھا گاتا ہے۔ یہ سائنسی

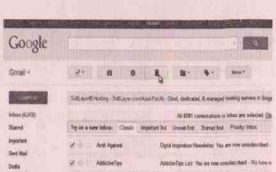

طور پہ ثابت شدہ حقیقت ہے لہٰذا اس تنہائی اور مرطوب فضا کا فائدہ اٹھائیں اور اپنی ساعت کا۔ اپنے اندر کے گلوکار کو موقع دیں کیونکہ وہاں آپ کی گلوکاری کا کوئی تجزیہ کرنے والا نہیں ہوگا سوائے غسل خانے میں موجود صابن کے۔

ای میل باکس کی صفائی کریں

ای میل ایک حیران کن جدید سہولت ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا سردرد بھی ہے۔ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ آپ سے کبھی بھی، کہیں بھی رابطہ کر سکتے ہیں تو وہ ای میل کرتے ہیں۔ ہم روزانہ بے شمار ای میلز وصول کرتے ہیں جن میں سے زیادہ تر فضول ہوتی ہیں۔ یہ فضول ای میلز ہمارے لیے ای میل تلاش کرنے کو بہت خوفناک عمل بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا غیر ضروری اور فضول چیزوں سے اپنا میل باکس مکمل صاف کر دیں، نتیجتاً آپ ناقابل یقین سکون محسوس کریں گے۔

دلکش تصویر کھینچنا

ہم میں سے اکثریت بہت اعلیٰ کیمرے اپنی جیب میں ڈالے روزانہ گھومتی ہے لیکن ہم لوگ اپنے فون میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ اپنے اردگرد موجود خوبصورتی کے چھوٹے چھوٹے لمحات گنوا دیتے ہیں۔ اب جب بھی آپ

باہر نکلیں تو ایک چُرمُر پتے یا ایک قوس قزح کے رنگ لیے تیل، یا اپنی گاڑی کی اگلی سکرین پہ موجود بارش کے قطروں، یا کسی بھی چھوٹے سے تخلیقی کام کی تصویر لیجیے۔ اسے حسین یادوں میں شامل کرنے کی غرض سے۔ آپ چاہیں تو اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں یا کسی کو بھیج دیں۔

نیا ٹوتھ پیسٹ

حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرنا آپ کو ایک اچھا، باعمل انسان بناتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کوئی عام سا کام ہے۔ آپ اپنی پرانی، اچھی طرح نچڑی ہوئی اور پپڑی زدہ ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب پھینک کر نئی ٹیوب کھولیں۔ نئی ٹیوب سے نکل پہلا پیسٹ بہت بھلا لگتا ہے۔ اسے محسوس کیجیے۔

دُھلے کپڑوں کی مہک

ایک موٹی ٹی شرٹ ڈرائیر سے نکال کر سونگھیں، آپ کو گرم اور نرم شرٹ سے بہت مزے کی خوشبو آئے گی، آپ اسے بے ساختہ سینے سے لگالیں گے۔ خاص طور پر آپ کو یہ تب خوشی دے گی جب آپ باہر بارش یا برفباری کا سامنا کر کے آرہے ہوں گے۔

مطمئن کرنے والی تالی کا مزہ

آپ کسی چیز کی مبارکباد وصول یا کوئی ایوارڈ لے رہے ہوں، سامنے والے کا آپ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملانا اور تالیاں بجانا اس بات کا اظہار ہے کہ آپ ایک بہترین انسان ہیں۔ یوں کسی دوسرے سے ہاتھ ملانا اور اس کا لمس محسوس کرنا آپ کو بھی بہت اچھا لگے گا۔

بلی کا بچہ پالنا

ایک بلی کے بچے کی نرم اور سلکی پوتیں اسے پالتو بنانے کے لیے بہترین ترغیب ہے۔ جب وہ آپ کی گود میں کھیلے گا تو یہ جنت کی ایک نعمت جیسا لگے گا۔

ایک کرکرا سیب

ایک کھٹ میٹھا سیب لیں اور اس کی ایک قاش منہ میں ڈالیں۔ اس کا رس آپ کی ٹھوڑی پہ بہہ رہا ہو اور آپ کی زبان اس کے ذائقے اور رسیلے پن میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اب ایسی اقسام کے سیب باغیچوں میں کاشت ہو رہے ہیں جو پہلے نہیں ملتے تھے۔ آپ کو اب انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ کب پتے گریں اور آپ سیب سے لطف اٹھائیں۔

پاپ کارن سے لطف اٹھایئے

پاپ کارن بہت مزے کا ہلکا پھلکا سا کھاجا ہے۔ کبھی گرما گرم پاپ کارن کی خوشبو سے آپ محظوظ ہوئے؟ کبھی انھیں بھنائی کے وقت چٹکتے ہوئے دیکھا؟ ان کی خوشبو اور ذائقہ آپ کو بہت سرور دے گا۔ اور آپ بغیر بھوک کے بھی انھیں کھاتے چلے جائیں گے۔ اس کا سب سے پُرلطف حصہ یہ ہے کہ آپ کوئی بھی پنیر، باربی کیو، یا کوئی اور پسندیدہ ذائقہ دار چیز پاپ کارن پہ ڈال کر لطف دوبالا کر سکتے ہیں۔

کتاب پڑھنا

ٹیکنالوجی کے دور میں آپ کتابیں فون یا ٹیبلٹ پر باآسانی پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے آپ کبھی اس لطف سے آشنا نہیں ہو سکتے جو ایک کتاب کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے سے آتا ہے۔ ایک نئی کتاب جو تازہ روشنائی سے چھپی ہوئی ہو، اس کی خوشبو کا کوئی دوسری چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کتاب کا وزن ہاتھوں میں محسوس کر کے آپ آدھا لطف تو اسی وقت حاصل کر لیتے ہیں۔

گلے ملنے کی گرمی

اطمینان، گرمی، حفاظت، ہمدردی، خوش اخلاقی، مہربانی، معاف کرنا۔ محبت، دوستی، شفقت۔ یہ بہت ہی دلچسپ کام ہیں لیکن کسی کو گرم جوشی سے گلے لگانے سے یہ سارے کام ایک ہی بار ہو جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولنا پڑتا۔ یہ سب سے دلنشیں انداز ہے جذبوں کی حدت ایک دوسرے تک پہنچانے کا۔

ڈاکٹر امجد ثاقب

کوٹ نانک کی مسیحا

مریم النساء بیگم ضلع حافظ آباد کے ایک گاؤں میں رہتی

کوٹ نانک نامی یہ گاؤں حافظ آباد سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، قادر آباد بلوکی لنک کینال کے پاس۔ اس گاؤں کا نام نانک ہے لیکن اس کا گورونانک سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے سردار نانک سنگھ نامی ایک سکھ اس گاؤں کا واحد مالک تھا۔ ہندوستان تقسیم ہوا۔ سکھ یہاں سے چلے گئے لیکن نانک کے نام کی تختی یہیں لگی رہی۔ مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں سے آنے والے یہاں آباد ہونے لگے اور گاؤں کا گاؤں چند دنوں میں مسلمان ہو گیا۔

کوٹ نانک کو ایک اور شرف بھی حاصل ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کا تعلق بھی اسی گاؤں سے جڑ گیا۔ لیاقت علی خان اور ان کے خاندان کو ہندوستان میں چھوڑی ہوئی زمینوں کے عوض کچھ رقبہ اس گاؤں میں الاٹ ہوا۔ گاؤں کی عورتیں آج بھی بہت فخر سے بتاتی ہیں کہ انھوں نے شہید وزیراعظم

کتابوں ہی نہیں بڑے آدمی زندگی میں بھی ملتے ہیں مگر ہم انھیں دیکھ نہیں پاتے

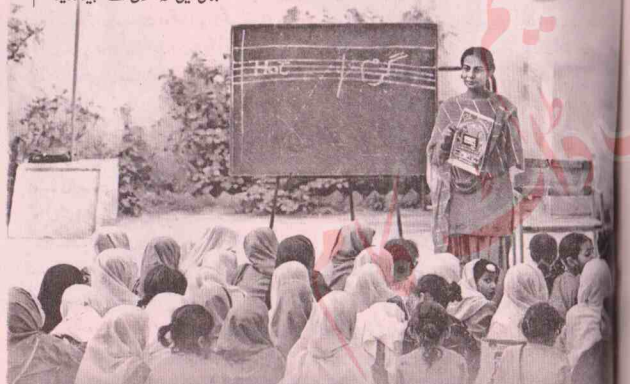

کے کھیتوں سے فصلیں چنی ہیں۔

لیاقت علی خان یہاں کبھی نہ آسکے۔ یہ ساری جائیداد اور گاؤں کے اندر موجود ایک بڑی حویلی اپنے مالک کی راہ تکتی رہی۔ لیاقت علی خان کو فرصت نہ مل سکی۔ ان کے سامنے دو راستے تھے۔ وہ لٹے پٹے افراد کو آباد کرتے یا خود آباد ہوتے۔ انھوں نے پہلا راستہ اپنایا کہ بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں بسے لیکن لوگوں کے سینوں میں پرانی یادوں کے چراغ اب تک روشن ہیں۔

کوٹ نانک سے سکھ چلے گئے۔ مسلمان آ گئے لیکن بود و باش، رہن سہن اور طور اطوار میں کوئی بڑی تبدیلی نہ آئی۔ 1990ء تک اس گاؤں میں بچیوں کا کوئی اسکول قائم نہ ہو سکا۔ تعلیم انسان کا زیور ہے لیکن کوٹ نانک تک شاید یہ خبر نہیں پہنچی۔ 1990ء میں گاؤں کے لوگ محرم النساء کو بیاہ کر یہاں لے آئے۔ شادی سے پہلے وہ قلعہ دیدار سنگھ کے پاس ایک گاؤں میں پڑھاتی تھی۔ جب وہ یہاں آئی تو درس و تدریس کی خواہش بھی اس کے ساتھ ہی چلی آئی لیکن یہاں پر کوئی اسکول ہی نہ تھا۔

اس نے محکمہ سے یہاں ٹرانسفر کی درخواست کی تو اسے پتا چلا کہ اس گاؤں میں اسکول تو کب کا منظور ہے لیکن عمارت نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک شروع نہیں ہو سکا۔ محرم النسا نے گاؤں میں تبادلہ کروایا تو اس کے میاں نے اپنا گھر پیش کر دیا کہ جب تک اسکول نہیں بنتا، اسے ہی اسکول سمجھو۔ یوں کوٹ نانک میں آزادی کے چالیس سال بعد علم کی پہلی آواز محرم کے گھر سے بلند ہوئی۔

''بچیوں نے میرے گھر کے صحن میں لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری کی صدا بلند کی تو میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔'' محرم نے بتایا اور ماضی میں کھونے لگی۔ اس بات کو پندرہ برس گزر گئے ہیں۔ میں نے ان پندرہ برس میں اس گاؤں کی کئی سو بچیوں کو زیور علم سے آراستہ کیا ہے۔ اس گاؤں کا کوئی گھر ایسا نہیں جس کی بچی نے مجھ سے چند حروف نہ سیکھے ہوں۔ گاؤں میں اب کئی کنال پہ محیط ایک گرلز اسکول بن چکا جہاں میرے علاوہ سات اور استانیاں ہیں۔ محکمہ کی طرف سے کئی بار میری خدمات کو سراہا گیا۔ مجھے بہترین استاد کا اعزاز ملا۔ لیکن میرا اصل اعزاز گاؤں کی طرف سے ملنے والی عزت ہے۔ وہ بچیاں جنہیں میں نے علم کے نور سے سرفراز کیا، میرا انعام ہیں۔ شادی کے کئی سال بعد جب میرے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا تو میرے گھر کا صحن مبارک باد دینے والوں سے بھر گیا۔ لوگ آتے رہے اور میری آنکھوں کی نمی بڑھتی رہی۔ اتنے تحفے ملے کے کمرے میں نہیں سمائے۔''

محرم نے ہمیں یہ ساری باتیں بڑے فخر سے بتائیں۔ ہم اس گھر کے جس کمرے میں بیٹھے اس کا فرش کچا تھا لیکن لپائی اتنی خوبصورتی سے کی گئی تھی کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا۔ کمرے کے ایک طرف تین چارپائیاں ایک دوسرے کے اُوپر پڑی تھیں۔ رنگین اور منقش پائے۔ خوبصورت بستر، تکیے اور پنجاب کے روایتی کھیس اور سب سے بڑھ کر کچی مٹی کی خوشبو!

محرم کہنے لگی کہ علم کی پگڈنڈی پہ میں اس وقت اکیلی کھڑی تھی۔ اب تو ایک قافلہ ہے۔ میں نے علم کی روشنی پھیلانے کی کوشش کی۔ بچیاں کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرنے لگیں۔''

محرم النسا کی باتیں متاثر کر رہی تھیں۔ کوٹ نانک میں جہالت کے جن اندھیروں کو حکومت دُور نہ کر سکی، اس نے دور کر دیا۔ وہ نہ ہوتی تو اس گاؤں کے آدھے مکین شاید جاہل رہتے۔ طاقتور تو پڑھ لکھ جاتے ہیں لیکن مصلی، کمی، ترکھان، جولاہے..... ان کے حصے میں کیا آتا؟ محرم النساء سے مل کر خیال آیا کہ بڑے آدمی کتابوں میں ملتے ہیں اور زندگی میں بھی لیکن ہم انھیں دیکھے بغیر گزر جاتے ہیں۔

◆◆◆

☆☆☆